مولانا امتیاز علی عرشی

ادبی و تحقیقی کارنامے

مرتبہ

پروفیسر نذیر احمد

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دھلی

ادبی و تحقیقی کارنامے

مرتبہ

پروفیسر نذیر احمد

سنہ اشاعت : ——— دسمبر ۱۹۹۱ء
اہتمام : ——— شاہد ماہلی
قیمت : ——— ساٹھ روپے
طباعت : ——— عزیز پرنٹنگ پریس، دہلی

ناشر
غالب انسٹی ٹیوٹ
ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

باسمہٖ تعالیٰ

پیش لفظ

مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم بعض اعتبار سے ہندوستان کے اکثر محققین سے ممتاز ہیں. ہندوستان میں ان کی تمام تر شہرت اردو محقق اور ماہر غالبیات کی حیثیت سے ہے، لیکن یہ محض تصویر کا ایک رُخ ہے، وہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے زبردست عالم اور عظیم محقق و دانشمند تھے' اور اس تخصیص کے اعتبار سے دو ایک محققین شاید ان کے ہم پلہ ہوں، عربی و فارسی میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں اور جن کی وجہ سے دنیائے اسلام میں ان کو کافی شہرت ملی' ان سے ہندوستان کے اکثر و بیش تر لوگ واقف نہیں' اور اس عدم واقفیت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں کے تعلق سے جو کارنامے انجام پاتے ہیں، ان تک اکثر لوگوں کی رسائی نہیں، عبرت کا مقام ہے کہ ہم اپنے ان بزرگوں کے کارناموں کے سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھیں جن کی تحریریں دنیائے عرب و فارس میں وقعت و اعتبار کی نظر سے دیکھی جاتی ہوں، بہر حال جب ہماری نظر مولانا عرشی کی طرف جاتی ہے تو ہمارا سر افتخار بلند ہو جاتا ہے، ان کی پوری عمر کا تعلق رامپور کے نایاب روزگار کتاب خانے سے رہا تھا۔ کتاب خانے سے ان کو عشق تھا اور کتاب خانے کے ضمن میں ان کا مرقد اسی عشق کی داستان دہرا رہا ہے۔ یہ کتاب خانہ عربی، فارسی، اردو تاریخی نوادر کا بیش بہا خزانہ ہے، سیکڑوں ہزاروں نایاب مخطوطے اس کی زینت ہیں اور یہ سب عرشی

صاحب کی نظرِ کیمیا اثر سے گزر چکے تھے، ان میں اکثر کو انھوں نے روشناس کرایا اور دنیائے علم سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ امام سفیان ثوری کا شمار اسلام کے اولین مصنفین میں ہوتا ہے، وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، ان میں سے بیشتر مفقود ہیں، ان کی تصانیف میں ایک تفسیر بھی تھی، وہ بھی مفقود تھی، عرشی صاحب کو ایک مجموعے میں یہ کتاب مل گئی اور ایک نظر میں وہ بھانپ گئے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کی فکر میں نہ جانے کتنے صاحبانِ علم سرگرداں رہے، یہ بات تو اہلِ علم حضرات پر پوشیدہ نہیں کہ بڑا انکشاف دفعتہً ہوتا ہے، ادبی انکشافات بھی اسی زمرے میں آتے ہیں، لیکن یہ انکشاف محض اسی اہلِ بصیرت کو نصیب ہوتا ہے جس نے اپنی عمر علم کی جستجو میں صرف کی ہو، عرشی صاحب کے ہاتھ یہ نسخہ تصادفاً لگا، اس کا تعارف انھوں نے ایک فاضلانہ مقالے کے ذریعے کرایا جو ۱۹۳۵ء میں رسالہ "معارف" اعظم گڑھ میں چھپا، اس مقالے میں اس کے تنقیدی اڈیشن کی خبر تھی اس میں کچھ تاخیر ہوئی، آخر ۱۹۶۵ء میں وہ اڈیشن تیار ہو گیا، جس کی وجہ سے علم کی دنیا میں سنسنی پیدا ہو گئی، صحیح مسلم کے ایک قدیم نسخے کو روشناس کرانے میں عرشی صاحب نے جس محققانہ صلاحیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ ستائش سے مستغنی ہے۔ عرشی صاحب نے ضمناً ہندوستان میں علمِ حدیث کی رفتارِ ترقی کا بھی جائزہ لیا، ۱۹۲۹ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے ایک مقالے پر ایک یادداشت درج کی تھی جس کا ماحصل یہ تھا کہ ہندوستان میں علمِ حدیث کا چرچا بہت پرانا نہیں اور احادیث کے مہتم بالشان مجموعے ہندوستان میں عام طور پر روشناس نہ تھے۔ نویں صدی ہجری تک رضی الدین صغانی کی مشارق الانوار کا زیادہ رواج ملتا ہے۔ دسویں صدی ہجری میں کتبِ حدیث میں شمایل کا نسخہ پہنچ چکا تھا، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی بدولت مشکوٰۃ، موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے ہندوستان پہنچے، عرشی صاحب کی تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ ہندوستان میں اربابِ حدیث کی آمد تبع تابعین کے دور ہی سے شروع ہو گئی تھی، چنانچہ حسن بصری کے دو شاگردوں کے نام تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں، یہ دونوں بزرگ ہندوستان آئے تھے، ان میں سے ایک صاحب کا نام ابوموسیٰ اسرائیل بن موسی البصری، دوسرے ابوحفص ربیع بن صبیح البصری تھے۔ ان حضرات کی برکت سے علمِ حدیث کا رواج ہندوستان میں بڑھا، چنانچہ چوتھی پانچویں صدی ہجری کے کئی سندی محدثین کے نام ملتے ہیں، ان میں متعدد حضرات کا تعلق دابیل سے تھا اور وہ اسی نسبت سے مذکور ہیں، عرشی صاحب نے قدیم عہد کے ۸ محدثین کے نام درج کیے ہیں، چھٹی صدی کے چار اہلِ فن کا نام عرشی صاحب کے مقالے میں ملتا ہے، ساتویں کے ۵، آٹھویں کے ۱۰، نویں صدی کے ۸ البتہ دسویں صدی میں یہ تعداد بڑھ کر ۵۶ ہو جاتی ہے، ان ۵۶ اہلِ علم کا مختصر حال اس مقالے میں مل جائے گا، غرض اس دلچسپ موضوع کے سلسلے میں عرشی صاحب کی تحقیق بڑی مفید ہے، ضرورت ہے کہ اس موضوع پر جو کتابیں لکھی جائیں ان میں عرشی صاحب کی تحقیق سے استفادہ کیا جائے، عرشی صاحب کا ایک اہم موضوع "نہج البلاغہ کا استناد" ہے، انھوں نے اس مخصوص موضوع پر ۱۰۴ صفحے پر مشتمل ایک رسالہ لکھا ہے جو ان کے مجموعۂ مقالات میں شامل ہے، انھوں نے اس سلسلے میں جو معروضی بحث کی ہے وہ ان کے کمالِ فضل پر دلالت کرتی ہے۔ فارسی میں بھی ان کی تحقیق کا دائرہ کافی وسیع ہے، خیام پر انھوں نے جس بالغ نظری سے بحث کی ہے وہ خیام شناسی میں معتدبہ اضافے کا موجب ہے، تاریخِ محمدی کا انتقادی متن بھی بڑی قابلیت سے شائع کیا ہے، افسوس کہ اس کی صرف ایک ہی جلد طبع ہو سکی، ضرورت ہے کہ یہ مفید کام جلد از جلد پورا کر دیا جائے۔

اردو میں مرحوم کے علمی و ادبی کارنامے عام طور پر معلوم ہیں، غالب ان کا محبوب موضوعِ تحقیق رہا ہے، اس سلسلے میں ان کی کئی تصانیف ہیں جن میں مکاتیبِ غالب، فرہنگِ غالب اور دیوانِ غالب نسخۂ عرشی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، اور اسی وجہ سے ماہرینِ غالبیات میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عرشی صاحب پشتو زبان سے بھی بخوبی واقفیت رکھتے تھے، انھی وجوہ سے ان کی تحقیق میں جو عمق ہے وہ کم لوگوں کے حصے میں آسکا ہے۔

نذیر احمد
یکم دسمبر ۱۹۹۱

فہرست

امتیاز علی خاں عرشی

تاریخِ محمّدی

اور اس کے مؤلف کے احوال و آثار

رضا لائبریری رام پور میں تاریخ محمدی کا ایک مخطوط محفوظ ہے جو میری تحقیق کے مطابق خود مصنّف کے قلم کا لکھا ہوا ہے۔

مخطوطاتِ عربیہ کی فہرست مرتّب کرنے کے دوران میں مجھے اس کتاب کی افادی حیثیت کا علمی تجربہ ہوا۔ اس کی وسعتِ معلومات سے میں اس درجہ متاثر ہوا کہ اُسی وقت سے یہ عزم کر لیا تھا کہ اس کی پہلی جلد کا نسخہ تلاش کر کے دونوں کو کتاب خانے کی طرف سے شائع کرنے کی کوشش کروں گا۔ برٹش میوزیم کی فہرستِ مخطوطاتِ فارسی میں ڈاکٹر ریو نے اس کے ایک قلمی نسخے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ پورے دیباچے، اور جلد اوّل و دوم کے انتخاب پر مشتمل ہے۔

اس اطلاعِ جاں فزا کو دیکھ کر میں نے اُس کا عکس طلب کیا۔ مگر یہ انتخاب خود ہمارے نسخے ہی پر مبنی نکلا اور اس بنا پر ترتیب و تصحیحِ متن میں اس سے زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید جاتی رہی۔ تاہم اشاعت کے ارادے میں وہی پختگی موجود رہی۔ مولانا سیّد مقبول احمد صمدانی مرحوم کے ایک مضمون سے یہ معلوم کر کے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ اس کتاب کا مکمّل نسخہ سیّد محمود علی صاحب رضوی رئیس چھپرہ مئو کے کتاب خانے میں موجود ہے اور موصوف اس معاملے میں اس درجہ دریادل ہیں کہ مولانا کی فرمائش پر ایک انگریز کو اُس کی نقل بھی عطا فرما چکے ہیں۔ چونکہ ہم ہندوستانیوں کا حق ترجیح طلب ہے، اس لیے یقین ہو گیا کہ اگر موصوف سے استدعائے نقل کی گئی، تو وہ ضرور نوازش و کرم سے کام لیں گے اور ہمیں

۱۔ یہ مضمون "یادِ پاستاں" کے عنوان سے رسالہ "معارف" اعظم گڈھ جنوری ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔

پُوری کتاب شائع کرنے کا موقع مل جائے گا۔

سوءِ اتفاق سے مولانا صمدانی کی حیات میں یہ تجویز بروئے کار نہ آسکی اور ان کے انتقال کے بعد مجھے سیّد محمود علی صاحب کا پتا نہ چل سکا۔ آخر کار اس کتاب کا وہ حصہ جو بارہویں صدی کے وفیات پر مشتمل تھا، ایک اور نسخے کی مدد سے مرتّب کرکے شعبۂ تاریخ یونیورسٹی علی گڑھ کے مصارف پر چھپوا دیا گیا جو ابھی تک بازار میں نہیں آسکا ہے۔ ذیل میں اس کتاب کے مؤلف کے بارے میں حاصل شدہ معلومات پیش کی جاتی ہیں تاکہ یہ اہلِ علم کو تعارف کا کام دیں۔

مُصنّف کا نام ونسب

مصنّف کا نام محمد بن رستم بن قباد بن عبدالجلیل بن عبدالکریم بن طوغان حارثی بدخشی ہے۔ اس کا خاندان اصلاً بدخشاں کا رہنے والا ہے، اسی لئے یہ لوگ اپنے آپ کو بدخشی کہتے رہے ہیں۔ سب سے پہلے اس کے پردادا عبدالجلیل حارثی قندھار ہوتے ہوئے ہندوستان آگئے اور کشمیر میں فوت ہوئے۔ اس کے دادا قباد بیگ قندھاری المولد ہیں اور دہلی میں رحلت کی ہے۔ باپ کی پیدائش راندیر کی ہے، اور واکنکیرا میں عالمگیر کی چھاونی کے اندر انتقال کیا ہے۔

حارثی نسبت سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ عربی خاندان کا آدمی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر ناموں میں عجمیت ترکستان کی بود و باش کا نتیجہ ہوگی جس کی مثالیں اور نظیریں کم نہیں ہیں۔

اس خاندان کے متعدد افراد کا تذکرہ کتاب میں ملتا ہے۔ ان تمام افراد کے مشاغلِ زندگی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تیغ و قلم دونوں سے کام لیتے رہے ہیں۔ چنانچہ حارثی کا پردادا فقیہِ حنفی ہے، دادا بڑا معقولی اور خصوصًا ریاضی داں ہے۔ باپ مختلف علوم قرأۃ، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، کلام، شعر اور ادب کا ماہر ہے۔ حکمیات و ریاضیات پر بھی اچھی نظر ہے۔ یونانی زبان پر اتنی قدرت ہے کہ علمی کتابوں کا عربی اور فارسی میں بلا تکلّف ترجمہ کرتا ہے۔

مصنّف کی پرورش اسی بیت السیف والقلم میں ہوئی ہے، اس لئے اس نے بھی تمام مروّجہ علوم کی تحصیل کی ہے۔ کتاب میں اپنے ایک استاد حدیث کا ذکر بھی کیا ہے، مگر برخلاف آباء، مصنّف کو ابتدا سے تاریخ سے دل چسپی تھی؛ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ اس نے اپنی عمر کے ۲۶ ویں سال میں اس انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب پر قلم اٹھایا ہے۔

مُصنّف کی پیدائش

حارثی کی پیدائش ۲۱ جمادی الاولیٰ ۳۰ سنہ عالم گیری مطابق ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۷ء) کو جلال آباد میں واقع ہوئی۔ تعلیم سے فارغ ہوکر ۲۵ جمادی الآخرہ ۱۱۱۵ھ (نومبر ۱۷۰۳ء) کو سترھویں سال کی عمر میں شاہی ملازمت میں داخل ہوا۔ دورانِ ملازمت کے واقعات اور اس کی زندگی کے دوسرے کوائف کا پتا نہیں چلتا، بجز اس کے کہ ۱۹ برس کی عمر میں باپ کا سایہ اس کے سر سے اُٹھا تھا۔ "عبرت نامہ" کے نام سے اس نے ایک کتاب لکھی تھی، جس کے دو نسخے انڈیا آفس کے کتاب خانے میں اور ایک پٹنے میں موجود ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں مؤلف نے خود اپنے حالات بھی درج کئے تھے۔ افسوس کہ یہ کتاب ہمارے کتاب خانے میں نہیں، ورنہ اس کی زندگی پر مزید روشنی ڈالی جاسکتی تھی۔ ہاں فہرستوں وغیرہ سے اُس کی تصنیفات کے بارے میں کچھ باتیں معلوم ہوتی ہیں، جنھیں تصنیفات کے عنوان کے ماتحت لکھا جائے گا۔

افرادِ خاندان

حارثی نے تاریخِ محمدی میں اپنے متعدد عزیزوں کا ذکر کیا ہے، مگر اس کتاب کی ترتیب سنہ وار ہے، اس بنا پر ان لوگوں کے حالات ایک جگہ نہیں ملتے۔ میں آئندہ سطروں میں وہ ٹکڑے خود حارثی کے لفظوں میں نقل کیے دیتا ہوں۔

(۱) ۱۱۱۷ھ کے ماتحت اپنے والد کے متعلق لکھتا ہے:

"رستم المخاطب بمعتمد خان بن قباد الملقب بدیانت خان بن عبد الجلیل الحارثی البدخشی الاصل الهندی المولد، کان جامعًا للعلوم، لاسیما الحکمیات، خصوصًا الریاضیات، فانه کان فیه فرید عصره۔ وکان له باع طویل فی اللغة والعربیة۔ وکان ذا مناسبة تامة بالقرأة والتفسیر والحدیث والفقه

وَالاصُول وَالکلام وَالشعروَالادَب۔ وَکانَ عَارفاً باللسان
الیونانیۃ۔ وَکانَ یُترجم کتبہُم بالعربیۃ وَالفارسیۃ۔

وَھوَ وَالد محرّر ھٰذہ الارقام، غفراللّٰہ لہما وَاحسن
الیہا۔ وَکانت وَلادتہ فی شوال سَنۃ ثمان وَاربعین وَ
الف ببلدۃ راندیر من بلاد الدکن۔ وَمَات یوم الاثنین
الثامن عشر من جمادی الاولیٰ وَقتَ الضحیٰ بقرب قلعۃ
وانکنکیرا من بلادِ الدکن فی معسکر سُلطان العصر بالارث
وَالاستحقاق، ابی المُظفّر محی الدّین محمّد اَورنگ زیب
بہادُر عَالمگیر بَادشاہ الغازی، اسکنہ اللّٰہ الجنان۔ ثمّ
نقلَ اِلیٰ بَلدۃ دھلی، وکانَ لِراقم السّطوُر یومئذ تسع
عشر سَنۃ کاملۃ، ھزاری، صَد سَوار۔"

اس بیان سے حارثیؒ کے باپ کے متعلق معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑا معقولی تھا۔ منقولات پر بھی اچھی نظر تھی۔ یونانی کا ایسا عالم تھا کہ یونانی کتابوں کے عربی اور فارسی میں ترجمے کرتا تھا۔ ۱۰۴۸ء (۱۶۳۸ء) میں راندیر میں پیدا ہوا تھا۔ عالمگیر کے دربار میں ہزاری ذات اور سو سواروں کا منصب دار تھا۔ دکن کی جنگ میں لشکر سلطانی کے ہمراہ تھا، وہیں ۱۱۱۷ھ (۱۷۰۵ء) میں فوت ہوا اور دہلی میں نعش لاکر دفن کی گئی۔

(۲) ۱۰۸۳ھ (۱۶۷۲ء) کے وفیات میں اپنے دادا کے متعلق لکھتا ہے:

"قبادبیگ المخاطب بدیانت خاں بن عبد الجلیل
بن عبد الکریم الحارثی البدخشی وُلد بقندھار ونشاء
بالھند، وصَارذا منزلۃ عند السلطان الکبیر عالمگیر
بادشاہ الغازی۔ وکانَ من علماء المعقول لاسیما الریاضیات
فانّہ کانَ فیہ وحید دَھرہ وفرید عصرہ۔ مَات فی رمضان
بدھلی، وَلہ ۷۱ سَنۃ۔

وَھُوَ جد محرّر ھٰذہ الارقام۔ وَقد مر ابوہ فی
۱۰۲۰ھ، ھزار و پانصدی۔ (اسماع ومآثر عالمگیر۔)"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی کا دادا بھی بڑا معقولی اور ریاضی داں تھا۔ عالمگیر کے دربار میں اس کی منزلت تھی اور ہزار و پانصدی کا منصب رکھتا تھا۔ قندھار میں پیدائش اور دہلی میں وفات ہوئی۔ وقتِ انتقال ۷۱ برس کی عمر تھی۔ گویا ۱۰۱۲ھ (۱۶۰۳ء) میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی عمر اپنے باپ کے انتقال کے وقت صرف آٹھ سال کی تھی۔

(۳) سنہ ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱ء) کے وفیات میں اپنے پردادا کے بارے میں کہتا ہے:

"عبد الجلیل بن عبد الکریم بن المولیٰ طوغانی الحارثی
البدخشی، نزیل الھند، العالم الفقیہ الحنفی، مات بکشمیر
فی ھٰذہ السّنۃ تقریباً۔ وَسیاتی ابناہ: قبادبیگ المخاطب
بدیانت خاں فی ۱۰۸۳ھ، وَحسن بیگ فی ۱۰۷۴ھ۔ (کذا
سمعت من بعض رجال قومی۔)"

اس سے پتا چلتا ہے کہ حارثی خاندان کا پہلا شخص جو واردِ ہندوستان ہوا، عبد الجلیل تھا۔ حنفی فقیہ تھا۔ غالباً دنیوی جاہ و منزلت نصیب نہیں ہوئی۔ اس کا سنہ وفات بھی حارثی کو صرف تخمینی طور پر خاندان کے کسی بڑے بوڑھے سے معلوم ہوا ہے۔ کتاب میں عبد الجلیل کے باپ دادا کا ذکر نہیں ملتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے بہت سے غیر ہندی خاندانوں کی طرح اس خاندان کے تعلقات بھی بدخشاں سے بالکل ٹوٹ گئے تھے۔ اور پس ماندوں کو صرف عبد الجلیل اور اس کے اخلاف کا علم تھا۔

(۴) عبد الجلیل کے ایک بیٹے کا ذکر کیا جا چکا ہے، دوسرے بیٹے حسن بیگ کے متعلق ۱۰۷۴ھ (۱۶۶۳ء) کے ماتحت لکھا ہے:

"حسن بیگ المتخلّص بہ رُکھی، بن عبد الجلیل بن الکریم
الحارثی البدخشی، در اوائل سال فوت شُد۔ عمرش ۷۵
سال۔ دو سے بجودت نظم ونثر مشہور بود، وعمّ پدر مسعود

اوراق است۔ وپدرش در ۱۰۲ھ گذشت، (صماح)۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن بیگ سنہ ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸ء) میں پیدا ہوا اور ۳ برس کی عمر میں یتیم ہوگیا۔ یہ بڑا ادیب تھا۔ نظم ونثر دونوں پر قدرت رکھتا تھا، اور "آگہی" تخلص کرتا تھا۔

میں نے خان آرزو کے تذکرے "مجمع النفائس"، اور عاشقی کے تذکرے، "نشترِ عشق" میں آگہی کو تلاش کیا، مگر ان دونوں میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

(۵) سنہ ۱۰۹۹ھ (۱۶۸۷ء) کے ماتحت اپنے دادا کے چچازاد بھائی کا ان لفظوں میں ذکر کیا ہے:

"ابوتراب بن عبد العزیز بن عبد الکریم الحارثی البدخشی من عرفاء العصر مات بدکن و له ۶۵ سنة۔ وهو ابن عم جد مسود الاوراق۔"

(۶) سنہ ۱۱۰۱ھ (۱۶۸۹ء) کے ذیل میں اپنے چچا کے بارے میں لکھتا ہے:

"دیوافگن مخاطب بمعتمد خان بن قباد مخاطب بدیانت خان از امرای عالمگیری، در ماہ جمادی الاولی در دکن فوت شد۔ وے عم مسود این اوراق است۔ عمرش ۶۳ سال بود۔ پدرش در ۱۰۸۳ھ گذشت۔ ہزار و پانصدی۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی کا چچا سنہ ۱۰۳۸ھ (۱۶۲۸ء) میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اس کے باپ کا بڑا بھائی تھا۔ اسی لئے اپنے باپ کے منصب ہزار و پانصدی پر فائز ہوا۔ ۶۳ سال کی عمر میں دکن کے اندر غالباً لشکر عالمگیری میں ۱۱۰۱ھ میں اُس کا انتقال ہوا۔

(۷) باپ کے ایک چچازاد بھائی کا ذکر سنہ ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) کے ماتحت کرتے ہوئے کہتا ہے:

"محمد بیگ مخاطب بہ مخلص خان بہادر بن احمد بیگ حارثی بدخشی، از کبار امرائے شاہ عالمی، نیم روز سہ شنبہ ۲۱ صفر بحکم جہاندار شاہ بقتل رسید، سنش ۵۲ سال۔ وے ابن عم والد محرر این ارقام بود و اخلاق کریمہ بسیار داشت۔ چہار ہزاری۔"

حارثی کا یہ رشتے کا چچا سنہ ۱۰۷۲ھ (۱۶۶۱ء) میں پیدا ہوا تھا۔ یہ شاہ عالم بہادر شاہ اوّل کے دربار کا بہت بڑا سردار اور چہار ہزاری منصب اور خطاب مخلص خان بہادر سے سرفراز تھا۔

(۸) اپنے حقیقی چچا کے بیٹے کا ذکر سنہ ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۸ء) میں اس طرح کیا ہے:

"محمد فغفور خان بن دیوافگن مخاطب بمعتمد خان بن دیانت خان حارثی بدخشی، از امرائے عصر، ۷ رمضان در شاہجہان آباد فوت شد۔ عمرش ۶۵ سال۔ وگاہے شعر ہم می گفت۔ وے ابن عم مسود اوراق ست۔ وپدرش در ۱۱۰۱ھ گذشت۔"

یہ سنہ ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۵ء) میں پیدا ہوا۔ دہلی کے امرا میں سے تھا۔ شعر بھی کہہ لیتا تھا۔ ۶۵ برس کی عمر میں مرگیا۔

(۹) حارثی نے اپنے ایک حقیقی بھائی کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ سنہ ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۲ء) کے ماتحت لکھتا ہے:

"میرزا عبد الرحمٰن متخلص بہ غیرت بن رستم مخاطب بمعتمد خان بن قباد مخاطب بدیانت خان حارثی بدخشی، جوان مستعد طالب علم شاعر بود۔ او بمحاسن اخلاق اتصاف داشت۔ روز شنبہ ۵ ذی القعدہ در شاہجہان آباد فوت شد، یک پہر روز ماندہ۔ عمرش ... سال و ۳ ماہ۔ وے برادر اعیانی جامع این اوراق بود۔"

حارثی کا بھائی اس خاندان کا تیسرا شاعر ہے۔ کتاب کے رام پوری نسخہ میں اس کی عمر کے ہندسے پڑھنے میں نہیں آئے، اس لئے یہ بتانا ممکن نہیں کہ یہ حارثی سے بڑا تھا یا چھوٹا۔ البتہ عبارت سے یہ ضرور مترشح ہے کہ اس نے جوانی میں انتقال کیا۔ محولہ بالا دونوں تذکروں میں اس کا بھی ذکر نہیں ہے۔

(۱۰) سنہ ۱۱۵۴ھ (۱۷۴۱ء) میں اپنی والدہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

"زاہدہ خانم بنت میرک بیگ بن خواجہ بیگ الحارثیہ، زوجہ محمد رستم المخاطب بمعتمد خان بن قباد بیگ الحارثی و والدۃ جامع هذه الاوراق میرزا محمد بن معتمد خان، توفیت

غرۃ جمادی الاولیٰ بشاہجہان آباد ولہا ۸۳ سنۃ الا اشہر
وکانت جامعۃ لخصال الخیر من الورع والعفاف والسخاء
ومحاسن الاخلاق، کثیر البر والاحسان الی الاقارب والاباعد۔
وقد مرزوجہا فی ۱۱۱۷ ھ"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی کی والدہ تقریباً ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۰ء) میں پیدا ہوئی تھی، اور اپنے شوہر سے ۲۳ سال چھوٹی تھی۔ خود حارثی کی والدہ کا خاندان بھی حارثی بدخشی ہے، اور اس لیے بعید نہیں کہ اوپر جا کر یہ سب عبدالجلیل کے کسی بزرگ سے مل جاتے ہوں۔

(۱۱) اپنے ماموں کے متعلق سنہ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں لکھتا ہے:

"محمد خواجہ مخاطب بہ مختص خان میرک بیگ بن خواجہ
بیگ حارثی بدخشی، از امرائے عصر، در ماہ صفر بشاہجہان آباد
فوت شد۔ عمرش ۴۳ سال۔ وے خال حقیقی جامع این اوراق
بود۔"

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ محمد خواجہ ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۶ء) میں پیدا ہوا تھا، اور اپنی بہن سے عمر میں چھوٹا تھا۔ حارثی نے اسے بھی امرائے عصر میں ظاہر کیا ہے اور مختص خاں خطاب بتایا ہے۔

(۱۲) حارثی کے دوسرے ماموں کا نام نعمان بیگ بن میرک بیگ تھا۔ ان کے پوتے کا تذکرہ ۱۱۵۴ھ (۱۷۴۱ء) کے ماتحت ان لفظوں میں کیا ہے:

مظفر حسین متخلص بہ حسین بن محمد غیاث بن نعمان بیگ بن
میرک بیگ حارثی بدخشی، شاعر خوش کلام، ۲۱ تا ۲۲ شوال
در ہمراہی نجیب علی خاں ... فوجدار اٹاوہ در جنگ ..."

باقی عبارت حاشیے کے ساتھ کٹ گئی ہے۔ یہ اس خاندان کا چوتھا ادیب ہے۔

(۱۳) اسی خاندان کے ایک فرد کا تذکرہ ۱۱۳۹ھ (۱۷۲۶ء) کے ماتحت کیا ہے۔ مجلد نے حاشیے کے ساتھ کچھ عبارت کاٹ دی ہے، اس لیے مصنف سے اس کے رشتے کا پتا نہیں چلتا۔ مؤلف اس کے متعلق لکھتا ہے:

"میرزا محمد افلاطون بن جعفر بیگ الحارثی البدخشی ثم
الدہلوی، الزاہد العالم الفقیہ الحنفی۔ وکان کامل العقل
وافر الدہاء۔ مات بشاہجہان آباد یوم الاثنین، ۲۲ ربیع الاول،
ولہ ۷۳ سنۃ"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ۱۰۶۶ھ (۱۶۵۵ء) میں پیدا ہوا تھا اور دہلی میں فوت ہوا۔ یہ زاہد اور فقیہ تھا۔

(۱۴) ایک اور فرد اسی خاندان کا ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں مذکور ہے۔ اس کے متعلق کہتا ہے:

"جمیل بیگ بن ابو تراب حارثی، از امرائے اکبر شاہی
و جہانگیر شاہی در کشمیر فوت شد۔ وے بصلاح و تقویٰ و
علم و فضل اختصاص داشت۔ و عبدالجلیل کہ جد والد راقم
... موصی الیہ بود، وہکذا رایت فی بعض مسودات قد ملہ
قومی، عرفات العاشقین"

اصل کتاب میں چند لفظ کسی نے مٹا دیے ہیں، اس لیے رشتہ معلوم نہ ہو سکا۔ بظاہر یہ ابو تراب حارثی مصنف کے پردادا عبدالجلیل کے بھائی عبدالعزیز کا بیٹا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو جمیل بیگ اس کے دادا کا چچا زاد بھائی ہوا۔

مطالعہ کرنے والوں کی سہولت کے خیال سے میں حارثی کے والدین کے خاندان کا شجرہ علاحدہ علاحدہ لکھ دیتا ہوں، جو حسب ذیل ہے:

تعلیم و تصنیف :

مصنف کے خاندان میں علم و دولت دونوں کی برکتیں پائی جاتی تھیں ، اس بنا پر یقین ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت میں خاص کوشش کی گئی ہوگی ۔ علومِ الٰہیہ کے متعلق خود اس کا کوئی بیان ہمارے سامنے نہیں ہے ۔ البتہ ۱۱۱۳ھ (۱۷۰۱ء) کے ماتحت اپنے حدیث کے ایک استاد کا ان لفظوں تذکرہ کیا ہے :

الشیخ مقرب اللہ بن جار اللہ بن نور اللہ بن نور الحق بن الشیخ المحدث عبد الحق بن سیف الدین الترک الدھلوی العلامۃ المتقن الحنفی مات فی رمضان بدھلی ، ولہ غوستین سنۃ ۔ و ھو اول من قرأت علیہ الحدیث ۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حارثی نے سب سے پہلے دہلی کے مشہور محدث خاندان کے بزرگ شیخ مقرب اللہ سے حدیث پڑھی ۔

ہمارے کتب خانے میں مختلف علوم و فنون کی متعدد قلمی کتابوں پر مصنف کے دستخط اور مہریں ہیں ، چنانچہ ابن الہیثم کی شرح مصادرات کے پہلے صفحے پر جو الفاظ اس نے لکھے ہیں ، وہ حسب ذیل ہیں :

" اللہ اکبر

من عواری الزمان عند العبد الضعیف الراجی رحمۃ ربہ المنان میرزا محمد بن معتمد خان ختم اللہ لہ بالامن والایمان ۔"

اس عبارت کے اوپر بیضوی شکل کی چھوٹی سی مہر ہے ، جس میں "یا محمد" لکھا ہوا ہے حیدرآباد کے کتاب خانے میں بھی متعدد کتابوں پر یہی عبارت اور مہر میں نے دیکھی ہے ۔ تذکرہ صوفیہ کی ایک کتاب موسوم بہ "مختصر مجمع الاحباب" کتاب خانہ عالیہ رام پور میں محفوظ ہے ۔ اس کے پہلے صفحے پر حارثی نے اپنے قلم سے ۲۰ سطروں کا ایک نوٹ لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ یہ کتاب "حلیۃ الاولیا" ابو نعیم اصفہانی اور "صفوۃ الصفوہ" ابن الجوزی کا اختصار ہے اور اس کا مصنف محمد بن الحسن ، علامہ نووی متوفی ۶۷۶ھ (۱۲۷۷ء) کے شاگرد کا شاگرد ہے ۔ کتاب کے حاشیوں پر جا بجا تصحیحات اور ذیلی عنوانات اپنے قلم سے لکھے ہیں اور کتابوں پر بھی اس کی تصحیحیں پائی جاتی ہیں ۔
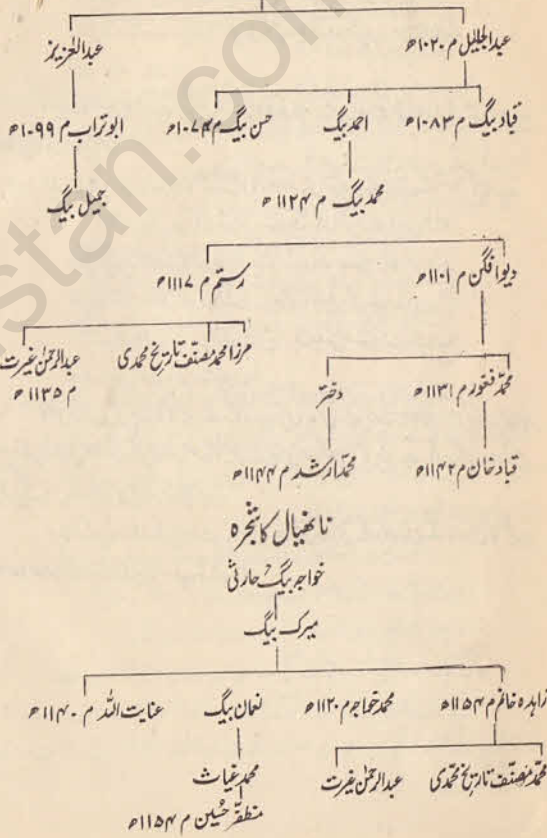
ان امور سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس نے تمام مروجہ علوم پڑھے تھے، اور مختلف علوم کی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا تھا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اُسے زیادہ دلچسپی تاریخ و تذکرہ سے رہی ہے، چنانچہ اس نے سب سے بڑی کتاب تاریخ ہی پر تصنیف کی اور اس کا نام تاریخ محمدی رکھا، میں پہلے اس کی دوسری کتابوں کا تذکرہ کرتا ہوں۔

ردّ البدعۃ

ان میں کی پہلی کتاب "ردّ البدعۃ فی معتقد اہل السنۃ" ہے جو فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ شاہ محمد حمزہ صاحب مارہروی نے ۱۱۸۴ھ (۱۷۷۰ء) میں اس کتاب کا مطالعہ کیا تھا۔ تاریخ محمدی کے ورق ۱۵۵ الف کے حاشیے پر شاہ صاحب لکھتے ہیں:

"رسالۂ ردّ البدعۃ از تالیفات مؤلف ایں تاریخ میرزا محمد حارثی بدخشی در سنۃ ۱۱۸۴ھ نزد ایں فقیر رسید۔ فوت والد خود محمد رستم ہفتدہم جمادی الاولیٰ سنۃ مسطور نوشتہ است۔ و ایں رسالۂ مذکورہ در عنفوان شباب بعمر بست سالہ ارقام ساختہ، تحقیقات خوب بکار بردہ۔"

اس تحریر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسالۂ ردّ البدعۃ ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) کے قریب لکھا گیا تھا اور یہ مصنف کی ابتدائی تصنیفات میں سے ہے۔ کتاب خانۂ رام پور میں اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ اور مولف کی حیات میں میر جمال الدین پسر ہدایت اللہ بن میر اسد اللہ حسینی نے اس کی کتابت کی ہے۔

مفتاح النجا:

دوسری تصنیف "مفتاح النجا فی مناقب آل عبا" ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب پر لکھی گئی ہے۔ آنے والی دونوں کتابوں "نزل الابرار" اور "تحفۃ المحبین" میں اس کا حوالہ ملتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان دونوں سے پہلے مصنف نے اسے تصنیف کیا تھا۔

تحفۃ المحبین:

تیسری تالیف "تحفۃ المحبین بمناقب الخلفاء الراشدین" ہے جو عربی زبان میں خلفائے راشدین

کے فضائل پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے خاتمے سے پتا چلتا ہے کہ جمعے کے دن ۷ رمضان ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) کو فرخ سیر کے عہدِ حکومت میں مصنف نے اسے ختم کیا ہے۔

کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں اس کا ایک مخطوطہ ہے جسے سید رحم علی کاتب نے ۱۳۶ صفحوں پر نستعلیق خط میں لکھا ہے۔ اس کا اندازِ تحریر نمبر ۴ سے ملتا جلتا ہے جو ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) کی نوشتہ ہے، اس لئے بعید نہیں کہ یہ بھی اسی سال کے قریب لکھی گئی ہو۔

نزل الابرار:

چوتھی کتاب "نزل الابرار فی فضائل الائمۃ الاطہار" ہے۔ یہ بھی عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کا آغاز ۱۷ رمضان ۱۱۲۶ھ (۱۷۱۴ء) کو ہوا تھا اور دہلی کے کسی امیر کے نام معنون تھی۔ کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے، جو بخط نستعلیق معمولی، اوسط سائز کے ۲۷ صفحوں پر ۱۴ / ذی قعدہ ۱۱۹۴ھ (۱۷۸۰ء) میں لکھا گیا ہے۔ اس کا خط نمبر ۳ کے مشابہ ہے، جس سے میں یہ قیاس کرتا ہوں کہ سید رحم علی ہی نے اسے بھی لکھا ہے۔ دیباچے میں مصنف نے کہا ہے کہ چونکہ مفتاح النجا میں مناقب کی ہر طرح کی حدیثیں جمع کی گئی تھیں، اس لیے بعض احباب نے صرف صحیح حدیثوں پر مشتمل کتاب کی تالیف کی فرمائش کی۔ یہ کتاب اس فرمائش کی تعمیل میں مرتب ہوئی ہے۔

عبرت نامہ

پانچویں تالیف "عبرت نامہ" ہے۔ یہ فارسی زبان میں لکھی گئی ہے۔ شروع میں مصنف نے اپنے حالات لکھے ہیں۔ ان کے بعد عالم گیر کی حکومت کے آخری تین سالوں کے مجمل حالات اور بعد ازاں وفات عالم گیر ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) سے فرخ سیر کی وفات ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء تک کے واقعات درج کیے ہیں۔

ڈاکٹر ایتھے نے انڈیا آفس لائبریری کی فہرست مخطوطات فارسی میں نمبر ہائے ۳۹۲ و ۲۸۳۴ پر اس کتاب کا ذکر کیا ہے، مگر پہلے نمبر پر اس کا نام عبرت نامہ اور دوسرے پر تاریخ محمد بن معتمد خاں لکھا ہے۔ ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست (جلد ۳، صفحہ ۹۴۴) میں محمد بخش آشوب کی "تاریخ محمد شاہی" کے ضمن میں اس کتاب کا اس لئے تذکرہ کیا ہے کہ آشوب اپنی تاریخ میں جا بجا اس کے حوالے دیتا ہے اور اس پر اعتماد ظاہر کرتا ہے۔ ڈاکٹر ریو اسے "یادداشتہائے میرزا محمد صاحب" کہتا ہے۔ ایتھے کا خیال ہے کہ ان یادداشتوں سے یہی "عبرت نامہ" مراد ہے۔

اس کا ایک نسخہ پٹنے میں بھی محفوظ ہے۔ مرتبِ فہرست (جلد ۷، صفحہ ۱۶۷) نے اس کے عنوانات جوں کے توں نقل کر دیے ہیں۔ ان کی مدد سے کتاب کے مطالب کا اجمالی علم حاصل ہو جاتا ہے۔

تاریخِ محمدی:

حارثی کی سب سے بڑی اور قابلِ قدر کتاب تاریخِ محمدی ہے۔ ہمارے پاس اس کا جو نسخہ بخطِ مصنف موجود ہے، اُس کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ صرف وفیات کا سنہ وار تذکرہ ہے۔ مگر دیباچے میں مصنف نے لکھا ہے کہ اس میں ملتِ محمدیہ کے واقعات بھی بالاجمال بیان کیے گئے ہیں۔ مولانا حمدانی مرحوم نے بھی پھیراسئو کے نسخے میں واقعات کا مذکور ہونا ظاہر فرمایا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں سیرتِ محمدی بعد ازاں سنہ ہجرت کی ایجاد کا قصہ اور پھر سنہ وار وفیات درج ہیں۔ اس کتاب کے نام کے متعلق مصنف لکھتا ہے:

«از آنجا کہ ایں کتاب مستطاب محتوی بر احوال اکابر
امتِ مرحومۂ محمدیہ و زمان ظہور دولت یافتۂ آنحضرت
است و ذکر امم دیگر را شامل نیست، و جامع ایں اوراق
پریشان نیز باسم سامی حضرت خیر الانام می تسمی دارد،
ایں کتاب والا انتساب را بدیں دو مناسبت تاریخِ محمدی نام
نہادہ شد۔»

کتاب کی ترتیب و تالیف میں جن پچھلی تصنیفات سے مدد لی ہے، دیباچے میں ان کی فہرست دے دی ہے۔ اور چونکہ ہر بار پورا نام لکھنے میں ہرج ہوتا ہے، اس لیے دیباچے میں ان کے مخففات بنا کر اصل کتاب میں ہر شخص کے نام کے اُوپر یہ مخففات شنگرف سے لکھ دیے ہیں۔ اپنے معاصرین کے ناموں کے اُوپر لفظ عصری لکھ دیا ہے۔ دوسری جلد کے شروع میں بھی ایک دیباچہ لکھا ہے، جس میں کتابوں کے رموز و علامات کا اعادہ کیا ہے۔

سنہ تصنیف:

مصنف دیباچے میں آغاز تصنیف کے متعلق کہتا ہے:

«بنا بریں امور، روز دوشنبہ بیست و هفتم جمادی الآخرہ

سال یک ہزار و یک صد و بیست و چہار ہجری در ایں مہم
اہم شروع نمودم۔»

۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) میں کتاب کے آغاز سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنف نے، جس کی پیدائش ۱۰۵۸ھ (۱۶۴۸ء) میں واقع ہوئی تھی، اپنی عمر کے چھیاسٹھویں سال میں اس انسائیکلوپیڈیا کو شروع کیا۔

کتاب خانۂ عالیہ رام پور کے نسخے میں مصنف کے قلم کی تحریر ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۷ء) میں ختم ہو جاتی ہے، یعنی یہ آخری سنہ ہے جس کے ماتحت اس نے وفیات درج کیے ہیں۔ اس کے بعد چند سنین کے عنوان تو اس کے قلم کے نوشتہ ہیں، لیکن اندراجات دوسرے خط اور دوسرے اندازِ تحریر میں ہیں۔ بنا بریں میرا قیاس یہ ہے کہ ۳۷ سال کی مدت اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں صرف ہوئی ہے۔

ڈاکٹر ریو اپنی فہرست (جلد ۳، صفحہ ۸۹۵) میں ۱۱۹۰ھ (۱۷۷۶ء) کو اس کا سال اختتام قرار دیتے ہیں، اور باقی آئندہ سالوں کے اندراجات کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ مگر میں اسے غلط فہمی پر محمول کرتا ہوں، اور اس کا منشا برٹش میوزیم کے نسخے کو قرار دیتا ہوں، جس میں سنہ مذکور تک مسلسل ایک ہی قلم سے متوفی اصحاب کا تذکرہ لکھا گیا ہے۔ چونکہ میں ریو کے نسخے کو رام پور کے نسخے پر مبنی مانتا ہوں اس لئے تاریخِ اختتام کے فیصلے کے لئے نسخۂ رام پور کو شہادت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا پہلے ریو کے نسخے کے بارے میں دو چار اہم باتیں لکھ دینا مناسب ہوگا۔ برٹش میوزیم کے نسخے کے سرورق پر حسب ذیل نوٹ مندرج ہے:

«منتخبات از جلد اوّل و دوم تاریخِ محمدی مملوکۂ سید
آلِ رسول مارہرہ والی۔ کتاب ہٰذا از کتابیکہ بذریعۂ
محمد نصر اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر ضلع علی گڑھ دست یاب شد،
بطور انتخاب از و نقل گرفتہ شد، از جلد اوّل از سنہ ۴۲۱
لغایت سنہ ۵۹۹، دو ورق، جلد دوم از سنہ ۶۰۷ لغایت سنہ ۱۲۰۸ھ۔»

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نصر اللہ خاں کی معرفت تاریخِ محمدی کا کوئی نسخہ سید آلِ رسول صاحب مارہروی نے حاصل کر کے اس کے منتخبات[1] جدا نقل کرائے تھے۔ نیز یہ کہ اس نسخے

[1] یعنی آلِ رسول صاحب نے تاریخِ محمدی میں سے صرف ہندوستانی اشخاص کے تراجم انتخاب کیے ہیں۔

میں جلد دوم کا آغاز ۶۰۷ھ اور اختتام ۱۲۰۸ھ پر ہوا تھا۔ سیّد آلِ رسول صاحب کے لئے یہ منتخب نسخہ ایک خوش نویس نے نقل کیا۔ چونکہ اصل میں ۱۱۹۰ھ سے عنوانات پر سنہ لکھ کر ہر سنہ کے نیچے وفیات لکھے تھے۔ اس لئے کاتب نے بھی نقل میں اس کا اتباع کیا، بعدازاں بلا عنوان متعدد وفیات کا اصل میں اندراج تھا۔ اس حصّے کو منتخب کرکے کاتب نے بھی یوں ہی نقل کر دیا۔ ڈاکٹر ریو کے سامنے یہ نقل تھی۔ انھوں نے ۱۱۹۰ھ تک کے تسلسل کو پیش نظر رکھ کر یہ نتیجہ نکال لیا کہ اس سنہ تک اصل مصنّف کا کام ہے، لہٰذا یہی سالِ اختتام ہوگا۔

اب ہمیں نسخۂ رام پور کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ یہ نسخہ سیّد مہدی میاں صاحب نے جو مارہرے کے مشہور برکاتی خاندان کے ایک فرد تھے، نواب حامد علی خان بہادر کے حضور میں پیش کیا تھا۔ یہ اوّل سے ناقص ہونے کے باعث ورق ۹ سے شروع ہوتا ہے، جس کے حصۂ الف پر ۶۰۶ھ کے بقیہ وفیات ہیں اور حصۂ ب سے ۶۰۷ھ کے وفیات شروع ہوتے ہیں۔ ۱۱۶۱ھ تک جو ورق ۵۹۹ الف پر ختم ہوتا ہے، ایک ہی قلم کی تحریر ہے، صرف دس پانچ جگہ دوسرے قلم سے سادہ جگہوں میں ایک دو ایسے نام بڑھائے گئے ہیں جو اصل مصنّف سے رہ گئے تھے۔ ۱۱۶۲ھ سے مذکورۂ بالا دوسرے قلم کے اندراجات شروع ہوتے ہیں۔ ۱۱۹۰ھ تک کتاب سنہ وار ہے۔ مگر ورق ۶۱۸ ب پر ۱۱۹۱ھ سے ۱۱۹۶ھ تک متوفی اصحاب کو ایک ہی صفحے پر لکھا ہے۔ اس کے بعد کا ورق ضائع ہوگیا ہے۔ ۱۱۶۴ھ کے ماتحت استاذ المحققین سیّد آلِ محمّد قادری مارہروی کا نام لکھا ہے۔ اس نام کے ختم پر کسی اور شخص نے لکھا ہے: "وسیاقی ابنہ شاہ حمزہ فی ۱۱۹۸ھ" گویا یہ تیسرا قلم ہے جو اس کتاب پر چلا ہے۔ ایک دو جگہ اور اس خط میں اضافے نظر آتے ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ یہ دونوں خط کس کے معلوم ہوتے ہیں؟ کتاب خانۂ رام پور میں اس خاندان کے ایک بزرگ سیّد شاہ آلِ احمد بن سیّد شاہ محمّد حمزہ مارہروی کی دو کتابیں "آئینۂ محمّدی" جلد پنجم اور "کشکول" محفوظ ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی کتابت دو کاتبوں نے کی ہے۔ بلکہ ایک دو جگہ ایسا شبہ گزرا ہے کہ تیسرا شخص بھی شریک تھا۔ تاریخِ محمّدی میں آخری دو خطوں میں سے جو خط زیادہ پایا جاتا ہے، وہ ان دونوں کتابوں میں بھی موجود ہے۔ نیز دوسرے خط کی عبارتیں بھی مذکورۂ بالا دونوں کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

خطِ اوّل کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ شاہ آلِ احمد صاحب مارہروی کا ہے۔ چونکہ "آئینۂ محمّدی" اور "کشکول" مسودے کی شکل میں ہیں۔ اس بنا پر یہ قرینِ قیاس ہے کہ ہم اسے بخطِ مصنّف و بخطِ دیگر قرار دیں اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ مصنّف نے دوسرے کاتبوں کو کیوں شریکِ کتابت کیا، تو اس کے جواب میں ان دونوں کی ضخامت کے عذر کو پیش کریں۔ ریو کے نسخے کے سرورق پر جو تحریر ہے اس کا انداز بھی کسی قدر اس شاہ آلِ احمد والی تحریر کے انداز سے ملتا جلتا ہے۔

ان تمام امور کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے، تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ "تاریخِ محمّدی" کا لندنی نسخہ مارہرہ میں شاہ آلِ رسول صاحب کے لئے تیار ہوا۔ رام پور کا نسخہ مارہرے کے اسی خاندان کے ایک بزرگ نے دربارِ رام پور میں پیش کیا تھا۔ اس نسخے کے اندر جن دو خطوں میں اضافے نظر آئے ہیں ان میں سے ایک خط شاہ آلِ احمد صاحب کی کتاب آئینۂ محمّدی اور کشکول کے خط کے مشابہ ہے۔ آئینۂ محمّدی کے اس خط کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ خود شاہ آلِ احمد صاحب کا ہے۔ اگر یہ درست ہے، تو پھر تاریخِ محمّدی کے اندراجات بھی انھیں کے ہوں گے اور چونکہ لندنی نسخے کے سرورق کی تحریر بھی انھیں کی معلوم ہوتی ہے۔ اس بنا پر یہ قیاس درست ہوگا کہ لندنی نسخہ رام پور کے نسخے کی نقل ہے۔

یہ قیاس حدِ یقین تک پہنچ جاتا ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ لندنی نسخے کی جلد ثانی میں انھیں لفظوں اور فقروں کے لئے سادی جگہیں چھوڑی گئی ہیں جو رام پور کے نسخے میں یا تو حاشیے کے ساتھ کٹ چکے ہیں یا کاغذ کے گل جانے کے باعث پڑھنے میں نہیں آتے، کیونکہ اگر وہ کسی دوسرے نسخے کی نقل ہوتا، تو دشوار تھا کہ دونوں نسخوں میں الفاظ و فقرات کا فقدان بالکل یکساں ہوتا۔

مذکورۂ بالا دعوے کے ثبوت کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تاریخِ محمّدی ۱۱ شوال ۱۱۶۱ھ کے بعد ختم ہوگئی اور ڈاکٹر ریو نے جو ۱۱۹۰ھ تک اس کے زمانۂ تالیف کو دراز کیا ہے، درست نہیں ہے، کیونکہ ۱۱۶۱ھ کے بعد کے اندراجات مارہرے کے مشہور خاندان برکاتیہ کے بزرگوں نے اپنے قلم سے کئے ہیں۔

مولانا حمدانی مرحوم نے تاریخِ محمّدی میں واقعاتِ تاریخی کا مجمل بیان بھی دیکھا تھا۔ ہمارے نسخے میں بجز دس پانچ مقامات کے صرف وفیات درج ہیں۔ اربابِ تاریخ کی دل چسپی کی خاطر اس کے ایک سال کے اندراجات کا اعادہ مناسب معلوم ہوتا ہے، مگر خوفِ طوالت سے ایسے سنہ کو چنا گیا

ہے جس میں بہت کم اندراجات ہیں:

۱۱۲۳ھ کے ماتحت لکھتا ہے:

"سنۃ الف وثلث وعشرین ومائۃ ۔ متوفیان این سال"

(عمری، رسالۂ سید نصرت اللہ احراری)

"محمد منعم الملقب بمنعم خان ثم بمعظم خان خانخانان بہادر ظفر جنگ وفادار وزیر شاہ عالم بادشاہ روز دوشنبہ ۱۲ یا ۱۱ محرم در نزدیکی لوہریہ بہ مرض ناسور قدیم فوت شد ۔ عمرش شصت سال و چند ماہ ۔ ہفت ہزاری ۔"

(کن ۲ سمعت من اولاده)

"عاقبت محمود مخاطب بسرافراز خان بن نعمت اللہ مخاطب بہ سہراب خان بن حسام الدین خان بن نظام الدین خان بن غیاث الدین علی مخاطب بآصف خان از امرائے عالمگیر شاہی در برہان پور فوت شد"

(عمری)

"میرزا شکر اللہ حسینی مخاطب بہ مرتضیٰ خان از کبار امرائے شاہ عالمی و پسرش حفظ اللہ خان در ۱۱۶۱ھ خواہد آمد"

(عمری)

"الشیخ عبد الباقی بن الشیخ محمد وارث الترک القرلغ الدہلوی جامع العلم والعمل صاحب السجایا الرضیۃ والاخلاق المرضیۃ، مات بدہلی ۱۲ صفر بمرض حجر المثانہ، وکان قد جاوز الخمسین"

نسخۂ رام پور کی کیفیت :

یہ نسخہ فل اسکیپ سائز کے ۱۰۶ اوراق پر مشتمل ہے ۔ کاغذ بادامی کشمیری ہے ۔ عبارت کی روشنائی سیاہ اور عنوانوں کی شنگرفی ہے ۔ پرانے صفحہ داغ سے پتہ چلتا ہے کہ شروع کے ۸ ورق گم ہوگئے ہیں ۔ کتاب پر آب رسیدگی، کرم خوردگی اور پیوند کاری کے نشان جابجا نظر آتے ہیں، خصوصاً پہلے ورق کی کچھ عبارت بھی ضائع ہو چکی ہے ۔ کہیں کہیں مجلد کتابچے حاشیوں کے ساتھ الفاظ بھی تراش ڈالے ہیں ۔ متعدد مقامات پر لکھا ہے "در مسودۂ اول باید دید"، یا "تحقیق باید کرد" متعدد جگہوں پر ایک دو لفظ کے بقدر بیاضیں بھی چھوڑی ہیں ۔ ان باتوں سے مترشح ہے کہ یہ نسخہ خود مصنف کا لکھا ہوا ہے ۔ چونکہ اس کا خط میرزا احمد بن معتمد خاں کے اُن خطوط جیسا ہے جو مختلف کتابوں پر ثبت ہیں، اس لیے مجھے اس کتاب کے بخط مصنف ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے ۔

وفاتِ مصنف :

حارثی کے سالِ وفات کے متعلق ہمیں کچھ معلوم نہیں ۔ کتاب خانۂ رام پور کے ایک مخطوطے پر حارثی نے ۱۱۶۴ھ درج کیا ہے ۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اس سال تک بقید حیات تھا بہرحال جس شخص نے ہزاروں انسانوں کے سنین وفات تحقیق کرکے لکھے، خود اس کا سنہ انتقال معلوم نہ ہونا کتنا عبرت ناک ہے ۔ مگر یہ دنیا کی کوئی نئی رسم نہیں ہے ۔ لاکھوں انسان آج اس زمین کے اندر دبے پڑے ہیں جن کے بارے میں کوئی یہ بتانے والا تک نہیں کہ کون تھے اور کیا تھے ۔ ان میں جلیل القدر عالم بھی ہیں، جہاں کشا بادشاہ بھی اور خدارسیدہ صوفی بھی ۔ مگر روح و مادے کی کوئی طاقت گمنامی کی تاریکی کو دور نہ کر سکی ۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا !

(معارف، اعظم گڑھ، اگست ۱۹۴۲ء)

پروفیسر مختار الدین احمد

عرشی صاحب کی عربی تصانیف

مولانا امتیاز علی عرشی نے تالیف وتصنیف کی ابتدا پنجاب یونیورسٹی کے ایف اے اور بی اے عربی کورس کے اُردو ترجمہ وشرح سے کی۔ یہ کتابیں انھوں نے لاہور کے دورانِ قیام میں لکھی تھیں جب ان کا عنفوان شباب تھا اور ان کی عمر مشکل سے بیس سال ہوگی۔

فارغ التحصیل تو وہ بہت پہلے ہو چکے تھے لیکن ان کا مطالعہ اس وقت وسیع ہوا جب وہ کچھ زمانہ اِدھر اُدھر گزار کر اپنے وطن رام پور آکر متمکن ہو گئے اور اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے انھوں نے اسٹیٹ لائبریری رام پور باضابطہ آنا شروع کیا اور قدیم مطبوعات کے ساتھ اہم مخطوطات سے انھوں نے دلچسپی لینی شروع کی۔ ان کی پہلی کوشش کتاب الاجناس کی تصحیح وترتیب ہے۔

قرآن پاک اور احادیث نبوی کے غریب ونامانوس ومشکل الفاظ کے جمع وتفسیر پر کئی صدیوں تک علمائے اسلام نے بڑا کام کیا ہے۔ بہت سی تصانیف ضائع ہوگئیں، لیکن کچھ دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ گئیں۔ قرآن کے غریب الفاظ پر تو کتابیں نسبتاً کم لکھی گئیں اس لیے کہ یہ فرض مفسرین کرام نے بہت حد تک انجام دے دیا تھا، پھر بھی جو کتابیں اس موضوع پر تصنیف ہوئیں ان میں ابنِ قتیبہ کی مشکلات القرآن قابلِ ذکر ہے۔ ابو عبید الھروی (متوفی سنہ ۴۰۱ھ) کی کتاب الغریبین بہت مشہور ہوئی جس میں قرآن وحدیث دونوں کے مشکل اور غریب الفاظ کی تشریح کی گئی ہے، اس موضوع پر اور کتابیں لکھی گئیں جن کا ذکر ابن الندیم کی الفہرست اور دوسرے مصادر میں ملتا ہے۔

احادیث نبوی کے مشکل وغریب الفاظ کی تشریح کے فن پر سبقت کا سہرا ابوعبید القاسم بن سلّام البغدادی (متوفی ۲۲۴ھ) کے سر ہے جس نے غریب الحدیث کے نام سے ایک کتاب لکھی، پھر ابن قتیبۃ الدینوری (متوفی ۲۷۶ھ) کا نام آتا ہے جس نے ابوعبید کی کتاب پر بطور استدراک اپنے معلومات پیش کیے اور جو الفاظ القاسم بن سلّام سے چھوٹ گئے تھے ان کا اپنی کتاب میں اندراج کیا۔ ان دونوں مصنفین کے بعد ابوسلیمان احمد بن محمد الخطّابی (متوفی ۳۸۸ھ) قابلِ ذکر ہیں جن کی غریب الحدیث کے متعدد اہم نسخے محفوظ ہیں۔ آٹھ دس سال ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کی پی ایچ ڈی کی ایک طالبہ نے متعدد نسخوں کی مدد سے اسے مرتب کیا تھا اور یہ کتاب دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہونے والی تھی۔ اب الاستاذ عبدالکریم ابراہیم العزباوی نے اسے تین ضخیم مجلدات میں جامعۃ ام القریٰ المملکۃ العربیۃ السعودیہ سے ۱۹۸۲ء میں شائع کر دیا ہے۔ ان تین کتابوں کے علاوہ غریب الحدیث کے موضوع پر ابوعبیدہ مَعمَر بن المثنیٰ، الاصمعی، محمد بن مستنیر قطرب، النضر بن شُمیل، ابراہیم بن اسحاق الحربی، ابومعاذ المروزی، شمر بن حمدویہ، الباجدّائی، اور احمد بن الحسن الکندی نے مختصر رسالے لکھے ہیں جن سے بعد کے مصنفین کے استفادے کی شہادت ملتی ہے۔

القاسم بن سلّام کی کتاب الاجناس ان کتابوں میں ہے جن میں لفظ ایک ہیں یا ایک ایسے ہیں لیکن معانی مختلف رکھتے ہیں۔ اشتبہ لفظہ واختلف معناہ کے موضوع پر قدیم عرب لغویوں کی کتابیں ملتی ہیں لیکن القاسم بن سلّام کا شمار قدما میں ہے اس لیے اس مختصر رسالے کے مندرجات کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس کا ایک نسخہ حسن اتفاق سے برادر مرحوم مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو اسٹیٹ لائبریری رام پور (جو اب رضا لائبریری رام پور کے نام سے مشہور ہے) میں مل گیا جس میں ایسے سیکڑوں الفاظ مصنف نے جمع کر دیے ہیں۔

مولانا عرشی نے اس رسالے کو لغت کی امہات کتب اور اسی مصنف کی غریب الحدیث کے رام پور اور قاہرہ کے نسخوں کی مدد سے مرتب کیا۔ انھوں نے آخر میں ان الفاظ کا اضافہ کر دیا جو اس نوعیت کے تھے لیکن کتاب الاجناس میں موجود نہ تھے۔ اگست ۱۹۳۰ء کو اس کی ترتیب کا کام مکمل ہو چکا تھا لیکن ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے اس کی اشاعت ۸ سال کے بعد ۱۹۳۸ء میں عمل میں آئی۔ عرشی صاحب نے بعد کو عربی و فارسی اور اُردو کے متعدد اہم اور نادر متون مرتب

کیے، لیکن پیشِ نظر کتاب کی اہمیت یہ بھی ہے کہ کسی قدیم مخطوطے کو مرتب کرنے کی یہ اگرچہ ان کی پہلی کوشش تھی لیکن بہت کامیاب ہوئی اور اہلِ نظر نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ یہ رسالہ نہایت خوبصورت ٹائپ میں شرف الدین واولادہ کے مطبع قیمہ بمبئی سے شائع ہوا ہے، جس کی ابتدا میں ابن سلّام اور اس کی تصانیف پر مشتمل بہت تفصیلی اور جامع مقدمہ انھوں نے سپردِ قلم کیا ہے۔

تفسیر القرآن الکریم لسفیان الثوری

حضرت سفیان ثوری (متوفی ۱۶۱ھ) کا شمار عالم اسلام کی مشہور شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ وہ تبع تابعین میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تفسیری مرویات الطبری (متوفی ۳۱۰ھ) اور دوسرے قدیم مفسرین اپنی کتابوں میں نقل کرتے آئے ہیں، لیکن آج سے پچیس تیس سال پہلے یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ ان کی گراں قدر تفسیر جو مفقود سمجھی جاتی تھی، امتداد زمانہ سے محفوظ رہ گئی ہے۔ یہ لعل بیش بہا اس وقت کتب خانۂ رضائیہ رام پور کی جوت بڑھا رہا ہے۔ افسوس ہے کہ اس کے کچھ اوراق ضائع ہو گئے ہیں اور یہ نسخہ مکمل نہیں۔ اس میں صرف سورۂ بقرہ سے سورۂ طور کی آیات کی تفسیر ہے لیکن اس میں بھی سورۂ رعد اور سورۂ دخان والے اوراق نسخے سے ساقط ہیں۔ اس کی دریافت اور تعارف کا سہرا مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے سر ہے جنھوں نے اس پر ایک مقالہ "امام سفیان ثوری کے سوانح حیات اور ان کی تصنیفات" کے عنوان سے رسالہ معارف اعظم گڑھ کے اگست اور ستمبر ۱۹۳۵ء کے دو شماروں میں شائع کیا۔ پھر انھوں نے عربی میں ایک مضمون: "الامام الثوری وکتابہ فی التفسیر" دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک جلسے میں ۱۹۳۹ء میں پڑھا، جو دائرے کے شائع کردہ مجموعہ مقالات میں چھپ کر شائع ہوا۔ اس سے اس تفسیر کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی۔ عرشی صاحب نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ برسوں کی محنت شاقہ کے بعد اس کا نہایت اعلیٰ تنقیدی علمی اڈیشن، وزارت تعلیمات حکومت ہند کے تعاون سے ہندوستان پرنٹنگ ورکس رام پور سے ۱۹۶۵ء میں شائع کر دیا۔

عرشی صاحب نے متن کی تصحیح و تعلیق کا حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں دو [illegible] زائد قدیم عربی مصادر استعمال کیے ہیں۔ ابتدا میں ایک تفصیلی مقدمہ ہے (ص ا

تا ص ۴۰)، پھر تفسیر کا متن درج کیا ہے (ص ۴۱ تا ص ۲۴۴)، پھر ص ۲۴۵ سے ص ۳۴۳ تک ۲۹۹ رجال ثوری کے حالات پر جامع نوٹ نہایت محنت اور دیدہ ریزی سے لکھے ہیں۔ پھر ۱۸ صفحوں میں استدراک درج ہیں اس کے بعد فہرست مصادر ہے جس میں ۲۰۵ کتابوں کا ذکر ہے۔ آخر میں ص ۳۶۷ سے ص ۴۸۵ تک اشخاص، قبائل و اقوام، اماکن و بلاد، کتب والسنہ کی فہرستیں درج ہیں۔

مقدمے کی زبان اس قدر خوبصورت لکھی ہے کہ شرق اوسط کے مشہور عالم علام محمد بہجۃ البیطار کو لکھنا پڑا: والحق أقول إني لم أر كتابا أشوق ياً أوسع استيعابا وأكثر إتقاناً من هذا الكتاب۔ وتعليقات الأستاذ المصحح ليس عيها أثر للعجمة، بل هي مثل رائع في فصاحتها۔ مشرق ہی نہیں یورپ میں بھی اس کتاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ مشہور مستشرق منٹگمری وارٹ نے بھی اپنے تبصرے میں عرشی صاحب کی اس علمی کوشش کو بہت سراہا اور کھلے دل سے متن کی اعلا تصحیح اور علمی تعلیقات کی اہمیت کا اعتراف کیا۔

مولانا عرشی عربی کی قدیم نثری تصانیف ہی کی طرف متوجہ نہیں رہے، انھوں نے قدیم عربی شعرا کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول رکھی۔

الأمثال السائرة من شعر المتنبي۔

متنبی کے بہت سے شعر اور مصرعے ضرب المثل کے طور پر مشہور ہو گئے ہیں۔ غالباً علامہ سید مرتضیٰ بلگرامی کا اس موضوع پر ایک رسالہ الاستاذ محمد عبدالسلام ہارون مرحوم نے اپنے مجموعے نوادر المخطوطات میں قاہرہ سے شائع کیا ہے۔ اس میں ایسے مصرعے متنبی کے جمع کیے گئے ہیں جو ضرب المثل کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ عرشی صاحب کی نظر انتخاب چوتھی صدی ہجری کے کافی الکفاۃ الصاحب اسماعیل بن عباد الطالقانی (متوفی ۳۸۵ھ) وزیر فخر الدولہ دیلمی (متوفی ۳۸۷ھ) کے رسالے کے ایک قلمی نسخے پر پڑی جس میں متنبی کے وہ اشعار جمع کر دیے ہیں جو ضرب المثل کے طور پر شہرت رکھتے ہیں۔ عرشی صاحب ہمیشہ کوشاں رہتے تھے کہ وہ اپنے موضوع کے ساتھ پورا انصاف کریں، اس لیے انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق اس رسالے کی ترتیب و تعلیق کے وقت مختلف ادبی مصادر کی طرف رجوع کیا اور الجرجانی (متوفی ۳۹۲ھ) کی کتاب الوساطة بين المتنبي وخصومه، الثعالبی (متوفی ۴۲۹ھ) کی يتيمة الدهر في محاسن أهل العصر، العکبری (متوفی ۶۱۶ھ) کی شرح دیوان المتنبی اور ابن حجۃ الحموی

(۸۳۷ھ) کی خزانة الأدب وغاية الأرب بھی پیش نظر رکھی اور الصاحب بن عباد کے پیش کیے ہوئے اشعار میں اِن مصادر سے اضافے بھی کیے۔

یہ رسالہ، حکومتِ ہند کے مجلۂ ثقافۃ الھند (دہلی) کے ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۴ء کے چار شماروں میں شائع ہوا اس کے مجموعی صفحات ۸۵ ہیں۔

ديوان الحادرة

قطبہ بن اوس الفزاری ممتاز جاہلی شعرا میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا دیوان بہت عرصہ پہلے ۱۸۵۸ء میں ایک جرمن مستشرق انگلمان نے لائیڈن سے شائع کیا تھا، لیکن اس کا متن اسقام سے پاک نہ تھا۔ مولانا عرشی نے یہ دیوان ان تین نسخوں کی مدد سے مرتب کیا جو قاہرہ، لندن اور رام پور میں محفوظ تھے۔

انھوں نے ایک مفید کام یہ بھی کیا کہ الحادرہ کے جو اشعار دوسرے مصادر میں انھیں ملے اور جو دیوان کے کسی قلمی نسخے اور انگلمان کے اڈیشن میں نہ تھے انھیں بھی تلاش کر کے اپنے مرتب کردہ دیوان میں جمع کر دیے۔ یہ دیوان پروفیسر آصف بن علی اصغر فیضی کی توجہ سے رائل ایشاٹک سوسائٹی بمبئی کے جرنل میں ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا۔

دیوان الحادرہ کا نیا اڈیشن عربی زبان کے مشہور محقق ڈاکٹر ناصر الدین الاسد وزیر تعلیم حکومت اردن نے شائع کیا ہے، ان کے پیش نظر چند نئے دریافت شدہ قلمی نسخوں کے علاوہ عرشی مرحوم کا مرتب کردہ اڈیشن بھی رہا ہے۔

ديوان أبي محجن الثقفي

عمرو بن حبیب ابو محجن الثقفی (متوفی ۳۰ھ) کا شمار صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ صحابہ کے حالات میں جو کتابیں الإصابة في تمييز الصحابة اور الاستيعاب في معرفة الأصحاب وغیرہ لکھی گئی ہیں ان میں ان کے اشعار ملتے ہیں۔ اس کا دیوان ابو ہلال العسکری (متوفی ۳۹۵ھ تقریباً) کو ملا تھا اور اس نے اس کی شرح بھی لکھی تھی۔ العسکری کی روایت و شرح کا ایک نسخہ مستشرق لینڈبرگ کے مطالعے میں آیا، اس نے اسے مرتب کر کے لائیڈن سے ۱۸۸۹ء میں شائع کیا تھا، مولانا عرشی کے پیش نظر مطبوعہ دیوان کے علاوہ اس نسخے کا عکس بھی رہا ہے جسے علامہ محمد محمود بن احمد الترکزی الشنقیطی (متوفی ۱۹۰۴ء) جیسے متبحر عالم نے اپنے ہاتھ سے اس نادر نسخے سے نقل کیا تھا جو عہد عباسی کے مشہور خطاط یاقوت المستعصمی (متوفی ۶۸۹ھ) کے

قلم کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے۔ عرشی مرحوم نے دوسرے مصادر سے اس قدیم شاعر کے وہ اشعار بھی جمع کر دیے جو دیوان سے، قاضی عبدالودود صاحب مرحوم کے لفظوں میں "غیر حاضر" تھے۔

دیوان ابی محجن مجلّہ ثقافۃ الهند (دہلی) کے ایک شمارے میں ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔

عہد جاہلی اور عہد اسلامی کے ان دو شاعروں کے دواوین کے ساتھ ساتھ انھوں نے دو ہندوستانی شاعروں کے عربی قصیدے بھی مرتب کر کے شائع کیے۔

قصیدہ لامیۃ الهند

الطغرائی (متوفی ۵۱۵ھ) کا لامیۃ العجم، جاہلی شاعر الشنفری الازدی کے لامیۃ العرب کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ آٹھویں صدی ہجری کے ہندوستانی عالم و شاعر قاضی عبدالمقتدر الشریحی الکندی الدہلوی (متوفی ۷۹۱ھ) نے ان دونوں قصیدوں لامیۃ العرب اور لامیۃ العجم کو سامنے رکھ رکھ کر لامیۃ الهند لکھا۔ اس کے اشعار سبحۃ المرجان فی آثار ہندستان مؤلفہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) میں اور دوسرے مصادر میں ملتے ہیں۔ عرشی مرحوم نے ان اشعار کو قصیدے کی شکل دے کر مجلۂ ثقافۃ الهند (دہلی) میں ۱۹۵۰ء میں شائع کیا ہے۔ انھوں نے متن کے اندراج سے پہلے قاضی صاحب کے مختصر سوانح حیات لکھے ہیں، پھر اس قصیدے کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

قصیدۃ الدالیہ

شیخ احمد بن محمد التھانیسری (متوفی ۸۲۰ھ) کے لکھے ہوئے اس قصیدے کے اشعار علامہ غلام علی آزاد بلگرامی (متوفی ۱۲۰۰ھ) کی تصانیف سبحۃ المرجان اور تسلیۃ الفؤاد میں نقل ہوئے ہیں اور انھیں دو کتابوں سے مولانا سید عبدالحی حسنی (متوفی ۱۳۴۱ھ) نے اپنی کتاب نزہۃ الخواطر کی جلد ششم میں نقل کیے ہیں لیکن ان تینوں مصادر میں سے کسی میں بھی علامہ التھانیسری کا مکمل قصیدہ نقل نہیں ہوا ہے۔ عرشی صاحب نے قصیدے کے جتنے شعر مل سکے ہیں سبھوں کو مناسب ترتیب سے ایک جگہ جمع کر کے قصیدہ مکمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابتدا میں حسب معمول تھانیسری کے حالات و کوائف لکھے ہیں پھر قصیدے پر گفتگو کی ہے۔

یہ قصیدہ بھی مجلۂ ثقافۃ الهند میں ۱۹۵۲ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عرشی صاحب کی ان تصانیف کا ضرور ذکر کر دیا جائے جو یا تو کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکیں، یا پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکیں اور مصنف مرحوم آخر عمر تک ان کی تہذیب و تکمیل میں مصروف رہے۔

تسہیل المیزان

یہ ملا محب اللہ بہاری (متوفی ۱۱۱۹ھ) کی فن منطق میں مشہور تصنیف سلّم العلوم کا اختصار ہے۔ عرشی صاحب نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس کی شرح لکھی تھی اور اپنے تعلیقات درج کیے تھے۔ یہ خود نوشت نسخہ اب کتب خانہ رضایہ میں محفوظ ہے۔ سال کتابت ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۳۲ء ہے، غالباً یہی سال تصنیف بھی ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ عربی میں عرشی صاحب کی پہلی تصنیف ہے۔

شواهد القرآن

محمد ابن جریر الطبری (متوفی ۳۱۰ھ) کی تفسیر الجامع البیان عرشی صاحب کی پسندیدہ کتابوں میں ہے اس میں شواہد میں کثرت سے اشعار درج ہیں، جاہلی شعرا کے بھی اور ان شعرا کے بھی جو اسلامی عہد میں مشہور ہوئے۔ اس میں کچھ ایسے اشعار بھی ہیں جو شعرا کے مروج دیوان میں نہیں ملتے، اور اس میں ایسے شعرا کے کلام سے بھی الطبری نے استشہاد کیا ہے جن کے اشعار بہت کم ملتے ہیں۔ اس میں ایسے شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جو غیر معروف ہیں۔ ان مختلف حیثیتوں کی وجہ سے تفسیر الطبری میں درج ابیات میں ایسے شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جو غیر معروف ہیں۔ ان مختلف حیثیتوں کی وجہ سے تفسیر الطبری میں درج ابیات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

عرشی صاحب نے ان ابیات کو مناسب ترتیب سے جمع کیا ہے، پھر اہم اور قدیم مصادر سے ان کی تخریج کی ہے۔ جن ابیات کے قائل معلوم نہیں انھوں نے ان کے نام معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کوئی بیت، ایک سے زیادہ شاعر کی طرف منسوب ہے تو انھوں نے اس امر کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ یہ سارا مواد سات دفاتر میں آیا ہے۔ اس کے جمع و تخریج میں عرصے تک وہ مشغول رہے۔ اس پر انھوں نے بہت محنت کی ہے اور اس کا ذکر متعدد بار ان سے سننے کا اتفاق ہوا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ کلکتے میں مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی بھی عرصے تک الطبری کے شواہد

شعری کی ترتیب وتخریج میں مشغول رہے یعنی ہمارے عہد کے دو فضلا خاصے عرصے تک ایک ہی کام میں مصروف رہے ایک رام پور میں دوسرے کلکتے میں، اور دونوں ایک دوسرے کی کوشش سے لاعلم رہے۔

جب میں نے ایک بار عرشی صاحب کو معصومی صاحب کے منصوبے سے مطلع کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے ہم دونوں کا کام ایسا ہے جس سے ایک دوسرے کے کام کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

کاش ہم دونوں مل کر اس کام کو مکمل کر سکیں۔ یہ صحیح اور توانا علمی جذبہ جس سے عرشی صاحب متصف تھے، افسوس ہے اس کا اب روز بروز فقدان ہوتا جا رہا ہے [1]

دیوان شعر النمر بن تولب العکلی

النمر بن تولب رضی اللہ عنہ مشہور صحابی رسول ہیں۔ ان کی وفات ۱۴ھ کے لگ بھگ ہوئی ہے۔ یہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ عرشی صاحب نے مختلف مصادر سے ان کے اشعار تلاش کر کے ان کا دیوان مرتب کر دیا تھا، مجھ سے وہ کہتے تھے کہ کام تقریباً مکمل ہو گیا ہے، معلوم نہیں کیوں شائع نہ ہو سکا، شاید ان کے خیال میں ایک آنچ کی کسر باقی رہ گئی ہو۔

کتاب المقصور والممدود

مشہور نحوی ابو بکر زکریا یحییٰ بن زیاد المفرار (متوفی ۲۰۷ھ) کی یہ تصنیف ان کلمات کی تشریح پر مشتمل ہے جو الف مقصورہ والف ممدودہ پر منتہی ہوتے ہیں ترکی کے کتب خانے کے ایک نسخے کی نقل عرشی صاحب کے پاس تھی، اس کتاب کا دوسرا نسخہ خود رام پور میں محفوظ تھا، انھوں نے ان دونوں نسخوں کی بنیاد پر اپنا متن متعین کیا، اس پر حواشی لکھے۔

---

[1] تفسیر طبری قاہرہ سے ۳۰ جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔ اب اس کے نسخے بازار میں نہیں ملتے۔ اس کی کم یابی اور اہمیت کی بنا پر اس کا دوسرا اڈیشن الاستاذ محمود محمد شاکر نے قاہرہ سے (۱۹۴۶-۱۹۷۱ء) شائع کیا ہے۔ یہ بہت مستند اور علمی اڈیشن ہے۔ عرشی مرحوم اور معصومی صاحب نے تخریج اشعار کی بنیاد قدیم مصری اڈیشن پر رکھی تھی۔ ممکن ہے کہ طبع جدید کی کچھ ابتدائی جلدیں بھی ان کے پیش نظر ہوں۔ اس اڈیشن کے بعد اب اشعار کی تخریج وتحلیق وتصحیح کا کام آسان ہو گیا ہے۔

الاستاذ عبد العزیز المیمنی کچھ عرصہ پہلے اسے مرتب کر کے طباعت کے لیے قاہرہ بھیج چکے تھے وہاں دفتری کارروائیوں میں اشاعت کا مسئلہ الجھا رہا آخر دس بارہ سال کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی۔

عرشی صاحب کو اس کی اطلاع نہ تھی کہ ان کے استاد المقصور والممدود کی تصحیح وتعلیق میں مصروف ہیں ورنہ وہ یہ کام شروع نہ کرتے، جب انھیں اس کی اطلاع ہوئی تو استاد کے احترام میں اس کام کی تکمیل اور اس کی اشاعت انھوں نے پسند نہیں کی۔

دیوان جریر بن عطیۃ الخطفی

جہاں تک مجھے علم ہے دیوان جریر کا کوئی قابل ذکر قلمی نسخہ رام پور میں موجود نہیں۔ عرشی صاحب بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے وہ اشعار جمع کر رہے ہوں گے جو دیوان میں نہیں ملتے۔ دیوان جریر کا ایک پرانا غیر علمی اڈیشن عرصہ ہوا مصر سے اشاعت پذیر ہوا تھا، پھر الاستاذ عبد اللہ الصاوی نے اس کا دیوان شائع کیا تھا اور اہل علم اسی سے استفادہ کرتے ہیں۔ بیروت سے اس کے ایک دو ایڈیشن نکلے ہیں لیکن یہ تجارتی اڈیشن ہیں۔ اس کے ایک علمی انتقادی اڈیشن کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔

کتاب النوادر لابن الاعرابی

ابن الاعرابی (متوفی ۲۳۱ھ) کی یہ بہت اہم تصنیف ہے، معلوم نہ ہو سکا اس کی تصحیح و تعلیق کا کام کہاں تک عرشی صاحب نے کیا، یاد آتا ہے کہ کچھ سال پہلے یہ کتاب شائع ہو گئی ہے۔

کتاب الرعایۃ لتجوید القراءۃ وتحقیق لفظ التلاوۃ

محمد مکی ابن ابی طالب (متوفی ۴۳۷ھ) کی قرأت و تلاوت کے مسائل پر مفید کتاب ہے یہ کتاب شاید اب تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ عرشی صاحب کا کام اگر مکمل ہو تو اسے شائع کرا دینا چاہیے۔

عرشی صاحب کو نشوان بن سعید الحمیری (متوفی ۵۷۳ھ) سے خاص دلچسپی رہی ہے انھوں نے اس کی حسب ذیل کتابیں مرتب کی ہیں:

المختصر فی صحیح الاعتقاد وصریح الانتقاد

رسالۃ فی اختلاف الملل فی الالوہیۃ والامامۃ

مختصر میزان الشعر ونبشت النظام

مشکل الروی وصی السوی

نذرِ عرشی میں نشوان کی ان کتابوں کا ذکر نہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرشی صاحب کو یہ کتابیں عرشی صاحب کے مسودات میں بعد کو ملیں۔

ان کتابوں کے علاوہ مولانا عرشی نے عربی اور اسلامیات کے موضوعات پر خاصی تعداد میں مضامین لکھے ہیں۔ کچھ تو "مقالاتِ عرشی" شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور میں شائع ہو گئے ہیں، لیکن ان کے بہت سے مضامین رسالہ "معارف" مجلّہ علوم اسلامیہ، فکر و نظر، برہان اور دوسرے علمی مجلات میں بکھرے پڑے ہیں۔ یہ ایک مفید علمی خدمت ہوگی اگر ان کو جمع کرکے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔

پروفیسر گیان چند جین

"بیاضِ غالب، تحقیقی جائزہ" کا تحقیقی جائزہ

۱۹۶۹ء میں دریافت شدہ مخطوطۂ دیوانِ غالب کو عام طور سے بخطِ غالب تسلیم کیا گیا۔ صرف ڈاکٹر انصار اللہ نظر، ڈاکٹر سید حامد حسین اور ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے اسے بخطِ غیر ٹھہرایا۔ ڈاکٹر انصار اللہ نظر، اور اس کے مندرجات کو کلامِ غالب ہی تسلیم کرتے ہیں لیکن کمال احمد صدیقی صاحب اپنے دعوے میں منفرد ہیں کہ اس مخطوطے میں جو مزید کلام ہے اور بعد کے نسخوں سے جو جو اختلافاتِ نسخ ہیں وہ زمانۂ حال میں کسی جعل ساز نے گڑھ دیے ہیں۔ کمال احمد صاحب نے کتاب کا پہلا نسخہ شمیم احمد صاحب شمیم ایم پی کو پیش کیا اور شمیم صاحب نے کمالِ لطف سے مجھے اس جلد کے بالاستیعاب مطالعے کا موقع دیا۔

اس کتاب میں نسخۂ عرشی کے سائز کے ۲۲۴ صفحات ہیں۔ اطلاع ہے کہ اشاعتی جلدوں میں مخطوطۂ دیوان کا فوٹوسٹیٹ بھی شامل ہوگا۔ کتاب کا ناشر ادارۂ مطالعات غالب، پرتاپ پارک، ریزیڈنس روڈ سری نگر ہے۔ اندرونی سرورق پر ایک سطر میں یہ درج ہے۔

پہلا ایڈیشن : ایک سو۔ قیمت : ۵۰۰ روپے

نسخۂ عرشی زادہ کی تین سو روپے قیمت پر بھی اعتراض کیا گیا تھا لیکن اس کے

نرخِ بالا کی کچھ وجوہ تھیں۔ ۱۔ یہ غالبؔ کے اس پہلے دیوان کا عکس پیش کرتا تھا جو مرتب اور دیگر ماہرین کی رائے میں بخطِ غالبؔ تھا۔ ۲۔ اس نسخے کو پہلی بار شائع کیا جا رہا تھا۔ ۳۔ کتاب کا کاغذ، کتابت اور طباعت اعلیٰ سے اعلیٰ تھیں۔

'تحقیقی جائزہ' ان سب اوصاف سے عاری ہے کیونکہ

(۱) مصنف کی رائے میں یہ مخطوط غالبؔ کا کلام پیش نہیں کرتا بلکہ کسی کم سواد کی جعل سازی کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ کاسد کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

(۲) اس کتاب میں نو دریافت نسخہ تیسری بار پیش کیا جا رہا ہے۔ نقوش کی بدولت یہ پہلے ہی گھر گھر پہنچ چکا ہے۔

(۳) کتاب کا کاغذ اخباری کاغذ کی طرح زردی مائل اور کھردرا سا ہے۔ طباعت اچھی نہیں۔ جگہ جگہ الفاظ مٹے ہوئے ہیں۔

کتاب کے شروع میں غالبؔ کی لال قلعے والی رنگین تصویر ہے اور اس کے بعد پانچ صفحات پر غالبؔ کے قلم کی مختلف تحریروں کے عکس ہیں۔ تمہید کے طور پر کوئی فہرست یا دیباچہ نہیں۔ صفحہ ۹ سے یکایک متن شروع ہو جاتا ہے۔ ابواب کی تقسیم نہیں۔ پوری کتاب ایک سلسلے میں لکھ دی گئی ہے۔ ابھی تک کمال صاحب محض شاعر کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اس کتاب میں پہلی بار محقق کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کا انداز سکہ بند تحقیقی نوعیت کا نہیں مثلاً کسی موضوع پر وہ کوئی اقتباس دیتے ہیں تو جلی عنوان قائم کرتے ہیں۔

"اقتباس شروع" (مثلاً ص ۱۹۲ پر) اور بعد میں لکھتے ہیں "اقتباس ختم"۔ پر پس نوشت کے عنوان سے کچھ لکھتے ہیں۔ پس نوشت خطوں میں ہوتی ہے۔ کتاب میں عموماً استدراک کے عنوان سے اضافہ کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ کتاب کے آخر میں ہونا چاہیے درمیان میں 'پس نوشت' کے عنوان کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ مصنف محمد حسین آزاد کی طرح ہر دوسرے تیسرے صفحے پر اپنی ذات کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔ 'حقیر کمال یہ عرض کرتا ہے'، 'یہ حقیر عرض کرتا ہے'، 'یہ کم سواد عرض کرتا ہے'،

متن کے ابتدائی آٹھ صفحات میں مصنف نے کتاب کے مرکزی موضوع کا نام بھی نہیں لیا بلکہ مالک رام کے مرتبہ دیوانِ غالبؔ کے املے کی غلطیوں یا حذفِ اضافت وغیرہ کی تفصیل دی ہے جس میں خاص شکوہ یہ ہے کہ مالک رام صاحب نے اُن موقعوں پر 'یہاں' 'وہاں' چھاپا ہے جہاں شعر کا وزن 'یہاں' 'وہاں' کا متقاضی تھا۔ شکوہ بجا ہے۔

اطلاع دیتے ہیں کہ چونکہ عرشی صاحب اور مالک رام صاحب کے مرتبہ نسخے غلطیوں سے خالی نہیں اس لیے انھوں نے غالبؔ کا دیوان یوں مرتب کرنا شروع کیا کہ اس میں کوئی غلطی جگہ نہ پائے لیکن تقریباً پچیس شعروں کے صحیح متن کے بارے میں شبہ رہا۔ مصنف نے یہ صراحت نہیں کی کہ ان شعروں کے جو متبادل متون درج کیے ہیں۔ وہ کہاں سے لیے ہیں۔ غالباً یہ اختلافاتِ نسخ مصنف کے شکوک ہی کی تخلیق ہیں کیونکہ ان میں سے بیشتر مستند ایڈیشن میں دیکھنے میں نہیں آئے۔ جنابِ مصنف نے کتاب کے متن میں بارہا غالبؔ کے متن کو غلط فرض کرکے اس پر قیاسی اصلاح دی ہے۔ اندیشہ ہے کہ ان کا مرتبہ دیوان اسی قسم کی تصحیحات یا اصلاحات سے پُر نہ ہو۔

متداول دیوان کے متن میں اپنے شکوک قلم بند کرنے کے بعد وہ نو دریافت نسخے کی غزلوں کے اشعار کو ایک ایک کرکے لکھتے ہیں اور ان پر اپنے شبہات و اعتراضات رقم کرتے جاتے ہیں۔ غزل تقریباً ہر ایک لے لی ہے لیکن اس کے تمام اشعار پر تبصرہ نہیں کرتے۔ اس طرح دیوان کے آخر تک پہنچ جاتے ہیں اور وہیں کتاب مکمل ہو جاتی ہے۔ میری رائے میں کتاب کی بہتر ترتیب یہ ہوتی کہ وہ خاص اعتراضات کو عنوان قائم کرکے درج کرتے اور ہر اعتراض کے تحت تمام تائیدی مثالیں لکھ دیتے۔ اس گروہ بندی سے قاری کو بآسانی اندازہ ہو جاتا کہ فاضل مصنف کن کن وجوہ سے نسخے کو جعلی قرار دیتے ہیں۔ بہ صورتِ موجودہ قاری کو پوری کتاب کھنگال کر ہی مصنف کی شکایات کا اندازہ ہوتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں بعض مخففات درج کرتا ہوں، جو اس مضمون میں استعمال کیے جائیں گے۔ ان میں سے پہلے دو کمال صاحب کے وضع کردہ ہیں اور بعد کے دو عرشی

صاحب کے ۔

الف (نسخۂ امروہہ) بیاضِ غالب ۔ نقوش اکتوبر ۱۹۶۹ء
عین نسخۂ عرشی زادہ
ق نسخۂ بھوپال جو نسخۂ حمیدیہ کی اصل ہے ۔
تا نسخۂ شیرانی
خ خودنوشت مخطوطۂ دیوانِ غالب
جائزہ کمال احمد صدیقی کی زیرِ بحث کتاب
مصنّف کمال احمد صدیقی

مصنّف نے جا بجا طنز سے کام لیا ہے لیکن بعض اوقات یہ طعن و تشنیع بن کر رہ جاتا ہے ۔ بات یہ ہے کہ وہ صدقِ دل سے مخطوطے کو جعلی مانتے ہیں اس لیے بار بار اس کی خامیاں دیکھ کر جھلّا جاتے ہیں اور شدّتِ جذبات میں دوسروں کو سخت سست کہہ جاتے ہیں ۔ انھیں شبہ سب سے زیادہ عرشی زادہ پر ہے لیکن طنز سب سے زیادہ نثار احمد فاروقی کا مقسوم ہے ۔ نثار صاحب نے مقدّمہ الف میں لکھا ہے کہ تذکرہ عمدۂ منتخبہ شائع شدہ دلّی یونیورسٹی میں غالب کا ایک مصرع یوں درج ہے ۔

ع جگر سے ٹوٹے ہوئے موکی ہے سناں پیدا

کہتے ہیں " میں نے مطبوعہ تذکرہ سرور کے نسخے پر غلطیوں کی نشاں دہی کرتے ہوئے اس کی قیاسی تصحیح یوں کی تھی ۔

جگر سے ٹوٹی ہوئی ہوگئی سناں پیدا

اب یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ نسخۂ امروہہ کا متن میرے قیاس کی پوری تائید کر رہا ہے[1] ۔ حقیقت یہ ہے کہ دلّی یونیورسٹی کے مرتبہ عمدۂ منتخبہ میں مصرع کی آخرالذکر شکل ہی ہے اس پر کمال صاحب یوں برس پڑتے ہیں : ۔

[1] نقوش اکتوبر ۱۹۶۹ء مقدمہ ص ۲۵

" اس چھوٹی سی بات سے نثار احمد فاروقی صاحب کی محققانہ صلاحیتوں ان کی نیت اور ان کی دیانت کے بارے میں مناسب نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے ۔ جو اتنی چھوٹی سی بات میں اور معمولی سی بات میں اتنی بڑی غلط بیانی کرسکتا ہے وہ ایک مجہول نسخے کو بخطِ غالب ثابت کرنے کے لیے کیا کچھ گواہی نہیں دے سکتا ۔ ان کی کوئی بات درخورِ اعتنا نہیں ہوسکتی "
(ص ۱۹۷ ۔)

ص ۳۸۸ اور ۳۹۶ پر الف کے فاضل مرتب کی ظاہرا معصومیت کا ذکر کیا ہے ۔ مراد یہ ہے کہ بیاضِ غالب کی تصریحات لکھتے وقت انھیں معلوم تھا کہ مخطوطے کا متن بعد والے نسخۂ شیرانی کا ہے لیکن اسے چھپا گئے ۔ مرتبِ الف نے تصریحات سے لکھتے وقت بعض اشعار کو نہ معلوم کس طرح نودریافت قرار دے دیا اس پر مصنّف چٹکیاں لیتے ہیں ۔ اشعار یہ ہیں :

لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

"مقطع وہی ہے جو متداول دیوان میں ہے لیکن الف میں تصریحات کے بہ انکشاف کیا گیا ہے کہ دیوان کے کسی نسخے میں نہیں ملتا "
جائزہ ص ۳۷۹

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت کشتۂ لعلِ جہاں کی خواب سنگیں ہے

یہ شعر ق اور تا بلکہ متداول دیوان میں بھی ہے لیکن مرتبِ الف نے سہواً تصریحات میں لکھ دیا " حمیدیہ اور شیرانی میں یہ شعر نہیں ہے " ۔ اس پر چٹکی لیتے ہیں ۔
" ظاہر ہے نثار احمد فاروقی نے حمیدیہ اور شیرانی کا صرف نام سنا ہے "
(جائزہ ص ۴۰۰)

ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

"الف کے فاضل مرتب نے اس شعر کو نو دریافت قرار دیا ہے"۔

یہ تینوں شعر متداول دیوان کے ہیں۔ کم از کم آخری تو اتنا مشہور ہے کہ مرتب الف کو جاننا چاہیے تھا۔ ان تینوں اشعار کی زمین کے کچھ اشعار نسخۂ عرشی میں غیر متداول حصّے گنجینۂ معنی میں درج ہیں کچھ متداول حصّے نوائے سروش میں۔ مرتبِ الف نے غالبؔ اوراق کو دیکھے بغیر صرف گنجینۂ معنی کو دیکھا۔ وہ یہ قیاس نہ کرسکے کہ مندرجہ بالا اشعار متداول ہوسکتے ہیں اس لیے انھوں نے گنجینۂ معنی کی بنیاد پر لکھ دیا کہ یہ اشعار کسی نسخے میں نہیں ملتے۔

آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں ایک نسخے پر غالب کا خط بہ نام محمد حسین خاں غالب کی تحریر میں درج ہے۔ نسخۂ عرشی اور دیوانِ غالب مرتبۂ مالک رام کے دیباچوں میں اس کا اقتباس ہے لیکن اصل سے کہیں کچھ کمی بیشی ہوگئی ہے۔ مصنّف نے جائزہ ص ۵ پر اس خط کا عکس دیا ہے اور نیچے نوٹ لکھتے ہیں :۔

"جناب امتیاز علی خاں عرشی اور جناب مالک رام دونوں نے غالب کی تحریر دیکھے بغیر مجہول ماخذوں سے عبارت نقل کروادی اور حوالا اصل نسخے کا دے دیا"۔

مالک رام صاحب نے ضرور اصل کا حوالہ دیا ہے لیکن عرشی صاحب نے غلام رسول مہر کی کتاب غالب کے حوالے سے لکھا ہے اس لیے ان پر الزام عائد نہیں ہوتا۔ مہر کی کتاب مجہول ماخذ بھی نہیں۔

مالک رام کے دیوانِ غالب میں ص ۱۰۵ پر شعر ہے۔

غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ
ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیٔ شمع

اور فٹ نوٹ میں ہے۔ "ش پروانے"

یعنی نسخۂ شونراین میں 'حسرتِ پروانے' ہے۔ اس پر کمال صاحب بگڑ کر لکھتے ہیں :۔

"فٹ نوٹ لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ فٹ نوٹ اختلافِ نسخ دکھانے کے لیے ہے غلطیاں دکھانے کے لیے نہیں۔ حسرتِ پروانہ کو حسرتِ پروانے میں نہیں لکھا جاسکتا۔ اس لیے یہ فٹ نوٹ گمراہ کن ہے۔ ایسا فٹ نوٹ کسی غالب شناس کے شایانِ شان بھی نہیں"۔ (ص ۱۳)

مجھے اس اصول سے اتفاق نہیں کہ فٹ نوٹ صرف اختلافِ نسخ دکھانے کے لیے ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اختلافِ نسخ میں کچھ نسخے صحیح ہوتے تو کچھ غلطِ محض بھی ہوسکتے ہیں۔ غلط متن سے چشم پوشی کرکے نہیں گزرا جاسکتا۔ اگر اسے اختلافِ نسخ میں نہ دکھایا جائے تو کہاں دکھایا جائے۔

مالک رام صاحب کے بارے میں یہ ارشادات بھی ہیں۔

"شاید موصوف کو غالب کی تحریریں توجّہ سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا"۔ ص ۶۹

"یہ بات شک وشبہ سے بالاتر نہیں ہے کہ جناب مالک رام غالبؔ کے طرزِ تحریر یا ان کے اندازِ قلم سے واقف ہیں"۔

اس قسم کے تحقیقی کام میں ضروری تھا کہ مصنّف کلامِ غالب کے تمام اہم ایڈیشنوں کو پیشِ نظر رکھتے لیکن ان کے سامنے ذیل کے مجموعے نہ تھے۔ جو 'جائزہ' کی اشاعت سے کافی پہلے بازار میں آچکے تھے۔

نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ مفتی انوار الحق۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ حمید احمد خاں۔ نسخۂ شیرانی مطبوعۂ لاہور۔ گلِ رعنا مرتبۂ مالک رام۔

اس لیے جب وہ نسخۂ حمیدیہ جیسی عام کتاب کے متن کے بارے میں تذبذب میں مبتلا نظر آتے ہیں تو رحم آتا ہے مثلاً

"نسخۂ عرشی میں قافیہ 'زنداں' چھپا ہے لیکن غلط نامے میں اس کو 'زنداں' پڑھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اختلافِ نسخ کے باب میں 'زنداں'، نسخۂ شیرانی کی قراءت دکھائی گئی ہے۔ یا تو غلط نامہ غلط ہے یا اختلافِ نسخ کے تحت اندراجِ غلط ہے

کیونکہ ان دونوں کی وجہ سے پوزیشن واضح نہیں ہوتی کہ 'زنداں' غلط ہے یا نسخۂ بھوپال کا قافیہ"۔ (ص ۳۵۵)

جمّوں میں یہ سب نسخے موجود ہیں۔ اس تذبذب بیان سے بہتر تھا کہ مجھے لکھ کر پوچھ لیتے۔ میں بتا دیتا کہ ق میں 'زنداں' ہے اور قا میں 'رنداں'

ایک اور قابلِ رحم مثال دیکھیے۔

ص ۳۵۲ پر خ کا مصرع "وصل ہر رنگ تپش کسوتِ رسوائی ہے'' دے کر لکھتے ہیں کہ نسخۂ عرشی کے اختلافِ نسخ کے مطابق نسخۂ بھوپال میں مصرع یہ ہے۔

وصل رنگِ تپش کسوت رسوائی ہے

یہ اظہار بھی کیا گیا ہے کہ نسخۂ شیرانی میں مصرع یوں ہے۔

وصل ہر رنگ تپشِ کسوت رسوائی ہے

..... یہاں پر جو بات توجہ چاہتی ہے وہ یہ ہے کہ "مخطوطے" میں مصرع نسخۂ بھوپال سے نہیں نسخۂ شیرانی سے مطابقت رکھتا ہے۔"

مصنف نسخۂ عرشی کے اختلافِ نسخ کو صحیح طور پر حل نہ کر سکے اور حمیدیہ اور قا کی عدم موجودگی میں صحیح نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ ق میں مصرع ہے۔

وصل ہر رنگ تپش کسوتِ رسوائی ہے

اور قا میں ہے: وصل ہر رنگ جنوں کسوتِ رسوائی ہے

یعنی مخطوطے کا مصرع ق کی بجائے قا سے نزدیک تر ہے لیکن مطابق نہیں۔

ایسی معترضانہ تحقیق میں ثانوی ماخذ پر بھروسہ کرنا اسی قسم کی گمراہیوں کا موجب ہوتا ہے چاہیے تھا کہ خ کے اختلافاتِ نسخ کی بحث میں ق، قا اور گلِ رعنا کے متون سے مقابلہ کرتے لیکن وہ سب سے پہلے نسخۂ عرشی کے گنجینۂ معنی کے متن کو پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ حیاتِ غالب کے کلام کی کوئی معینہ منزل نہیں۔ اس میں دیے ہوئے اشعار میں ہر مقام پر یہ واضح نہیں کہ یہ ق کا متن ہے یا قا کا یا گلِ رعنا کا۔ دیباچۂ نسخۂ عرشی میں ص ۴۷ پر یہ اطلاع ہے کہ گنجینۂ معنی کا اکثر متن نسخۂ شیرانی کے مطابق کر دیا گیا ہے لیکن متعدد

جگہوں پر ایسا نہیں ہو سکا کیونکہ شیرانی کی تفصیلات دیر سے ملی تھیں۔ اس طرح اصل نسخے دیکھے بغیر پوری تشفی نہیں ہوئی کہ گنجینۂ معنی میں کس مصرع کا متن کس نسخے کا ہے۔ خوش قسمتی سے ۱۹۶۹ء میں نسخۂ شیرانی اور ۱۹۷۰ء میں گلِ رعنا (مرتبہ مالک رام) چھپ گیا اور یہ تمام نسخے قریب کی جمّوں یونیورسٹی میں مہیا تھے۔ ان سے مقابلہ کیے بغیر تحقیقی جائزہ کو آخری شکل نہ دینی چاہیے تھی۔ اب تو جناب مصنف پر وہی اعتراض صادق آتا ہے جو انھوں نے نثار احمد فاروقی پر کیا تھا کہ "انھوں نے حمیدیہ اور شیرانی کا صرف نام سنا ہے"۔

مخطوطے کے جعلی ہونے کی جو دلیلیں مصنف نے درج کی ہیں ان کا خلاصہ شاید یوں کیا جا سکے۔

(۱) اس میں سیکڑوں صورتوں میں نسخۂ بھوپال سے اگلی منزل نسخۂ شیرانی کا متن ہے۔ بعض مثالوں میں دیوانِ غالب طبعِ اول، لطیف ایڈیشن نسخۂ مالک رام اور نسخۂ عرشی کا متن نقل کر دیا گیا ہے۔

(۲) الف اور عین کے عکسوں میں کئی جگہ فرق ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عین میں یا دونوں عکسوں میں تحریف ہوئی ہے۔ اگر ان کے مرتب تحریف کر کے عکس شائع کر سکتے ہیں تو پورا مخطوطہ بھی بنوا سکتے ہیں۔

(۳) اس میں املا ہر جگہ یکساں نہیں نیز غالب کے املے کی خلاف ورزی ہے

(۴) اس میں ایسے اغلاطِ کتابت ہیں، جو غالب نہیں کر سکتے تھے۔

(۵) مخطوطے کے نودریافت اشعار اور متعدد اشعار کی قدیم ترقرأتیں (مصنف کی اصلاح میں اصلاحِ معکوس) ایسی مہمل، بھونڈی یا غیر موزوں ہیں کہ وہ غالب سے ممکن نہیں۔

جستہ جستہ کچھ اور اعتراضات بھی ہیں جن پر حسبِ موقع غور کیا جائے گا۔ پہلے اعتراضات نمبر ۱ کو دیکھیے۔

اس کتاب کی اشاعت سے قبل بھی ہمیں چند مثالیں معلوم تھیں کہ غالب نے

بعد کے نسخے میں ایک متن میں ترمیم کی لیکن اس سے بھی بعد کی منزل میں پھر سب سے پہلے متن پر رجوع کر گئے مثلاً

	خ	ق	قا	گلِ رعنا
(۱) بہ رہنِ شرم ہے باوصفِ شوخی اہتمام اس کا	باوصفِ شہرت	باوصفِ شوخی	باوصفِ شہرت	
(۲) بہ حلقۂ خمِ گیسو ہے راستی آموز ... صبا نکلتی ہے گیسوئے	گیسو ہے	گیسوئے		

اگر خ کو غیر معتبر بھی قرار دے دیا جائے تو بھی بعد کے تین نسخے یقیناً معتبر ہیں۔ ان سے غالبؔ کا ایک رجحان، 'مزاج کا تلوّن' ثابت ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس قسم کی اور بہت سی مثالیں بھی مل جائیں تو ان کی وجہ سے مخطوطے کو جعلی قرار نہیں دیا جائے گا۔ مصنّف نے شاید سو سے بھی زیادہ ایسی مثالیں تلاش کی ہیں۔ جہاں خ کا متن ق کی بجائے قا کے مطابق ہے اور ان کی وجہ سے وہ خ کو قطعی طور پر قا کے بعد کا بلکہ مصنوعی قرار دیتے ہیں جسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

ایک نکتہ یہ بھی مدِّ نظر رہنا چاہیے کہ نسخۂ بھوپال میں اغلاطِ کتابت تھے، مفتی انوار الحق نے اسے بڑی بد احتیاطی سے ترتیب دیا جس سے متعدد اغلاطِ قرأت بھی اضافہ ہو گئے۔ عرشی صاحب نے دو دن کے مختصر قیام بھوپال میں نسخۂ حمیدیہ کا اصل نسخے سے مقابلہ کیا جو ظاہر ہے کہ بہت سرسری ہی ہو سکتا ہے۔

حمید احمد خاں نے بھی ایسا کیا لیکن انھوں نے اپنا وقت غزلوں کی صحیح ترتیب نوٹ کرنے پر صرف کیا متون کا مقابلہ نہیں کیا۔ اس لیے نسخۂ حمیدیہ کے دونوں ایڈیشنوں اور نسخۂ عرشی کے باوجود اس کے صحیح متن کے بارے میں ہر جگہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا۔ کمال صاحب خود اسی بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مفتی انوار الحق، ڈاکٹر عبد اللطیف، شیخ محمد اکرام (مرتب ارمغانِ غالب) اور مولانا عرشی کی عرق ریزی کے باوجود "کئی مقامات پر نسخۂ بھوپال کی کتابت کی غلطیاں باقی رہ گئی ہیں" (ص ۳۲۹)

مصنّف نے خ کے ق سے اختلاف اور قا سے مطابقت کی جو متعدد مثالیں

دی ہیں ان میں سے بہت سی صریحاً ق کے سہوِ کتابت یا سہوِ قرأت کی وجہ سے ہیں مثلاً

جائزہ کا صفحہ	خ کا متن	حمیدیہ	شیرانی
۲۰	خرامِ ناز برقِ حاصلِ سعیِ پسند آیا	پسند	سپند
۳۴	داغِ مہر ضبطِ بے جا، ستی سعی سپند	پسند	سپند
۳۰۰	جنبشِ تالِ قلم جوشِ پرافشانی مجھے	پریشانی	پرافشانی
۳۰۶	ناخنِ انگشتِ خوباں نعلِ از دوں ہے مجھے	لعل	نعل
۳۱۹	مال وجاہ ودست وپائے زر خریدہ ہیں اسد پائے زر خریدہ		پائے زر خریدہ

معنی پر نظر کی جائے تو صاف ظاہر ہے کہ ق میں سہوِ کتابت تھا یا پھر نسخۂ حمیدیہ میں سہوِ قرأت یا سہوِ طباعت نے ستم ڈھایا۔ اب ایک صحیح نسخے سے یہ توقع کیوں کی جائے کہ وہ بعد کے نسخے کے اغلاط کی عکاسی کرے۔ ایسے موقعوں پر خ کی قا سے مطابقت بالکل فطری ہے۔ مصنّف کی تلاش کردہ مثالوں میں بڑی تعداد اسی قسم کی ہے۔ ان کے علاوہ جو مثالیں ہیں انھیں غالب کے تلوّنِ ذہنی پر محمول کرنا ہوگا کیونکہ خ سے قطعِ نظر بھی وہ اس رجحان کی غمازی کرتے ہیں۔

حاشیۂ ق کے اشعار۔ مصنّف نے چند ایسے اشعار کی نشان دہی کی ہے جو نسخۂ بھوپال کے حاشیے پر درج ہیں لیکن خ کے متن میں ہیں حاشیۂ ق کے اشعار ۱۲۳۷ھ کے بعد کی تصنیف قرار دیے جاتے ہیں۔ خ میں ان کا ہونا بڑا معنی خیز ہے ان پر فرداً فرداً غور کیا جاتا ہے۔

جائزہ ص ۲۵

تکلّف عاقبت میں ہے دلا بندِ قبا واکر
نفس ہا بعدِ وصلِ دوست تاوانِ گستن ہا

یہ شعر بہ تبدیلیِ ردیف دو غزلوں میں آتا ہے۔ مصنّف کا خیال ہے کہ یہ ق میں 'کا' کی ردیف والی غزل کے حاشیے پر ہے لیکن 'ہا' کی ردیف والی غزل میں نہیں۔

حمیدا احمد خاں نے بالخصوص غزلوں کی ترتیب اور حاشیے کے اندراجات کا مطالعہ کیا اس لئے اشعار و غزلیات کے محل کتابت کے بارے میں ان کی رائے کو نسخۂ عرشی پر ترجیح دی جائے گی لیکن اس شعر کے بارے میں حمیدا احمد خاں اور مولانا عرشی دونوں متفق ہیں کہ یہ "ق" کے متن میں "ہا" کی ردیف میں موجود ہے۔ دیکھئے نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ حمیدا احمد خاں ص ۳۸، اور نسخۂ عرشی ص ۵۔۴، اس سے پیشتر شعر کا نوٹ۔ جب مندرجۂ بالا شعر حاشیہ "ق" کے علاوہ متنِ "ق" میں بھی موجود ہے تو اعتراض ختم ہو جاتا ہے۔

جائزہ ص ۳۴

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سروپا ہیں
کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشتِ خار اپنا

نسخۂ عرشی ص ۴۴ کالم ا میں لکھا ہے کہ یہ شعر حاشیۂ "ق" کا ہے لیکن حمیدیہ اور لطیف ایڈیشن میں اس کا اظہار نہیں کیا گیا۔ کمال صاحب لکھتے ہیں کہ ان دونوں ایڈیشنوں میں "درج نہ ہونے کی وجہ سے مخطوطے" کا بلیو پرنٹ بنانے والوں نے ٹھوکر کھائی" اور اسے متنِ خ میں لکھ دیا۔

ٹھوکر عرشی صاحب نے اور کمال صاحب نے کھائی۔ حمیدا احمد خاں نے اپنے نسخۂ حمیدیہ کے ص ۲۸ پر واضح کر دیا ہے کہ نہ صرف ایک شعر بلکہ اس غزل کے پورے سات شعر ق کے متن میں بھی ہیں اور کسی غلط فہمی کے سبب دوبارہ حاشیے پر بھی درج کر دیے گئے ہیں۔

جائزہ ص ۴۹

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط
شعلہ خس میں مثلِ خوں در رگ نہاں ہو جائے گا

نسخۂ عرشی اختلافِ نسخ ص ۲۸ ۴۴ پر اسے واقعی حاشیۂ ق کا قرار دیا ہے جس سے کمال صاحب نے خ پر اعتراض جڑ دیا۔ لیکن حمیدا احمد خاں کے نسخۂ حمیدیہ کے مطابق (ص ۔ ۷) اس غزل کے صرف تین شعر حاشیے پر درج ہیں اور مندرجہ بالا شعر ان میں سے نہیں۔ حمیدا احمد خاں کا بیان نسخۂ عرشی پر مرجح ہے۔

جائزہ ص ۳۹

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ درد نومیدی
کفِ افسوس سودن عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

نسخۂ عرشی کے مطابق یہ شعر حاشیۂ ق کا ہے جس کی وجہ سے کمال صاحب خ میں اس کے شمول پر کھٹکتے ہیں لیکن حمیدا احمد خاں نے صراحت کر دی ہے کہ یہ شعر متن کی غزل میں موجود ہے ساتھ ہی کسی نے حاشیے پر دوبارہ لکھ دیا ہے۔ (نسخۂ حمیدیہ، لاہور ایڈیشن ص ۔۴ ۲، ۲۴۱)

جائزہ ص ۶۴

ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا
موجِ خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

نسخۂ حمیدیہ کے دونوں ایڈیشنوں اور نسخۂ عرشی میں صراحت ہے کہ یہ شعر حاشیۂ ق کا ہے۔ صرف لطیف ایڈیشن میں یہ بات ظاہر ہونے سے رہ گئی تھی۔ اس سے مصنف نے یہ نتیجہ نکالا کہ مخطوطہ سازوں نے لطیف ایڈیشن میں اطلاع کے نہ ہونے سے دھوکا کھایا۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے لطیف ایڈیشن پر کیوں تکیہ کیا۔ حمیدیہ اور نسخۂ عرشی سے ان کی غلط فہمی کیوں دور نہ ہوئی۔

مصنف کو جاننا چاہیے کہ لطیف ایڈیشن کبھی شائع نہیں ہوا بلکہ پورا چھپا بھی نہیں۔ اس کا ایک حصہ عرشی صاحب کو ملا کیا کسی دوسرے کی دسترس میں بالکل نہیں۔ اگر معاذ اللہ عرشی صاحب یا عرشی زادہ نے یہ جعلی نسخہ تیار کیا ہو تو وہ اتنے ناواقف نہ تھے کہ اس شعر کے حاشیۂ ق پر اندراج سے واقف نہ ہوں۔

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالب نے یہ شعر خ کے دوران ہی تصنیف کیا۔ ق کے متن میں شامل نہیں کیا یا شامل ہونے سے رہ گیا۔ بعد میں فیصلہ کیا گیا کہ اسے شامل کرنا چاہئے اس لئے حاشیۂ ق پر اضافہ کر دیا گیا۔ نسخۂ عرشی زادہ مقدمہ ص ۔۳ پر اطلاع دی گئی ہے کہ غالب نہ صرف شعروں کے متن میں بلکہ شعروں اور غزلوں کو برقرار رکھنے نہ رکھنے کے بارے میں بھی بار بار اپنی رائے بدلا کرتے تھے۔

مصنف نے مخطوطے کے بعض مصرعوں کو جن دوسرے مصادر سے ماخوذ کیا ہے وہ یہ ہیں۔

(جائزہ ص ۳۶۵)

عیش بے تابی خرام کلفت افسردگی
ورنہ زنداں در دل افزون بنائے خندہ ہے

خ میں خرام ہے جب کہ بعد کے نسخوں میں حرام الف کی نستعلیق قرأت میں بھی خرام درج ہے، لیکن دیوانِ غالب طبع اوّل میں اس کے اصلاحی مصرع میں 'خرام' چھپ گیا تھا ع کلفتِ افسردگی کو

حیشِ بے تابی خرام۔ یہ سہوِ کتابت ہے۔ مصنف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مخطوطہ تیار کرنے والوں نے یہ مصرع دیوان کی طبعِ اوّل سے لیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ 'حرام' صحیح اور 'خرام' غلط ہے۔ اب دیوان کی طبعِ اوّل اتنی شاذ ہے کہ ملک میں دو ایک نسخے ہی ہوں گے۔ کمال صاحب کا مبیّنہ جعل ساز ایک طرف تو ایسا محقّق تھا کہ مشہور نسخوں کو چھوڑ کر کن کن غریب نسخوں کی چھان بین کرتا تھا۔ دوسری طرف ایسا بے بصر تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکتا تھا کہ یہاں 'خرام' کا موقع نہیں 'حرام' کا مقام ہے۔ مخطوطے میں خرام کی ح سے خاصہ اُوپر جو نقطہ لگا ہے وہ یا تو سہوِ کتابت ہے یا ان متعدد فاضل نقطوں اور دھبّوں میں سے ہے جو اس نسخے میں جا بجا موجود ہیں۔

جائزہ ص ۳۸۹

دیکھ اے اسدؔ بدیدۂ باطن کہ ظاہرا
ہر ایک ذرہ غیرتِ صد آفتاب ہے

ارشادِ مصنف ہے کہ مصرعِ ثانی جگر کے مصرع :

ع جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ اس اتہام کا جواب ممکن نہیں۔ گویا جگر سے پہلے اشعار میں ذرہ اور آفتاب کا تلازمہ یا ذرہ کا آفتاب بننا نہ باندھا جاتا تھا۔

جائزہ ص ۱۴۹

جوں اعتمادِ نامہ وخط کا ہو مہرِ خط سے
یُوں عاشقوں میں ہے سببِ اعتبار داغ

ظاہر ہے کہ پہلے مصرع میں دوسرا 'خط' محض سہوِ قلم کا حشو ہے لیکن مصنف کو بدگمانی ہے کہ نسخۂ عرشی کے مصرع 'جوں اعتمادِ نامہ وخط کا ہو مہر سے' میں پنسل سے مہر سے مہر کے بعد خط کا لفظ بڑھایا گیا تھا کہ اصلاحِ معکوس سے مصرع

ع جوں اعتمادِ نامہ وخط کا ہو مہرِ خط، حاصل ہو جائے لیکن جعل ساز اسے کاٹنا بھُول گیا اور ناقل نے وہی نقل کر دیا۔

معلوم نہیں نسخۂ عرشی اور پنسل کی تخصیص کیوں کی گئی۔ یہ شعر حمیدیہ اور شیرانی میں بھی موجود ہے اور 'جاعل' کی دسترس میں یہ ایڈیشن بھی رہے ہوں گے۔ پھر پنسل ہی سے کیوں، روشنائی سے اضافہ

کیوں نہیں کیا گیا۔ دراصل مخطوطے میں ایک سیدھا سادہ تسامحِ قلم ہے جس کی توجیہ کے لئے دُور دراز کا افسانہ تراش دیا ہے۔

حاشیۂ رخ کے اضافے۔ مخطوطے کے حاشیے پر جو غزلیں اضافہ ہیں انھیں عام طور سے بخطِ غیر مانا جاتا ہے۔ املے کی بہت سی غلطیوں کے باوجود کمال صاحب انھیں کاتبِ متن کے قلم سے منسوب کرنے پر مصر ہیں۔

حاشیے پر متن کی ایک غزل دہرا دی گئی ہے لیکن نظرِ ثانی کے بعد۔ اگر کاتبِ متن و کاتبِ حاشیہ ایک شخص ہوتا تو وہ اس غزل کو حاشیے پر دوبارہ کیوں لکھ دیتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ حاشیے پر لکھنے والے نے یہ توجہ ہی نہیں کی کہ یہ غزل پہلے سے متن میں موجود ہے۔ حاشیے کے لئے یہ غزل اس نے متن سے نہیں لی بلکہ کہیں اور سے لی ہے تبھی تو دونوں میں اختلافِ نسخ ہیں۔ متن میں شعر ہے :

خوش اوفتادگی کہ بہ صحرائے انتظار
جوں جادہ گردِ رہ سے نگہ سرمہ سا کرے

حاشیے میں مصرعِ اُولیٰ میں "صحرائے آشکار" لکھا ہے اور اس پر اعتراض ہے۔ (ص ۱۷۶) ظاہر ہے کہ کاتبِ حاشیہ نے کہیں اور صحرائے انتظار لکھا دیکھا لیکن کم سوادی کی وجہ سے اسے "آشکار" پڑھ لیا۔ شکستہ لکھتے وقت الف پر مد لگانا ضروری نہیں ہوتا۔ انتظار اور آشکار دونوں میں تین نقطے ہیں اور درمیانی ظا اور درمیانی ک کی قرأت میں التباس کی کافی گنجائش ہے۔ سہوِ قرأت نے سہوِ کتابت کو جنم دیا۔

اجائزہ ص ۱۷۸)

حاشیۂ رخ پر بعض غزلیں حاشیۂ ق اور آخرِ ق کی بھی درج ہیں۔ مصنف کو اعتراض ہے کہ اتنے بعد کے زمانے کی غزلیں رخ پر کیسے لکھی گئیں اور حاشیۂ رخ پر ان کا متن حاشیۂ ق اور آخرِ ق کے متن سے کیوں مختلف ہے۔ جواب یہ ہے کہ حاشیۂ رخ پر اندراجات کے لئے زمانے کی کوئی قید نہیں۔ کاتبِ حاشیۂ رخ نے ان غزلوں کو براہِ راست حاشیۂ ق و آخرِ ق سے نہیں لیا بلکہ کسی اور ماخذ سے جو مؤخر الذکر دونوں ماخذ سے فرسودہ تر روایت کا ترجمان تھا۔

اعتراض ہے کہ حاشیے اور آخر کی چند غزلیں رخ پر بڑھائی گئیں تو سب کیوں نہیں بڑھائی گئیں۔

یہ ضروری نہ تھا۔ کاتبِ حاشیۂ خ کو یا تو سب ملی نہیں یا اس نے صرف انھیں کو نقل کرنا پسند کیا۔

جائزہ ص ۱۷۹

ع غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں

اس غزل کے چھ شعر متنِ ق میں موجود ہیں اور چار شعر حاشیۂ ق پر اضافہ ہیں۔ قا میں دس کے دس شعر متن میں موجود ہیں۔ حاشیۂ خ پر متنِ ق والے چھ شعر درج ہیں لیکن حاشیۂ خ والے چار غیر حاضر ہیں۔ ان کے فقدان پر مصنف کو اعتراض ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس غزل کے چھ شعر ایک بار کہے گئے اور متنِ ق اور حاشیۂ خ پر جگہ پا گئے۔ بقیہ چار شعر بعد میں کہے گئے، حاشیۂ ق میں لکھے گئے حاشیۂ خ میں نہیں لکھے گئے یعنی حاشیۂ خ پر اس غزل کے اشعار کا اندراج حاشیۂ ق کے چار شعری اضافے سے پہلے کا ہے۔

جائزہ ص ۱۸۱

اعتراض ہے کہ حاشیۂ خ پر آخرِ ق کی غزل ع چاہئے خوباں کو جتنا چاہیے، کے دو شعر کیوں حذف کر دیے گئے۔ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ حاشیۂ خ پیشتر کی منزل ہے جیسا کہ اس کے فرسودہ تر متن سے ظاہر ہے۔ اس وقت تک دونوں محذوف شعر تصنیف نہ کئے گئے ہوں گے۔ بعد میں اضافہ ہوئے ہوں گے۔

جائزہ ص ۲۱۰

عمدۂ منتخبہ کی تاریخِ تکمیل ۱۲۲۴ھ ہے لیکن اس میں بعد میں بھی اضافے ہوتے رہے۔ قاضی عبدالودود نے اس قسم کے چند حوالے دیئے ہیں۔

۱۔ پیر بخش سرور کے ترجمے میں لکھا ہے کہ وہ ذکا کی طرح حسنِ اتفاق سے ۲۳ جلوسِ اکبری ثانی میں دلی آئے۔ اکبر ثانی کا جلوس ۱۲۲۱ھ میں ہوا۔ ۲۳ جلوس ۱۲۴۳ھ سے قبل نہیں ہو سکتا۔

۲۔ پنج آہنگ کے ایک خط بنامِ شیفتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تپاں نے کلکتہ میں غالب کو اپنا کلام تذکرۂ سرور میں شمول کے لئے دیا۔ غالب نے دلی جا کر سرور کو دے دیا لیکن کسی وجہ سے وہ شامل نہ

[1] اشتر و سوزن از قاضی عبدالودود ۱۹۶۴ء ص ۱۶-۱۷

ہو سکا۔ غالب ۱۸۲۹ء کے اخیر میں دلی پہنچے[1]

۳۔ ذوق نے معروف کی تسبیحِ زمرد کی تاریخ کہی جس سے ۱۲۳۶ھ نکلتا ہے اور یہ تذکرے میں موجود ہے[2]

۴۔ غالب کی آخرِ ق کی بعض غزلیں عمدۂ منتخبہ میں ہیں جن سے عرشی زادہ نے بجا نتیجہ نکالا ہے کہ عمدہ میں ان کا اندراج کتابتِ متنِ ق یعنی ۱۲۳۷ھ کے بعد ہوا ہوگا۔ اور عمدۂ منتخبہ میں ایک شعر کی گلِ رعنا سے فرسودہ تر روایت کی بنا پر انھوں نے دوسری حد ۱۲۴۴ھ مقرر کی۔ کمال صاحب کو اصرار ہے کہ عمدہ میں ۱۲۲۴ھ کے بعد کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ لکھتے ہیں:

"۱۲۱۲ھ مرزا کی ولادت کا سال ہے۔ شاعری کا آغاز ۱۲۲۱ھ/۱۲۲۳ھ اور بیدلی رنگ کا غلبہ ۱۲۲۴ھ سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے کیونکہ عمدۂ منتخبہ میں ایسی غزلیں موجود ہیں:

ع عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

اور ع کب سنتے ہے وہ کہانی میری"

کتنا افسوسناک بیان ہے کہ آخرِ ق کی غزلوں کو غالب کی ۱۲ سال کی عمر اور متنِ ق کی کتابت سے ۱۳ سال قبل سے منسوب کر دیا۔ قاضی صاحب نے صحیح کہا ہے کہ کیا صاحبِ عمدہ بارہ سال کے لڑکے لئے لکھتا "درخاطر متمکن غم ہائے عشقِ مجاز"۔

جائزہ ص ۲۱۲

حاشیۂ خ میں بعض غزلیں ایسی ہیں جو ق میں نہیں ہیں لیکن متنِ ق میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ۱۲۳۷ھ اور ۱۲۴۳ھ کے حاشیۂ خ پر لکھی گئیں۔ خ میں ان کا متن ق سے کسی قدر مختلف ہے جس کے معنی خ میں قدیم تر متن ہے۔ مصنف دو سوال کرتے ہیں کہ حاشیۂ خ پر اختلافِ نسخ کیوں؟ کیا اس کے کاتب کی رسائی غالب کی کسی ذاتی بیاض تک تھی۔ اگر اسے ۱۲۴۲ھ کے آس پاس تک کا کلام مہیا تھا تو

[1] اشتر و سوزن از قاضی عبدالودود ۱۹۶۴ء ص ۱۹، ۱۷

[2] " " " " " " "

اس نے ق کا پورا کلام خ میں کیوں درج نہیں کیا۔

وجوہ دو ہو سکتی ہیں۔ خ کتابتِ متن کے بعد غالب سے جدا ہو گیا۔ پھر معلوم نہیں کہ کب کس کے پاس رہا۔ کاتبِ حاشیہ کو یا تو بعد کا سارا کلام نہیں ملا یا اس نے اپنی پسند کے مطابق چند غزلوں کو اضافہ کیا۔ اس وقت تک غالب کا کلام شائع تو ہو ہی گیا تھا۔ کیا ضروری ہے کہ وہ کاتبِ حاشیہ تک پورے کا پورا پہنچ جائے۔ ہاں اکا دکا غزلیں پہنچ سکتی ہیں۔

جائزہ ص ۲۱۳

ع مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

یہ غزل حاشیۂ خ پر درج ہے۔ اعتراض ہے کہ مطلع اور دوسرے تین شعر کیوں غائب ہیں۔

جموں یونیورسٹی میں نسخۂ عرشی زادہ کا جو نسخہ ہے اس میں مرتب نے اپنے قلم سے مقدمہ اور حواشی میں بہت سے مفید اضافے کئے ہیں۔ انھیں میں ایک جگہ اطلاع دیتے ہیں کہ ذیل کے تین شعر جلد بندی میں کٹ گئے تھے۔

۱ مطلع ۲ کرتا ہوں جمع۔ ۔ ۔ ۔ مژگاں کئے ہوئے۔ ۳ پھر وضع۔ ۔ ۔ گریباں کئے ہوئے

الف یا عین کو دیکھنے سے حاشیہ کٹ جانے کی بات واضح ہو جاتی ہے۔ جہاں تک چوتھے شعر:

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کئے ہوئے

کا تعلق ہے یہ آخر ق میں نہیں بلکہ پہلی بار ق میں ظاہر ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حاشیۂ خ پر اس غزل کا اضافہ متن ق اور متن قا کی کتابت کے درمیان ہوا۔

بیاضِ غالب نقوش ایڈیشن اور نسخۂ عرشی زادہ کے اختلافات:

کہیں زیادہ اہم اور دلچسپ وہ تقابلی مطالعہ ہے جو جناب کمال احمد صدیقی نے الف اور عین کے جزئیاتی اختلافات کا کیا ہے۔ ان اختلافات کی کھوج ان کا کارنامہ ہے۔ انھوں نے ایک خیال کو بار بار دہرایا ہے۔

"خیال ہے کہ عین کے لئے آفسیٹ نگیٹیو براہِ راست مخطوطے سے اور الف کے لئے اس مائکروفلم کے پرنٹ سے بنے ہوں گے جو پاکستان بھیجا گیا تھا۔" (ص ۲۲)

مائکروفلم کا ذکر وہ جائزہ، میں بار بار کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا انھیں یہ کہاں سے معلوم ہوا۔ "نقوش" بابت جولائی ۱۹۷۰ء میں بیاضِ غالب کی دریافت اور "نقوش" میں اشاعت سے متعلق بہت سی خبروں کو ڈائجسٹ کیا گیا ہے۔ ان میں سے کئی میں بتایا گیا ہے کہ مدیرِ "نقوش" نے مخطوطے کی فوٹوسٹیٹ کاپی حاصل کی تھی:

"وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس ہنگامہ بازی سے بہت پہلے بھوپالی بزرگ سے بات کر لی تھی اور مخطوطہ کی فوٹوسٹیٹ کاپی حاصل کر لی تھی۔"[1]

"ادارۂ "نقوش" کے محمد طفیل صاحب نے اپنے ذاتی ذرائع استعمال کئے اور کسی طور اس نسخے کی فوٹوسٹیٹ کاپی ہندوستان سے حاصل کر کے شائع کر دیا۔"[2]

"محمد طفیل کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس کی فوٹوسٹیٹ کاپی حاصل کی۔"[3]

ایک زمانے میں مجھے بھی خ کے ایک عکس کے مطالعے کا موقع ملا تھا جو غالباً اسی ماخذ سے تیار کیا گیا تھا جس سے نقوش والا فوٹوسٹیٹ۔ میں نے اس عکس (جسے میں آئندہ صفحات میں، اصل عکس کہوں گا) اور الف اور عین کے عکسوں کے باریک سے باریک اختلافات کا مطالعہ کر کے نوٹ لے لئے تھے جن کی مدد سے مصنف کے اعتراضات کا جائزہ لیتا ہوں۔

مصنف نے الف کے صفحات کا حوالہ دینے میں ورق فلاں الف اور ورق فلاں ب لکھا ہے جب کہ نقوش میں مقدمہ اور تستعلیق قرأت کی وجہ سے صفحات کا نمبر بالکل مختلف ہے اور مصنف کے دیئے حوالے سے تلاش کرنا دشوار ہے۔ میں نے چھان بین کر کے ہر مقام پر الف میں مطبوعہ نمبر صفحہ کا پتہ چلایا اور بقیہ مضمون میں اسی سے حوالہ دوں گا۔ الف اور عین کے ہر اختلاف میں مصنف نے صرف عین کو الزام دیا ہے۔ اگر الف میں ایک مصرع یا غزل قلم زد ہے اور عین میں نہیں تو نتیجہ اخذ کیا کہ عین میں قلم زد ہے تو طے کیا گیا کہ عین بعد میں خطِ تنسیخ کھینچا گیا ہے۔ اصل عکس کے مقابلے سے معلوم ہوا کہ بعض

[1] اخباری کالم۔ لاہور نامہ از انتظار حسین نقوش، جولائی ۷۰ء ص ۳۱
[2] دیوانِ غالب کا نسخۂ لاہور، ایک نشریہ، از اعجاز حسین بٹالوی نقوش۔ جولائی ۷۰ء ص ۳۳
[3] اخباری کالم، لاہور نامہ۔ مشرق ۹ دسمبر ۱۹۶۹ء بحوالہ نقوش جولائی ۷۰ء ص ۳۶

اوقات عین درست ہے اور الف غلط۔

اب ایک اور فرق کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

(جائزہ ص۲۲)

اعتراض ہے کہ الف ص ۵۴ پر مصرع ہے۔

ع اسد ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے

لیکن عین ص ۴ پر اسی مصرع کے "اسد" کا الف غائب ہے اور محض "سد" چھپا ہے۔ ایسا کیوں؟

مجھے اس اعتراض پر بڑی حیرت ہے کیونکہ میرے سامنے عین کا جو نسخہ ہے اس میں صاف صاف "اسد" چھپا ہے۔ کیا کمال صاحب کے نسخے میں "اسد" کا الف چھیل دیا گیا ہے۔

(جائزہ ص۲۶)

اعتراض کا خلاصہ اپنے الفاظ میں درج کرتا ہوں۔ الف میں ص ۵۶ پر ایک جگہ اور ص ۶۰ پر دو جگہ صحیح کے وہ نشان (✓) ہیں جنھیں انگریزی میں ٹک مارک کہتے ہیں۔ لیکن یہ عین کے مقابل ص۵ اور ص ۷ پر نہیں چونکہ غالبؔ نے کبھی اس طرح کے انگریزی نشان نہیں لگائے اس لئے مخطوط جعلی ہے۔

اعتراض باوزن ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ نشانات مخطوطے میں بھی موجود رہے ہوں گے۔ چونکہ الف کے علاوہ اصل عکس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ عین میں غالباً انھیں ہٹوا دیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غالبؔ کے زمانے میں اُردو میں ان کا رواج نہ تھا۔ ہوسکتا ہے کہ مخطوط غالبؔ سے جُدا ہونے کے بہت بعد کسی نے انھیں لگا دیا ہو۔ الف ص ۶۰ کے نشانات تو صریحاً متن سے مختلف قسم کے ہیں۔ لیکن ص ۵۶ کے نشان کے بارے میں کمال صاحب کا دعویٰ ہے کہ یہ متن ہی کے قلم سے ہے ممکن ہے ان کی بات صحیح ہو لیکن اس نشان کے بیچ سوئی کے نوک کے برابر ایک باریک سفید نقطہ ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ کرم خوردگی کا سوراخ تو نہیں؟ اصل مخطوطے کو دیکھ کر ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال فی الحال ص ۵۶ کا نشان شک ضرور پیدا کرتا ہے۔

(جائزہ ص۳۲)

ع گرفتارانِ اُلفت بے زباں ہیں کاش صیادے

اس مصرعے میں عین ص ۹ پر صیادے لکھا ہے جب کہ الف ص ۴۶ پر 'صیادسے'، عین میں مصرع پر خطِ تنسیخ کھینچا ہے جب کہ الف میں غائب ہے عین پر تحریف کا الزام رکھا گیا ہے۔

'اصل عکس' میں 'صیادے' یوں لکھا ہے کہ 'ے' میں 'س' کے دندانوں کی جگہ دو گہرے رنگ کے نقطے ہیں جیسے کسی نے شروع میں 'ے' لکھا ہو اور بعد میں اسے 'سے' بنا دیا ہو۔ اصل عکس میں یہ مصرع ہلکے سے خط سے قلم زد ہے۔ یہ خط مصرعے کے ابتدائی اور آخری حصے کو قلم زد کرتا ہے۔ بیچ میں غائب ہے۔ الف میں غالباً ربڑ کما کے محو کر دیا گیا ہے اور عین میں شاید اس کے دونوں سرے ملا کر اور گہرا خط کھینچ دیا گیا ہے۔

اصل عکس سے مزید معلوم ہوا کہ نقوش میں حاشیے کا اصلاحی مصرع : ع اسیرِ بے زبانی ہوں مگر صیاد بے پروا۔ کاتب سے لکھایا ہوا ہے۔ 'پر' کے تین نقطوں کا انداز اور مقام غماز ہے۔ عین میں مصرع جس طرح لکھا ہے وہ اصل کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔

اسی صفحے پر آخری سے پہلا مصرع ہے :

ع ہوا ہے نقشبندِ آئینہ سنگِ مزار اپنا

عین میں 'ہے' بالکل صاف ہے جب کہ الف میں 'ہے' کا لنکن نہیں جس سے کمال صاحب نے اسے 'ہوا ے' پڑھا اور عین کو تحریف کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اصل میں بھی 'ہے' عین کی طرح صاف صاف لکھا ہے۔ نقوش میں طباعت کے وقت 'ہے' کا لنکن حذف ہو گیا۔ یہاں بھی نقوش ہی ناقص ہے۔

جائزہ ص۴۴

عین ص ۱۲ کے نیچے ترک کے طور پر 'ہوا' لکھا ہے۔ لیکن الف ص ۷۰ پر موجود نہیں جس سے کمال صاحب نے نتیجہ نکالا کہ مرتب عین نے مرزا کی وفات کے سو برس بعد میرزا کے قلم سے کم از کم ایک لفظ ترک لکھوا ہی لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اصل عکس میں بھی ترک کا لفظ 'ہوا' موجود ہے۔ نقوش میں حذف ہو گیا ہے۔

جائزہ ص۴۷

الف ص ۹۲ اور عین ص ۲۳ پر مصرع ہے :

ع نقشِ پائے خضر، یہاں[1] سدِ سکندر ہو گیا

[1] یہاں، کا تلفظ 'یھاں' ہے لیکن کاتب نے 'یہاں' لکھا ہے۔

اعتراض ہے کہ الف میں 'یہاں' پر روشنائی کا دھبّہ پڑا ہے جب کہ عین میں نسبتاً صاف ہے۔ میری رائے میں یہ الف کے فوٹو کا بھوہڑپن ہے کیونکہ اصل عکس میں بھی روشنائی کا نشان عین جیسا ہے یعنی دونوں 'ہ' کا شکن نمایاں ہے۔ الف کے عکس کسی ماہر فوٹوگرافر نے نہیں بنائے۔

اسی صفحہ پر ایک مصرع ہے، ع پیمانہ ہوا ہے مشتِ غبارِ صحرا۔ نقوش میں صحرا کے ۲ پر روشنائی گری ہے جب کہ عین میں نہیں۔ عین میں صاف ری ٹچ کرایا گیا ہے۔ میں نے اپنے کسی مضمون میں عین میں "ری ٹچنگ" کی دو ایک مثالیں دی تھیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اکبر علی خاں نے اپنی کسی تحریر میں یا مجھے کسی خط میں لکھا تھا کہ انھوں نے نسخے میں بعض مقامات سے روشنائی کے دھبّے ہٹوا دیے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اصل عکس میں صحرا کا روشنائی کا دھبّہ الف سے کسی قدر مختلف ہے۔ اصل عکس میں صحرا صاف پڑھا جاتا ہے لیکن الف میں نہیں۔

(جائزہ ص ۹۹)

الف ص ۱۰۲، اور عین میں ص ۲۸ پر مصرع ہے:

ع برقِ خرمن ہائے گوہر ہے نگاہِ تیز یہاں[1]

الف اور اصل عکس میں پہلے 'وہیں' تھا جس کے اوپر 'یہاں' لکھا ہے اور جس کے نقوش بادی النظر میں واضح نہیں۔ عین میں کوئی کاٹ چھانٹ نہیں۔ صاف 'یہاں' لکھا ہے۔ مصنف کو اعتراض ہے:

"یہ بات کسی شک و شبہ کے شائبے کے بغیر ثابت ہے کہ ۱۹۶۹ء میں 'یہاں'
اس مصرع میں بخطِ غالب لکھا گیا ہے جس نے ۱۹۶۹ء میں اس مصرع میں یہاں
لکھا ہے اسی نے ۱۹۶۹ء میں یا ایک آدھ برس پہلے 'مخطوط' بخطِ غالب لکھا ہے۔"

میں اس سے متفق نہیں کہ 'یہاں' لکھوایا گیا ہے۔ کٹے ہوئے نقوش کی فالتو لکیریں ہٹا دینے سے 'یہاں' اُبھر آئے گا۔ یہاں بھی صرف ری ٹچ کیا گیا ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ مرتبِ عین کو اس کا حق نہ تھا۔

اسی صفحے پر ایک مصرع ہے:

[1] 'یہاں' کا تلفظ 'یہاں' ہے لیکن کاتب نے 'یہاں' لکھا ہے۔

ع اے عدوئے مصلحت چندے بہ ضبط افسردہ رہ

الف میں مصلحت کی ت پر روشنائی کا بڑا سا دھبّہ ہے عین میں نہیں جس سے مصنف جائزہ عین پر شبہ کرتے ہیں۔ اصل عکس میں بھی مصلحت بالکل صاف ہے جس سے معلوم ہوا کہ نقوش ہی میں بھوہڑپن سے روشنائی گرائی گئی ہے۔

جائزہ ص ۱۴۷

الف ص ۱۳۴، عین ص ۴۴ پر قلم زد مصرع ہے:

ع پتنگ سمجھے ہے طرزِ فسانہ خوانیِ شمع

الف میں پتنگ پر روشنائی کا دھبّہ مختصر ہے جیسے پانی یا سوختہ سے ہلکا کیا گیا ہو۔ عین میں بڑا مثلث نما ہے۔ کمال صاحب یہاں بھی عین پر حرف گیر ہیں۔ اصل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس میں بھی روشنائی کا دھبّہ بالکل عین جیسا ہے۔ اس کے معنی اسے صاف کرنے کی کوشش الف میں کی گئی ہے۔

جائزہ ص ۱۷۰

الف میں ۱۵۰ میں متن کے مصرع:

غیروں سے اے گرمِ سخن دیکھ کے اس کو

پر خطِ تنسیخ کھینچا ہے۔ عین ص ۵۲ سے غائب ہے چونکہ اصل عکس میں یہ خطِ تنسیخ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عین میں 'ری ٹچ' کر کے غائب کیا گیا ہے۔

حاشیے کا اصلاحی مصرع: ع غیروں سے اے گرمِ سخن دیکھ کے غالب، دونوں نسخوں کے عکس میں مختلف زاویوں سے چھپا ہے۔ عین میں اصل عکس کے مطابق ہے۔ نقوش میں جگہ کی قلت کی وجہ سے اسے فوٹو سے علیحدہ کاٹ کر دوبارہ نزدیک تر بٹھایا گیا ہے جو نقل مطابق اصل نہیں۔

جائزہ ص ۲۲۷

عین ص ۵۴ میں:

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

کے آگے ایک کھڑی لکیر ہے جب کہ نقوش ص ۱۵۴ پر یہاں سے غائب ہے۔ کمال صاحب کے شبہ کے

برعکس یہ لکیر الف میں ہٹائی گئی ہے کیونکہ اصل عکس میں موجود ہے۔ اس لکیر کا مقابل کے صفحے کے لفظ "خود آرا" کو کاٹنے والی لکیر سے کوئی تعلق نہیں۔ کمال صاحب نے خواہ مخواہ ان کا تعلق فرض کر کے شکوک کھڑے کئے ہیں۔

جائزہ ص ۲۴۹

الف ص ۱۰۷، اور عین ص ۶۵ پر دو غزلیں کٹی ہوئی ہیں لیکن عین میں خط تنسیخ دونوں غزلوں میں صاف اور گہرا ہے جب کہ الف میں پہلی غزل میں یہ ٹوٹا ہوا اور دوسری غزل میں صرف اوپری حصے میں ہے۔ بقیہ اشعار میں تقریباً معدوم ہے۔ اصل عکس میں خطوطِ تنسیخ الف سے کسی قدر نمایاں تر لیکن عین کے مقابلے میں بہت کم ہیں معلوم ہوتا ہے عین میں ان خطوطِ تنسیخ پر خصوصاً دوسری غزل کے خط پر قلم پھیر کر انھیں نمایاں کیا گیا۔

جائزہ ص ۲۷۳

عین ص ۴۷، پر حاشیے میں الفاظ "مجمرِ بزم فسردن" لکھے ہیں جب کہ الف ص ۱۹۴ کے حاشیے میں نہیں۔ چونکہ کمال صاحب عین سے زیادہ بدگمان ہیں اس لئے انھیں شبہ ہوا کہ عین میں بعد میں لکھائے گئے ہیں۔ اصل عکس سے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بھی موجود ہیں لیکن عین کی نسبت کافی دھندلے۔ نقوش میں فوٹو سے بالکل ہی حذف ہو گئے۔

جائزہ ص ۳۱۵

نقوش ص ۲۱۸، اور عین ص ۸۶ پر مصرع ہے:

اے حسن مگر حسرتِ پیماں شکنی ہے

نقوش میں "حسرے" جیسا لکھا ہے لیکن عین میں صاف "حسرت" ہے۔ عین پر تحریف کا الزام رکھا گیا جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل عکس میں بھی نقوش جیسا لکھا ہے۔ عین میں صاف کیا گیا ہے۔ چونکہ یہاں حسرت کا موقع نہیں اس لئے اعتراض ہے کہ یہ مصرع غالب کے قلم سے نہیں ہو سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ کاتب نے "ے" نہیں لکھی۔ اصل عکس میں "ت" کی افقی کشش آخر تک نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نقطے کسی طرح پونچھے گئے اور ترچھے خط کی شکل نمایاں اختیار کر گئے۔

اسی صفحے پر مصرع ہے "جائے کہ اسد رنگِ چمن باختنی ہے"۔ یہ اصلاحی قرأت ہے۔ "جائے کہ"

ہے پیشتر کی قلم زاد قرأت بقولِ مرتب الف "ہر جا کہ" اور بقول مرتبِ عین "ہر چند تھی"۔ عین کا قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے مصنف کا کہنا ہے کہ الف میں "ہر" پورا لکھا ہے جب کہ عین میں بہت چھوٹا ہے۔ یعنی اس کی "ر" نیچے سے چھیل دی گئی ہے۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اصل عکس الف کے مطابق ہے۔ عین میں "ر" کا نچلا حصہ کسی طرح محو ہو گیا۔

جائزہ ص ۳۲۶

الف ص ۲۲۴ پر مصرع ہے:

لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے

کمال صاحب کا کہنا ہے کہ عین ص ۸۹ پر اس مصرع میں "پہ" کی جگہ "بہ" ہے جس کا کوئی موقع نہیں اور جسے غالب نہیں لکھ سکتے۔ ان کی رائے میں الف میں "یہ" کو "بہ" بنا کر تحریف کی گئی ہے۔

کمال صاحب عجلت میں الزام عائد کر دیتے ہیں۔ اصل عکس میں بھی الف کی طرح "پہ" ہے۔ صرف یہ ہے کہ "پہ" کا تیسرا یعنی سب سے نیچے کا نقطہ بہت خفیف ہے۔ عین کے فوٹو میں رہ گیا اور بد احتیاطی سے فوٹوؤں میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ عین میں اس لفظ پر دو نقطے ہیں یعنی "یہ" لکھا ہے "بہ" نہیں۔

جائزہ ص ۳۵۲

الف ص ۲۴۲، اور عین ص ۹۸ کے حاشیے پر شعر ہے:

آتش افروزیِ یک شعلۂ ایماں تجھ سے
چشمک آرائیِ یک شہر چراغاں مجھ سے

مصنف کا یہ کہنا صحیح ہے کہ دونوں نسخوں میں شعر کا رخ ایک دوسرے کے برعکس ہے۔ میں نے بھی اپنے مضامین میں اس عجیب صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اصل عکس سے معلوم ہوا کہ عین میں شعر صحیح چھپا ہے الف میں اس کو دوبارہ سیٹ کیا اور الٹا سیٹ کر دیا۔

لیکن دونوں نسخوں میں قافیہ "چراغاں" درج ہے معلوم نہیں کمال صاحب کس بے خیالی میں اسے "خوشاں" پڑھ گئے اور اعتراض کر بیٹھے کہ یہ "چراغاں" کا موقع ہے "خوشاں" کا نہیں۔

ہوا یہ کہ الف کی نستعلیق قرأت میں سہواً 'خوشاں' چھپ گیا ہے۔ نقوش بابت جولائی ۱۹۷۰ء میں بیاضِ غالب کی تصحیح درج کی گئی ہے اور وہاں ص ۲۹ پر اشارہ کر دیا ہے کہ خوشاں کو چراغاں بنالیا جائے۔

جائزہ ص ۳۲۶

نقوش ص ۲۵۲، اور عین ص ۱۰۳ پر پہلا مصرع ہے۔

ع دو جہاں وسعت بقدرِ فضائے خندہ ہے

اعتراض ہے کہ نقوش میں 'دو جہاں وسعت'، پر بہت روشنائی گری ہے جب کہ عین میں بالکل صاف ہے۔ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ عین میں تحریف ہوئی۔ اصل عکس میں صورت یہ ہے کہ 'دو جہاں وسعت'، لکھا گیا ہے لیکن ہاتھ یا کپڑا وغیرہ لگنے سے گیلا ہی پنچھ گیا ہے جس سے روشنائی کسی قدر پھیل گئی۔ اس سے بڑا نقصان نہیں ہوا۔ ہر حرف کا خط اور کشش نمایاں ہے۔ عین میں اس معمولی سی پھیلی ہوئی روشنائی کو 'ری ٹچ' کر کے صاف کر دیا گیا ہے۔ الف میں کسی اناڑی فوٹو گرافر نے نہ معلوم کس طرح روشنائی کو پھیلا کر ایسا چوپٹ کر دیا ہے کہ لفظ پڑھے ہی نہیں جا سکتے۔ عین اصل کی بہتر ترجمانی کر رہا ہے بہ نسبت الف کے۔

جائزہ ص ۳۷۴

عین ص ۱۰۶ کے حاشیے پر ذیل کا شعر ہے:

اے پرتوِ خورشید جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

لیکن الف ص ۲۶ پر نہیں۔ لطف یہ ہے کہ نستعلیق کتابت میں ص ۳۵۷ پر دیا ہے۔ حقیقت وہی ہے جو عین میں ہے کہ پہلا مصرع پورا موجود ہے۔ دوسرا مصرع جلد بندی میں کٹ گیا ہے۔ اصل عکس میں پہلے مصرع کے صرف دو چار نقطے آگئے ہیں جب کہ الف میں وہ بھی نہیں۔

دونوں نسخوں کے ایک فرق کی میں نشاندہی کرتا ہوں جو مصنف نے نہیں کی۔ الف ص ۲۶۲ پر بہت سے لفظ پھیلے ہوئے ہیں اصل عکس میں اس سے کم ہیں جب کہ عین ص ۱۰۹ پر پورا صفحہ صاف ستھرا ہے۔ دو خاص فرق یہ ہیں۔

ع نغمہ ہا وابستۂ یک عقدۂ تارِ نفس

اصل عکس اور الف دونوں میں ایسا لگتا ہے کہ نفس کے س کے نیچے ایک یا دو نقطے لگا گئے تھے جنھیں کاٹا گیا ہے۔ عین میں صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام کو چھیلا گیا ہے۔ صفحے کے آخری دو مصرعے ہیں:

ع نوحۂ ماتم بہ آوازِ پرِ عنقا کرے
ع ہو تنورستاں طلسم حلقۂ گرداب ہا

پہلے مصرع میں 'ماتم بہ' اور دوسرے مصرع میں 'طلسم' اصل عکس میں کسی قدر مٹے ہوئے ہیں۔ الف میں اتنے مٹے ہیں کہ بہ اولِ نظر نہیں پڑھے جا سکتے۔ عین میں بالکل صاف ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں صاف کئے گئے ہیں۔

تکلّف برطرف ذوقِ زلیخا جمع کر ورنہ

الف میں 'زلیخا جمع'، پر روشنائی پھیلی ہوئی ہے جب کہ عین میں صاف ہے۔ اصل عکس میں حقیقت دونوں ایڈیشنوں کے بین بین ہے یعنی 'زلیخا جمع'، کی روشنائی برائے نام پھیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے 'خا جمع'، کے الفاظ زیادہ جلی (موٹے) لکھے ہوئے ہیں۔ عین میں انھیں 'ری ٹچ' کر کے قدرے صاف کر دیا ہے اور الف میں پھوہڑ پن سے روشنائی قدرے اور پھیلا دی ہے۔

جائزہ ص ۴۱۱ ۲۸۴

عین ص ۱۱۹ پر غزل: ع "تماشائے جہاں مفتِ نظر ہے" قلم زد ہے جب کہ الف ص پر نہیں۔ اصل عکس میں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ بہت ہلکے سے خط سے قلم زد ہے۔ عین میں یہ خط زیادہ گہرا ہے۔ الف میں معلوم نہیں کس طرح یہ خط بالکل محو ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں خ سے کئی منزل دور ہونے کی وجہ سے ہلکا خط فوٹو میں اوجھل ہو گیا ہے یا مٹایا گیا ہے۔

مصنف نے بار بار گرفت کی ہے کہ مخطوطے کا املا غالب کے مقرر کردہ املے سے مختلف ہے یا مخطوطے میں ایک لفظ کو دو جگہ مختلف انداز سے لکھا ہے اور ان کی بنا پر وہ مخطوطے کو وضعی قرار دیتے ہیں لیکن وہ یہ نظر انداز کر گئے ہیں کہ غالب نے املے کے اصول بہت بعد میں متعین کئے تھے۔ عمر کی جس ابتدائی منزل میں یہ مخطوط لکھا گیا اس میں وہ یکسانی متوقع نہیں۔ پھر مجھے یہ بھی اصرار ہے کہ ہر شخص ہر موقع

پر ایک لفظ کو ایک ہی طریقے سے نہیں لکھتا۔ میں کیجئے، چاہئے کو کبھی ہمزہ سے، کیجئے، چاہئے، کبھی یے سے کیجیے، چاہیے لکھتا ہوں۔ کبھی حرج تو کبھی ہرج، کبھی قطعہ کا، کبھی قطعے کا، لکھتا ہوں۔ شاید ابتدائے عمر میں غالب میں بھی یہ عدم استحکام ہو۔ پھر جنابِ مصنف نے سہو قلم کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہلکی سے ہلکی لغزش قلم کو بھی کاتب کی کم علمی کی دلیل قرار دیا ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون[1] کے مسودے کی قلمی لغزشوں کی فہرست مرتب کی تو آنکھیں کھل گئیں۔

جہاں تک اضافت کے لگانے یا نہ لگانے کا تعلق ہے اس میں دونوں امکانوں کی اجازت ہے اور یہ بخوبی ممکن ہے کہ مصنف یا کاتب ایک ہی تحریر میں کہیں اضافت لگائے کہیں نہ لگائے۔ لیکن کمال احمد صدیقی صاحب نے ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ پر بھی اضافت کی صورت میں بڑے التزام سے ہمزہ کا مطالبہ کیا ہے۔ ی پر ختم ہونے والے کسی لفظ میں اگر شاعر نے اضافت باندھی ہے اور مخطوطے یا نسخۂ عرشی میں درج نہیں تو شعر کو بڑے بے دھڑک انداز میں غیر موزوں قرار دے دیا ہے۔ یہ اڈیٹروں کی سی خردہ گیری برائے خردہ گیری ہے۔ اضافت تو اضافت واؤ عطف کو لکھنے کے معاملے میں بھی قدیم مخطوطات میں التزام نہیں برتا جاتا۔

غالب ابتداء سے کامل نہ تھے (میری رائے میں آخر میں بھی کامل نہ تھے) لیکن مصنف نے جہاں کسی شعر میں کوئی لفظی یا معنوی سقم دیکھا تو حکم لگا دیا کہ یہ غالب سے ممکن نہ تھا۔ غالب خدا نہ تھے۔ ان کے متداول دیوان میں کئی جگہ اور ان کے مستند قدیمی مجموعوں ق اور قا میں جگہ جگہ ہر قسم کے مبہم اور سقیم اشعار ملتے ہیں ان کو پیشِ نظر رکھا جائے تو نخ کے اشعار کو ان کے معنوی سقم کی بنا پر غالب کی رو سے خارج نہ کیا جائے گا۔ مصنف مخطوطے کے اشعار کو مہمل قرار دینے میں بہت فراخ دل ہیں۔ میں غالب کی تخلیقات میں صرف دو شعروں کے معنی میں الجھتا ہوں۔ پہلا نخ میں نو دریافت ہے اور ایک قطعہ

[1] دیوانِ غالب کے مخطوطے کی بحث۔ مشمولہ کتاب بابت اپریل، مئی ۱۹۷۱ء موجودہ مضمون کے مسودے میں نہ جانے کس بے خیالی میں مَیں نے مشہور مصرع یوں لکھ دیا: ع
صید زدام جستہ ہے نزدیک پژمردن۔ مضمون کو صاف کرتے ہوئے تصحیح کی: ع
صید زدام جستہ ہے اس دام گاہ کا

کا جزو ہے:

کہ ہم بیضۂ طوطیِ ہند غافل
تہِ بالِ شمعِ حرم دیکھتے ہیں

دوسرا نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی میں ہے:

اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسد
زور نسبت مے سے رکھتا ہے نصارا کا نمک

میرا دعویٰ ہے کہ مندرجہ بالا پہلے شعر کے علاوہ مخطوطے کا ایک بھی شعر موجودہ قرأت میں یا قلم زد قرأت میں نہ مہمل ہے نہ غیر موزوں۔ مصنف تو دریافت اشعار پر بڑی شیر دلی کے ساتھ مہملیت کا لگا دیتے ہیں۔ اس طریقے سے غالب کے متداول دیوان کے بھی آدھے حصے کو مہمل گردانا جا سکتا ہے۔ میں نے غالب کے غیر متداول کلام کی شرح لکھی جو 'تفسیرِ غالب' کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس کے مطالب سے اختلاف ممکن ہے لیکن اسے دیکھنے سے مصنف کو اندازہ ہو جائے گا کہ مخطوطے کا کوئی شعر مہمل نہیں ہے۔ یہ خاطر نشیں رہے کہ غالب کے دقیق کلام میں معنی کی اس صفائی کی توقع نہیں رکھنی چاہئے جو دوسروں کے یہاں عام ہے۔

بعض جگہ مصنف غالب کی مخصوص کج فکری سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے کسی ترکیب یا محاورے یا شعر کو بالکل غلط سمجھ بیٹھے ہیں۔ اس مضمون میں طوالت کے خوف سے میں عموماً مصنف کے اعتراضِ اہمال سے بحث نہیں کروں گا۔ ان مبینہ مہمل اشعار کے کوئی معنی میری شرح میں مل جائیں گے۔ ہاں جہاں مصنف کو کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے وہاں میں اشارہ کر دوں گا۔

مصنف کے تمام اعتراضات کا اگر ایک ایک کر کے جائزہ لیا جائے تو ڈر ہے کہ تقریباً اتنی ہی بڑی کتاب تیار ہو جائے۔ اس لئے میں خاص خاص اعتراض کو دیکھوں گا۔ ان میں املے کے اعتراضات کو عام طور پر نہیں لیا جائے گا۔ نیچے کے بیان میں شروع میں "تحقیقی جائزہ" کا صفحہ درج ہے اور مخطوطے کے شعر یا مصرعے کے لئے اوپر نقوش کے صفحے کا اور اس کے نیچے نسخۂ عرشی زادہ کے صفحے کا نمبر درج کروں گا۔ اس کے بعد اپنے الفاظ میں مصنف کے اعتراض کا خلاصہ درج کروں گا۔ آخر میں ت (تبصرہ) لکھ کر میں اپنی رائے پیش کروں گا۔

ص ۱۰ : دیوانِ غالب مرتبۂ مالک رام اور نسخۂ عرشی نوائے سروش میں ذیل کے مصرعوں میں قافیہ

تقویٰ، عیسیٰ چھپا ہے۔

ع گر نفسِ جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا

ع ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے بقول عربی عروض کے قاعدے سے تسلّی اور انفی کے ساتھ تقویٰ اور عیسیٰ کو الف سے پڑھ کر بھی قافیہ کیا جا سکتا ہے۔" میرزا یقیناً اس اصول سے واقف تھے لیکن ان کا دیوان مرتب کرنے والے بہت سے اہلِ علم حضرات اس سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں۔" تقویٰ لکھنا غلطی ہے۔

ت: عربی عروض (علمِ قافیہ) کا جو بھی قاعدہ ہو اُردو میں انفی کا قافیہ تقویٰ اور عیسیٰ غلط ہے اور تقوی اور عیسیٰ صحیح۔ اعتراض میں نسخۂ عرشی کے ص ۲۴۴ کا حوالہ دیا ہے ۲۴۴ ہونا چاہیے۔

ص ۲۳: ع سرشک اگیں مژہ سے دست از جاں شستہ بررو تھا۔ ۵۴/۴

شروع کے قلم زد الفاظ پڑھنا ممکن نہیں لیکن دونوں مرتبین نے یکساں الفاظ پڑھے۔ "مژگانِ نم اگیں دست... یہ اتفاقِ قرأت شبہ پیدا کرتا ہے۔

ت: مرتب عین نے قیاساً پڑھے مرتب الف نے ان کی بات دہرادی۔

ص ۴۲: شرارِ فرصتے سرمایۂ چندیں چراغاں ہے

بقدرِ رنگ یہاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا ۶۲/۱۲

اُوپر پہلے مصرع کا قلم زد متن دیا ہے جسے بعد میں بدل دیا گیا۔ قلم زد قرأت پر اعتراض ہے کہ یہاں فرصتے غلط ہے، فرصتِ، باضافت چاہیے۔ دوسرا اعتراض ہے کہ چندیں یعنی چندایں چراغاں جیسی ترتیب غالب نہ لکھتے۔

ت: فرصتِ، بے معنی ہوتا۔ فرصتے بامعنی ہے۔ قلم زد شعر کے معنی یہ ہیں۔ زندگی کی ذرا سی فرصت کے شرر سے دُنیا میں اتنا چراغاں ہے۔ محفل میں جتنا رنگِ مے میسر ہے اسی کے بقدر پیمانہ گھوم رہا ہے۔ یعنی زندگی کے آنی و فانی ہونے کے باوجود دُنیا میں اتنی رونق ہے۔

چندیں، کسی معمولی فارسی لغت میں دیکھ لیجیے 'اتنا، کے معنی دیتا ہے۔

ص ۴۵: خطوطِ روئے قالیں نقش ہے پشتِ کبوتر کا۔ ۶۲/۱۲

کیا غالب خطوط کے ساتھ واحد فعل 'ہے' باندھتے!

ت: آپ نے مبتدا کی تعیین صحیح نہیں کی۔ مصرع کی نثر ہے:

پشتِ کبوتر کا نقش خطوطِ روئے قالیں (کی طرح) ہے۔

ص ۵۳: الف ۸۲، اور عین ص ۱۸ پر ایک غزل سے پہلے ایک نشان ہے جسے مرتب عین نے غالب کی دستخطی شکل قیاس کیا ہے۔ اس سے مصنف نے نتیجہ نکالا کہ اگر متنِ خ کی کتابت کے دوران شاعر نے غالب تخلص اختیار کر لیا تھا تو متن میں اسد تخلص کا التزام کیوں؟

ت: اعتراض بجا ہے۔ کون جانے اس نقش کے کیا معنی ہیں۔ کم از کم غالب کی کسی تحریر میں اس طرح کے دستخط دیکھنے میں نہیں آئے۔

ص ۵۵: بوسۂ لب سے ملی طبع کو کیفیتِ خال۔ ۸۲/۱۸

لب حشو ہے۔ کیونکہ بوسے کے معنی ہونٹوں کا بوسہ ہی ہوتے ہیں۔

ت: میرے لیے یہ اطلاع نئی ہے کہ بوسے کے مفہوم میں لب کی تخصیص ہے۔ لغت کے مطابق بوسہ کے معنی مطلق چومنا، پیار کے ہیں۔

ص ۶۶: بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی اسد ۹۰/۲۲

دَے نے برباد کیا پیرہنستاں میرا

یہی شعر نسخۂ عرشی میں ص ۲۱ پر ہے۔ دی یا دے یہاں بے معنی ہے سہو ہے۔ حیرت ہے کہ نسخۂ عرشی کے غلط نامے میں اسے صحیح کیوں نہیں کیا گیا۔ یہ وَے (اس جیسا، اس جیسے) ہونا چاہیے۔

ت: یہاں دے ہی ہے۔ دَے کے معنی دسویں شمسی مہینے کے علاوہ مجازاً خزاں کے بھی ہوتے ہیں۔ شعر کے معنی تفسیرِ غالب میں دیکھ لیجیے۔ مجوزہ لفظ 'وَے' بالکل بے محل اور اجنبی ہے۔ الف کی نستعلیق کتابت میں ص ۹۱ پر 'پیر ہنستاں' میں اضافت محض سہوِ کاتب ہے۔ ممکن ہے 'ہنستاں' کے ن کے نیچے زیر لگانا مقصود ہو۔ الف کا مرتب اتنا کم علم نہیں۔ مصنف نے خواہ مخواہ ایک داستان تلاش کی۔ بہرحال نقوش بابت جولائی ۱۹۷۰ء بیاضِ غالب کا صحت نامہ چھپا ہے اور وہاں اشارہ کر دیا ہے کہ 'پیر ہنستاں' میں اضافت غلط لکھی گئی ہے۔

ص ۴۷: نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب طباعت کا سال ۱۳۴۷ھ (۱۹۲۸ء) ہے۔

ت: طباعت کا سال ۱۹۲۱ء ہے۔

ص ۴۷، تا ۴۸ ۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے از خود دریافت کیا کہ دم چند رہا۔ ۔ ۔
والی غزل میرامانی اسد کی ہے جو تذکرہ ہمیشہ بہار میں اسد کے نام سے درج ہے چنانچہ اخبار آئینہ سری نگر کی ۳۰ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں ان کی اس دریافت کی اطلاع دے دی گئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر انصار اللہ نظر بھی اسی نتیجے پر پہنچے لیکن ان کی تحریر یکم نومبر ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں چھپی۔

ت: ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے اس غزل کی دریافت کی اطلاع سب سے پہلے ۱۵ ستمبر ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں دی۔ بعد میں یکم نومبر ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں ایک مفصل مضمون کے ضمن میں وہی بات دہرائی گئی ہے چونکہ ڈاکٹر نظر نے پہلے اعلان کیا اس لئے غزل کی دریافت کا سہرا انھیں کے سر رہے گا۔ ویسے مجھے یہ ماننے میں کوئی تکلف نہیں کہ کمال صاحب نے انصار اللہ نظر سے الگ اپنے طور پر ہمیشہ بہار میں یہ غزل تلاش کی۔

لیکن 'ہماری زبان' بابت یکم نومبر ۱۹۷۰ء میں بیگم حمیدہ سلطان کا مراسلہ بھی دیکھنا چاہیئے جس میں انھوں نے قاضی عبدالودود کی یہ رائے نقل کی ہے کہ گلشن ہمیشہ بہار کا مؤلف نہایت غیر محتاط ہے اور ایک شاعر کا کلام دوسرے کی طرف منسوب کرنا اس کے لئے معمولی بات ہے۔ چنانچہ اس نے سودا اور شاہ نصیر کے اشعار دوسروں کی طرف منسوب کئے۔ کیا ایسے تذکرے کو سند مانا جائے۔

ص ۷۹۔ مسعود حسن رضوی صاحب کے قول کے مطابق 'دم چند'، 'غم چند' والی غزل میں کسرۂ اضافت کی جگہ یائے تنکیر چاہئے۔ غالب ایسی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے مخطوطہ غالب کے ہاتھ کا لکھا نہیں ہو سکتا۔

ت: اس سلسلے میں یکم نومبر ۱۹۷۰ء کے 'ہماری زبان' میں ڈاکٹر انصار اللہ نظر کا یہ بیان بھی پیش نظر رکھا جائے کہ میر علی اوسط رشک کے دیوان میں اس زمین میں دو غزلہ ہے اور قافیے بھی 'صنم چند'، 'دم چند' وغیرہ ہیں۔ "میر رشک صاحب علم شخص تھے اور کم از کم اردو میں ان کی حیثیت مسلم الثبوت کی ہے۔ انھوں نے 'دے چند'، 'غے چند' نہیں لکھا۔"

واضح ہو کہ رشک ایک فارسی لغت کے مرتب بھی ہیں۔

دم چند والی غزل سے قطع نظر مصنف نے پوری کتاب میں دسیوں جگہ یہ اصول بنا لیا ہے کہ

جہاں مضاف الیہ حرفِ جار کا فقرہ ہو وہاں یائے تنکیر ہی صحیح ہے، اضافت غلط۔ چنانچہ انھوں نے کتاب کے حسب ذیل صفحات پر اس قسم کی ترکیبوں پر اعتراض کیا ہے۔

۲۹ صید زدام جستہ ہے اس دام گاہ کا
۱۳۸ رنگِ ز نظر رفتہ حنائے کفِ افسوس
۲۲۴ برقِ بجانِ حوصلہ آتش فگن اسد
۲۳۵ تنِ بہ بندِ ہوس درندادہ رکھتے ہیں
دلِ زکارِ جہاں اوفتادہ رکھتے ہیں
۲۴۹ گلُ از شاخ دور افتادہ ہے نزدیک پژمردن
۳۰۶ دیکھتے ہیں چشم از خوابِ عدم نکشادہ سے
۳۵۶ گریہ سرشاریِ شوق بہ بیاباں زدہ ہے
۳۸۳ یک درِ روئے رحمت بستہ دور شش جہت
۴۰۸ نظر دانہ سرشکِ بزمیں افتادہ آتا ہے

مصنف کے نزدیک ان سب مثالوں میں کسرۂ اضافت ایسی فاحش غلطی ہے کہ غالب ہرگز نہ کر سکتے تھے۔ ان کے نزدیک سب میں یائے تنکیر چاہئے۔ مجھے تسلیم ہے کہ یائے تنکیر بھی صحیح ہوگی، لیکن کسرۂ اضافت بھی کسی طرح غلط نہیں۔ ان سب ترکیبوں میں اضافتِ توصیفی ہے۔ یہ فقرے مضاف مضاف الیہ کی بجائے موصوف وصفت ہیں۔ ان توصیفی فقروں کی جگہ اگر ایک لفظی ہم معنی صفت لانا غلط نہیں تو فقروی صفت کیوں غلط ہوگی۔ اگر گلِ شکستہ (یا گلِ پژمردہ) چشمِ خوابیدہ اور سرشکِ افتادہ میں کوئی قباحت نہیں تو گلِ از شاخ دور افتادہ، چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ، سرشکِ بزمیں افتادہ میں کیا برائی ہے۔

ع دیکھتے ہیں چشمے از خوابِ عدم نکشادہ سے، میں چشمے کی یے گرتی ہے اور عربی فارسی الفاظ کی یے گرانا جائز نہیں۔ اس لئے اس مصرع میں یائے تنکیر نہیں آ سکتی۔ 'یک درے' میں یک اور یائے تنکیر دونوں کا میل نہیں ہو سکتا۔ 'درے' کے معنی ہیں 'ایک در'، یا کوئی در۔ اس کے ساتھ مزید 'یک' کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اگر شاعر نے چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ 'یک در بروئے رحمت

بستہ، جیسی ترکیبیں استعمال کی ہیں تو مندرجہ بالا مصرعوں کی ترکیبیں بھی اسی کے حسبِ منشا آئی ہوں گی۔ کسرۂ اضافت کی یہ ترکیبیں ان مستند مخطوطوں اور ایڈیشنوں میں ملتی ہیں جو غالب کی نظر سے گزر چکے ہیں تیز بیسویں صدی کے ان ایڈیشنوں میں بھی ملتی ہیں جنھیں مالک رام اور عرشی صاحب جیسے عالم مرتب کر چکے ہیں۔ غالب کے متداول دیوان کو حسرت موہانی اور نظامی بدایونی جیسے عالموں نے مرتب کیا اور اس کی نہ معلوم کن کن جید علما نے شرح لکھی اور سبھی نے 'صیدِ زدام جستہ' جیسی ترکیب کو کسرۂ اضافت کے ساتھ قبول کر لیا۔ لیکن حیرت ہے کہ مصنف ص ۸۷ پر مخطوطے کے اس مصرع پر اعتراض کرتے ہیں۔

ع اسد کے واسطے رنگِ بروئے کار ہو پیدا۔ کہتے ہیں کہ یہاں رنگ بروئے کار ہونا چاہئے۔ یا تذکیر کی غلطی غالب نہ کر سکتے تھے۔

سمجھ میں نہیں آتا مصنف یہاں اپنی پیش کردہ نظیروں سے انحراف کیوں کر گئے۔ روئے کار یا روکار ایک لفظ ہے، ریشم یا کسی دوسرے کپڑے کے سیدھے رُخ کو کہتے ہیں۔ اس لئے یہاں نہ مضاف مضاف الیہ کا رشتہ ہے نہ موصوف صفت کا۔ اگر 'یہ' نہ ہوتا تب 'رنگِ روئکار' ہو سکتا تھا۔ اب 'رنگِ بروئکار' ہے یعنی روئکار پر رنگ۔

ص ۸۵ ہے اسد بیگانہ کو افسردگی کو بے کسی

دل زگرمی تپاک اہلِ دنیا بھی گیا $\frac{96}{25}$

مصرع اول جیسا مصرع میرزا کا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ دو عدد 'کو' سخت تنافر پیدا کرتے ہیں۔

ت: مصرع میں 'کو' اردو کا حرفِ جار نہیں فارسی کا استفہامیہ ہے بمعنی کہاں۔ مصرع یوں پڑھئے ع اسد بیگانہ، کو افسردگی ؟ کو بیکسی ؟ معنی ہیں اسد بے گانہ، بے نیاز اور رواقی ہے کہاں کی افسردگی اور کیسی بیکسی۔ غالب نے اس 'کو' کا استعمال دوسری جگہوں پر بھی کیا ہے۔ مثلاً نسخۂ عرشی ص ۶:

کو تیزیِ رفتار ؟ کہ صحرا سے زمیں کو | جوں قمریِ بسمل، تپش آہنگ نکالوں

ص ۹۰ سحر گر باغ میں وہ حیرتِ گلزار ہو پیدا

اڑے رنگِ گل اور آئینۂ دیوار ہو پیدا $\frac{99}{26}$

نسخۂ عرشی میں سحر گہ ہے۔ شعر پر دو اعتراض ہیں۔ اول تو یہ کہ ح، ق، تا، نسخۂ عرشی سب میں قافیہ دیوار غلط ہے کیونکہ اس کے ساتھ شعر مہمل ہے۔ صحیح لفظ 'دبوار' (با کے ساتھ) ہونا چاہئے۔

دبوار یا دبور مغربی ہوا کو کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ 'دیوار' قافیہ تسلیم کرنے کے معنی 'حیرتِ گلزار' سے معشوق مراد لیا جائے گا۔ "باغ میں صبح کے وقت معشوق کے پیدا ہونے کی تمنا نہایت لغو ہے۔ نومولود کبھی معشوق نہیں ہو سکتا۔"

ت: مصنف کے نزدیک پیدا ہونے کے معنی محض ولادت کے ہیں لیکن اس لفظ کے ایک دوسرے معنی ظاہر ہونا بھی ہیں۔ آئینۂ دیوار، اس آئینے کو کہتے ہیں جو دیوار پر نصب ہو۔ شعر کے معنی تفسیرِ غالب میں دیکھ لیجئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس شعر کی شرح کرتے وقت میں نے الف یا جیم کو دیکھے بغیر لکھا ہے کہ "پہلے مصرع میں گر کی ضرورت تھی، ممکن ہے 'گہ'، دراصل 'گر' رہا ہو۔"

دبوار ایسا اجنبی لفظ ہے کہ اردو ادب میں کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔

ص ۹۵۔ ہے عرق افشاں مشی سے ادہمِ مشکینِ یار

وقتِ شبِ اختر شمر ہے چشمِ بیدارِ رکاب

شعر کے معنی پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ پیدل چلنے سے یار کی زلفیں کیوں عرق افشاں ہیں۔

ت: ادہم کے معنی مشکی گھوڑا ہے۔ معلوم نہیں مصنف نے زلفیں کیوں کر سمجھ لیں۔ محبوبِ حقیقی کا سیاہ گھوڑا رات بھر چلتا رہتا ہے۔ اس کے پسینے کی بوندیں تارے ہیں جنھیں رکاب کی چشمِ بیدار رات بھر گنتی رہتی ہے۔

ص ۹۷ دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست $\frac{102}{28}$

متداول دیوان میں اس کا پہلا مصرع ہے ع آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست۔

عرشی صاحب نے اختلافِ نسخ میں اس مصرع کے سلسلے میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے۔

"اس غزل میں صرف یہی ایک مصرع نسخۂ بھوپال کا باقی رہ گیا ہے۔"

اگر ان سے سہو نہیں ہوا تو دوسرا مصرع ع دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست، نسخۂ بھوپال کا نہیں یعنی ۱۲۳۷ھ بعد کا ہے۔ پھر ح میں کیوں کر آیا۔

ت: نسخۂ عرشی کا نوٹ بہت واضح نہیں۔ نسخۂ حمیدیہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مندرجہ بالا نوٹ ع 'دودِ شمعِ کشتہ... دوست' کے بارے میں ہے کیونکہ متداول دیوان میں نسخۂ بھوپال کی اس غزل کا یہی مصرع باقی رہ گیا ہے۔

ص ۱۱۸ اے اسد ہے ہنوز دہلی دُور ۱۶۱/۳۵

نسخۂ بھوپال میں محاورے کے مطابق 'دلّی' ہے، یہاں 'دہلی' کیوں۔ یہ غالبؔ کی تحریر نہیں ہو سکتی۔

ت : واقعی کہاوت میں دلّی ہی ہے اور مصرع میں دہلی حیران کُن ہے لیکن غالبؔ عمر کے ہر دَور میں دلّی کے علاوہ دہلی بھی لکھتے تھے۔ ق میں شعر ہے:

دہلی کے رہنے والو اسدؔ کو مت ستاؤ — بے چارہ چند روز کا یہاں مہمان ہے

قا میں دہلی کو بدل کر دلی کیا۔ اور آپ کی کتاب جائزہ میں صفحہ ۵ پر جو فارسی خط کا عکس ہے اس میں بھی چوتھی سطر میں "و در نہاد مردمِ دہلی نیست" لکھا ہے۔ مرقعِ غالبؔ مرتبہ پرتوی چندر میں آخری خط پر غالبؔ کے قلم سے دہلی ۲۱ جون ۱۸۶۸ء درج ہے نیز نواب کلبِ علی خاں کے نام ۲۲ شعبان ۱۲۸۲ھ کا مشہور خط ہے جس میں رام پور سے دہلی لوٹتے وقت اپنے مراد آباد میں بیمار پڑنے کا ذکر ہے۔ اس خط میں ایک فارسی شعر میں دہلی باندھا ہے:

از رام پور زندہ بہ دہلی رسیدہ ست — مارا بدہر گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود

ص ۱۳۸ ع اے اسد گل تختۂ مشقِ شگفتہا ہو گئے ۱۳۰/۴۲

مصرع ساقط الوزن ہے۔ میرزا اپنا کیا کسی کا مصرع ناموزوں نہیں لکھ سکتے تھے۔

ت : یہ زبردستی کا اعتراض ہے۔ پہلی قرأت تھی ع اے اسد گل تختۂ مشقِ شگفتن ہا ہوئے۔ بعد میں اسے 'شگفتن ہو گئے' بنا دیا۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ 'ہوئے' کی ے کو گئے بنا دیا ہے۔ الف کی تصریحات میں اشارہ ہے لیکن وہاں ہوئے کو سہواً 'ہوائے' چھاپ دیا ہے۔

ص ۱۳۸ کرتا ہے بیادِ بُتِ رنگیں دلِ مایوس

رنگِ ز نظر رختہ خائے کفِ افسوس ۱۳۰/۴۲

پہلا اعتراض ہے کہ 'رنگے' ہونا چاہیے۔ پھر کہا ہے کہ میرزا لکھتے تو یوں لکھتے:

ع رنگ از نظرِ رفتہ خائے کفِ افسوس

ت : رنگِ ز نظر رفتہ سے معنی بہت چُست ہیں۔ لیکن نظرِ رفتہ سے تعقید ہو جائے گی۔ معنی ہیں "وہ رنگینیاں جو ماضی میں صحبتِ بُتِ رنگیں میں تھیں اب یاد کے کفِ افسوس

ملتے وقت خاکی کا یعنی حافظ کی رونق کا کام دے رہی ہیں۔

ص ۱۳۹ حیرت سے رخِ دوست کی ہیں از بس بیکار ۱۳۲/۴۳

کہا گیا ہے کہ یہ 'از بسکہ ہیں بیکار' کی تخریب ہے۔ لیکن لغزشِ قلم میں لفظ چھوٹ سکتا ہے اول بدل نہیں ہو سکتا۔

ت : لغزشِ قلم کی بات بجا ہے لیکن فارسی داں غور کریں کہ اصلاً مصرع 'از بس بیکار' تو نہیں تھا؛ 'از بس' کے معنی ہیں 'بہت'؛ کیا اسے اضافت کے ساتھ لایا جا سکتا ہے۔ اگر لایا جا سکتا ہے تو وزن اور معنی دونوں محفوظ رہ جائیں گے۔ لیکن ظاہراً اس اضافتِ مقلوب کی اجازت نہیں۔

ص ۱۴۳ کرے ہے لطفِ اندازِ برہنہ گوئی خوباں

زور بالیدنِ مضمونِ سطرِ شعلہ یاد، آتش ۱۳۴/۴۴

اعتراض ہے کہ مخطوطے میں مفہوم 'ستر' کا ہے لیکن املا سطر لکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ مخطوطے نیز نسخۂ عرشی وغیرہ میں برہنہ گوئی غلط معلوم ہوتا ہے۔ صحیح 'برہنہ پائی' ہوگا۔

ت : برہنہ گوئی فارسی محاورہ ہے جس کے معنی ہیں، کھری کھری باتیں سُنانا۔ شعر میں سطر ہی مراد ہے ستر نہیں۔ مصنف 'برہنہ' کا لفظ دیکھ 'ستر' سمجھ بیٹھے۔ معنی ہیں 'آتشِ مضمونِ سطرِ شعلہ کو بالیدہ کرتے وقت خوبوں کے اندازِ برہنہ گوئی کی یاد کرتی ہے':

ص ۱۴۴ اسدؔ قدرت سے حیدر کی پڑی ہر گبر و ترسا کے

شرارِ سنگ بُت سے در بنائے اعتقاد آتش حوالہ ایضاً

اعتراض ہے کہ 'ہر' کی جگہ 'ہے' ہونا چاہیے۔ ق کا مصرع مصنف نے یوں لکھا ہے:

ع شرارِ سنگِ بُت ہے در بنائے اعتقاد آتش

ت : 'ہر' کی جگہ 'ہے' کیوں ہونا چاہیے، یہ اعتراض میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ق کے مصرعِ ثانی میں 'بُت' کے بعد 'ہی' ہے یعنی:

ق شرارِ سنگِ بُت ہی در بنائے اعتقاد آتش

اور قا شرارِ سنگِ بُت بہر بنائے اعتقاد آتش

ص ۱۴۹ ا : در حالتِ تصوّرِ رُوئے بتاں اسدؔ، دکھلائے ہے مجھے چمنِ لالہ زارِ داغ ۱۳۶/۴۵

غالبؔ کا املا 'دکھاوے'، 'تھا' 'دکھلائے' نہیں۔ کمال احمد صاحب نے اسی مخطوطے سے اس قسم کی کئی مثالیں دی ہیں جن میں 'جاوے' وغیرہ لکھا ہے۔

ت : عرض یہ ہے کہ اسی مخطوطے یا دوسرے نسخوں میں آئے، جائے وغیرہ جہاں فعِلن (بسکونِ عین) کے وزن پر ہیں وہاں غالبؔ نے آوے، جاوے لکھا ہے۔ لیکن جہاں فاع کے وزن پر ہیں وہاں آئے جائے ہی لکھا ہے۔ کسی بھی نسخے یا ایڈیشن کو دیکھ لیجئے۔

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ   کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

یا ع   دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے' والی غزل کی ردیف زیرِ اعتراض مصرع میں نسخۂ عرشی میں بھی 'دکھلائے ہے' لکھا ہے۔

ص ۱۵۱ -   گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا / گھر پڑا غیر کے نہ کوئی شرار حیف $\frac{138}{46}$

کسی مجہول نے شعر پر اصلاح دی ہے۔

ت : محض لغزشِ قلم ہے۔

ص ۱۵۲ -   پائی جگہ کے بھی تو دل میں ہو کر غبار حیف   ایضاً

کیا غالبؔ سے یہ سہو ہوتے!

ت : یہ بھی محض لغزشِ قلم ہے۔ اگر غالبؔ ایسے مصرع نہیں سکتا تو وہ مبینہ جعل ساز بھی نہیں کہہ سکتا جس نے ایسے عالمانہ اشعار کہے ہیں۔ مصنّف کی کتاب میں بھی اغلاطِ کتابت ہیں۔ مثلاً ص ۱۲۶، ۱۳۱، ۳۹۳، پر مالک رام کی بجائے 'سالک رام' چھپا ہے۔ ص ۱۵۹ پر ہے۔

"یہ تو غیر مردف اور لین ردیف وار بیاض بنائی جا رہی تھی"

غیر مردّف بھی، اور ردیف وار بھی۔ ان اغلاط کی وجہ سے ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ کمال احمد صدیقی ایسی غلطیاں نہیں کر سکتے اس لئے یہ کتاب کسی مجہول کی تصنیف ہوگی۔

ص ۱۵۲ -   دیتا اسد میں سرمہ بچشم رکابِ یار   حوالہ ایضاً

سر پر ٹوپی دی جاتی ہے۔ منہ میں لگام دی جاتی ہے، آنکھوں میں سرمہ نہیں دیا جاتا۔ سرمہ دینا کوئی زبان نہیں۔ میرزا، 'دیتا' نہیں لکھ سکتے تھے۔

ت : متقدمین کی طرح غالبؔ نے متعدد فارسی محاوروں کا لفظی ترجمہ کر لیا ہے۔ فرہنگِ

آنند راج میں دیکھئے۔ 'سرمہ بچشم دادن' محاورہ ہے جس پر یہ نوٹ ہے کہ یہ ہندوستانی فارسی نویسوں سے مخصوص ہے۔ اہلِ ایران کے یہاں نہیں ملتا۔

ص ۱۵۴ -   یک بختِ اوج، نذرِ سبک باری اسد $\frac{142}{48}$ نسخۂ عرشی ص ۵۱

سبک باری پر اضافت نہ لگانے سے مصرع غیر موزوں ہو گیا ہے اور ناموزوں مصرع غالبؔ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ 'سبک باری اے اسد' ہو اعتراض خواہ مخواہ کی سخت گیری ہے۔ 'اے' کی کوئی ضرورت نہیں۔ مصنّف نے بخت پر جو کسرۂ اضافت لگا ہے وہ بھی غلط ہے۔ 'یک بخت اوج'، غالبؔ کی مخصوص مقداری ترکیب ہے۔ 'یک شہر آرزو'، 'یک بیاباں ماندگی'، 'یک جہاں زانو تامل' جیسی۔

ص ۱۵۹ .   ناسازیِ نصیب و درشتیِ غم ہے ہے   امید، ناامیدی و تمنا شکستہ دل $\frac{144}{49}$

نسخۂ عرشی میں نصیب اور درشتی کے بیچ واؤ عطف نہیں۔ مخطوطے میں یہ حرف الحاقی ہے۔

ت : یہ غزل رخ اور ق کے بعد نہیں ملتی۔ ق کے دونوں ایڈیشنوں یعنی نسخۂ حمیدیہ بھوپال اور نسخۂ حمیدیہ لاہور میں واؤ عطف موجود ہے معلوم نہیں عرشی صاحب نے کیوں کر حذف کر دیا لیکن اختلافِ نسخ میں نہیں دیا۔ افسوس کہ میں نے اپنی شرح میں بدونِ واؤ عطف، ہی معنی لکھے ہیں حالانکہ واؤ عطف کے ساتھ شعر بہت صاف ہو جاتا ہے۔

ص ۱۶۰ -   گر بہ بزمِ باغ کھینچا چاہے نقشِ روئے یار
شمع ساں ہو جائے زنگِ خامۂ بہزاد گل $\frac{146}{50}$

بہزاد تو بہزاد مرزا کے زمانے میں بھی لوہے کے قلم کا عام رواج نہ تھا۔ بہزاد تو برش استعمال کرتا تھا۔ زنگ کہاں سے آگیا۔ شعر الحاقی ہے۔ نسخۂ عرشی میں قطِ خامہ ہے۔

ت : اعتراض بہت باوزن ہے۔ ذرا سا شبہ ہوتا ہے کہ کہیں 'زنگ' کی بجائے 'رنگ' تو نہیں۔ ر پر نقطہ وہ فاضل دھبّہ نہ ہو جیسے اس نسخے میں عام ہیں۔ ویسے معنی کے لحاظ سے گل اور زنگ میں یک گونہ مناسبت ہے۔

اسی کے ساتھ لیجئے ذیل کا شعر:

ص ۴۰۴   سخن تاریک طبعوں کا ہے اظہارِ کثافت
کہ زنگِ خامۂ فولاد مانائے سیاہی ہے $\frac{280}{117}$

غالب کے زمانے تک لوہے کے قلم کا رواج عام نہ تھا۔ خود غالب نے لوہے کا قلم کبھی استعمال نہیں کیا۔

ت: اعتراض یہاں بھی باوزن ہے۔ اس کی یہی تاویل ہو سکتی ہے کہ گو غالب نے خود لوہے کا قلم استعمال نہیں کیا لیکن انگریزی لکھنے والوں کے پاس دیکھا ضرور ہوگا اور اسے محض دیکھ کر بھی شعر کہہ سکتے تھے۔ چونکہ لوہے کا قلم اس زمانے میں غیر معمولی چیز تھی اس لئے صراحت کے ساتھ "خامۂ فولاد" کہا۔ آج کل قلم کہنے سے دھات کی نب والا قلم ہی مراد لیا جاتا ہے۔ کوئی واسطی یا سرکنڈے کے قلم کا ذکر کرے تو آج کل محض قلم نہیں کہے گا بلکہ واسطی یا نرکل کا قلم کہے گا۔

ص ۱۶۳ ہے گرہ بر کیسۂ درہم خیالِ تنگ دل ۱۴۶/۵

کیسہ جیب کو کہتے ہیں۔ اس میں گرہ کیسے لگائی جا سکتی ہے۔

ت: کیسہ کے بنیادی معنی تھیلی کے ہیں جس میں گرہ لگائی جا سکتی ہے۔

ص ۱۶۴ ہے بخوابِ سبزہ از جوشِ خمارِ بنگ دل

"بخوابِ سبزہ" بے معنی ترکیب ہے۔

ت: معنی ہیں "جس طرح سبزے کا خواب ہوتا ہے میں بھی بھنگ کے نشے میں اسی طرح خوابیدہ سا ہوں۔

ص ۱۶۵۔ بہار در گرہِ غنچہ، شہر جولاں ہے طلسمِ ناز بجز تنگیِ قبا معلوم ۱۴۸/۵۱

ق، قا ہیں، "گرو" ہے۔ گرہ اصلاح معکوس ہے یا کتابت کی غلطی۔

ت: معنی کے لحاظ سے گرہ "گرو" سے بہتر ہے۔

ص ۲۱۴ نظارۂ و خیال کا ساماں کئے ہوئے ۲۱۸/۸۹

ص ۲۵۱ نغمۂ و چنگ میں جوں تیر و کماں فہمیدن ۱۷۶/۶۶

ص ۳۴۲ بہارِ نالۂ و رنگینیِ فغاں تجھ سے ۲۳۶/۹۵

نظارہ، نغمہ، نالہ پر ہمزۂ اضافت بھی ہے اور واؤ عطف بھی غالب یہ غلطی نہیں کر سکتے تھے۔

ت: نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ انوار الحق میں بھی "نالہ و رنگینی" میں نالہ پر ہمزہ ہے۔ فارسی قواعد کی رو سے یہ غلطی ہے لیکن اردو تلفظ کی رو سے صحیح۔ ہائے مختفی اردو میں عموماً الف ساکن کی آواز دیتی ہے۔

اضافت کی طرح عطف میں بھی اسے الف متحرک کے برابر کر دیا جاتا ہے اور اس تحریک کے اظہار کے لئے ہمزہ کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ آخر اردو میں وصلی ہمزہ کم و بیش الف متحرک کی آواز دیتا ہے۔ "شعلۂ گل" میں پہلے لفظ کا تلفظ ہے [شع لَ اِ ے] یعنی کسرۂ آخر یائے مجہول کا کام دیتی ہے اور اس سے پہلے الف کے لئے ہمزہ کا استعمال ہوا ہے۔ یہی صورت واؤ عطف کے ساتھ ہے۔ وہاں ہائے مختفی کی تحریک کے لئے میری رائے میں اردو میں ہمزہ لگانا چاہیے تاکہ املا تلفظ کی بہتر ترجمانی کر سکے۔ ہمزہ کے بغیر نغمہ و چنگ کا تلفظ "نغماو چنگ" ہو جائے گا۔ کیا عجب ہے کہ غالب اضافت کی طرح عطف سے پہلے بھی ہمزہ لگانا پسند کرتے ہوں۔

ص ۲۲۳ ترے سرودِ رعنا تے ایک قدِ آدم ۱۵۶/۵۵

رعنا میں نون غنہ شامل کر کے لکھا ہے جس کے معنی مخطوطہ بخطِ غالب نہیں نقوش اکتوبر ۱۹۶۹ء میں غالب کے قلم کی گلِ رعنا کے کچھ صفحات چھپے ہیں ان میں رعنا کے صحیح ہجے لکھے ہیں۔

ت: رعناں کی کافی بحث رسائل میں ہو چکی ہے۔ عرشی زادہ کی یہ تاویل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ رے پر دو فاضل نقطے لگ گئے ہیں جو اس مخطوطے میں جا بجا ہیں۔ "گلِ رعنا" میں جانے کی ضرورت نہیں۔ اس مخطوطے کے کاتب کو بھی گلِ رعنا کے صحیح ہجے آتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اس قامتِ رعنا کی جہاں جلوہ گری ہے ۲۵۸/۱۰۷

جموں یونیورسٹی کو نسخۂ عرشی زادہ کی جو کاپی فراہم کی گئی ہے اس میں رعنا کے فاضل نقطے چھلے ہوئے ہیں۔ یعنی املا صحیح کر دیا گیا ہے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔

ص ۲۳۹ پرِ طوطی ہے قفلِ زنگ بستہ آئینہ خانے میں ۱۶۸/۹۱

اس قلم زد مصرع میں الف کی نستعلیق کتابت میں "بستہ" ہی چھپا ہے لیکن تصریحات میں "بست" پڑھنے کی مضحکہ خیز کوشش کی گئی ہے۔

ت: نستعلیق کتابت میں "کہ طوطی قفلِ زنگ بستہ" بالکل غلط لکھا ہے۔ تصریحات کی قرأت صحیح ہے۔ ۲۔ پرِ طوطی ہے قفلِ زنگ بست ــــــ

زنگ بستہ کی جگہ "زنگ بست" لانا عجز ہے اس لئے اصلاح کی گئی لیکن زنگ بست کی طرح زنگ بست بھی غلط نہیں ہونا چاہئے۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ اصلاً "بست" لکھا تھا، بستہ نہیں۔

ص ۲۴۰ اسد اے عجز ابروے مہ نو حیرت ایماں ہے حوالہ ایضاً

یہ مصرع نامعقولیت کی اچھی مثال ہے۔ الف میں اسے 'آں' پڑھنے کی مضحکہ خیز کوشش کی گئی ہے۔

ت: یہ سہوِ قلم ہے۔ کوئی شاعر خواہ وہ جعل ساز ہی کیوں نہ ہو یہاں اے نہیں کہہ سکتا۔ 'آں' نہیں تو 'ایں' کہا ہوگا۔ بے خیالی میں 'اے' لکھا گیا۔

ص ۲۴۲   تماشا کر دتی ہے لطفِ زخمِ انتظارِ دل   ۱۷۰/۶۲

سوادِ داغِ مرہم، مردمک ہے چشمِ سوزن میں

زخمِ انتظارِ دل کیا؟ دل کے تشریف لانے کا انتظار؟

ت: آپ اضافتوں کے توڑنے میں سہو کر گئے "لطفِ زخمِ انتظارِ دل" نہیں ہے بلکہ "لطفِ زخمِ انتظار، دل" ہے یعنی زخمِ انتظار کا وہ لطف جو دل کو حاصل ہے یا جو دل کا تجربہ ہے۔

ص ۲۵۰   جوں صدف پُر در ہیں دنداں در جگر افسردگاں   ۱۷۸/۶۶

اختلافِ نسخ کے تحت نسخۂ عرشی میں ص۔ ۱۴۱ پر یہ اظہار کیا گیا ہے کہ نسخۂ بھوپال میں مصرعِ ثانی میں افسردگاں ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو کتابت کی غلطی ہے۔

ت: آپ کو نسخۂ حمیدیہ کا متن تحقیق کرنا چاہئے تھا۔ نسخۂ حمیدیہ کے دونوں ایڈیشنوں میں "افسردگاں" ہی ہے۔ نسخۂ عرشی میں جو اختلافِ نسخ کے طور پر 'افسردگاں' درج ہے وہ اس شعر کے بارے میں نہیں اس کے تیسرے شعر کے لئے ہے۔

ص ۲۵۸   مخطوطے میں مصرع تھا "دلے جوں شمع بہر دعوتِ نظارہ لا" یعنی   ۱۸۲/۶۸

ابتدائی لفظ قلم زد کرکے اصلاح کی گئی "وہ دل جوں شمع . . . . ." لیکن نسخۂ بھوپال میں "دلِ جوں شمع" ہے۔ نسخۂ بھوپال میں دراصل 'دلے جوں شمع' رہا ہوگا۔ مخطوطے کی قلم زد قرأت نسخۂ بھوپال میں کیسے پہنچی۔

ت: خ کے متن کی تاریخ کتابت طے کی گئی ہے۔ اصلاحوں کی تاریخ کسی نے متعین نہیں کی۔ خ میں اس مصرع کی اصلاح کتابتِ متن ق کے بعد کی گئی ہوگی یوں خ کی اصلاحی شکل اور اق کا متن بالکل یکساں ہے۔

ص ۲۶۰   کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو   ۱۸۲/۶۸

یہ مصرع مخطوطے میں بھی ہے اور متداول دیوان میں بھی۔ کفِ ہر ذرہ یا کفِ ہر ذرّہ خاک درست لیکن کفِ ہر خاک سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے یہاں خاک کی بجائے 'چاک' رہا ہوگا جس کے معنی پھولوں کے ٹوکرے کے ہیں۔

ت: دراصل غالب 'ہر کفِ خاک' کہنا چاہتے تھے۔ عجز کے سبب کفِ ہر خاک کہہ گئے۔ معنی اس کے بھی صحیح ہیں۔ چاک کے کوئی اجنبی معنی "پھولوں کا ٹوکرا" ہو سکتے ہیں۔ دراصل غالب کے کلام میں معنی کی زیادہ صفائی اور برجستگی کی تلاش نہیں کرنی چاہئے ورنہ کہاں کہاں اصلاحیں کریں گے۔

ص ۲۶۱   خوشا عالم کہ در طوفانِ مے موجِ صبا گم ہو   ۱۸۴/۶۹

"خوشا عالم کے در طوفانِ مے" کو کاٹ کر "مگر طوفانِ مے میں پیچش" کر دیا لیکن مصرع کے صرف قلم زد الفاظ باریک قلم سے لکھے ہیں۔ کیا مصرع لکھتے وقت معلوم تھا کہ بعد کو یہ الفاظ کاٹ دیئے جائیں گے۔

ت: اعتراض دلچسپ ہے۔ دراصل صرف "خوشا عالم کہ" یہ تین الفاظ چھوٹے لکھے ہیں۔ "در طوفاں" یہ دو لفظ معمول کے مطابق ہیں۔ ابتدائی لفظوں کو چھوٹا لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ شیرازۂ جلد کی طرف جگہ کی قلت تھی۔ کاتب نے شروع میں لفظوں کو چھوٹا لکھنا شروع کیا کہ مصرع چوکھٹے سے باہر نہ نکلے جب تین چار الفاظ لکھ چکا تو اس نے دیکھا کہ ابھی کافی جگہ ہے اس لئے بقیہ الفاظ بڑے بڑے لکھ دیئے۔ حقیقت صرف اتنی ہے۔

ص ۲۶۲   نہیں جز دردِ تسکینِ نکوہش ہائے بے درداں

بموجِ گریہ صد خندۂ دنداں نما گم ہو   حوالہ ایضاً

دوسرے مصرع کے ابتدائی الفاظ کو قلم زد کرکے اصلاح کی گئی "کہ موجِ گریہ میں ---" پہلی قرأت میں "بموجِ گریہ" بے معنی ہے۔ شاید 'بموجِ گریہا' اصلاح معکوس کی ہوگی۔

ت: "بر موجِ گریۂ" بالکل بامعنی ہے۔ یہاں ہمزۂ اضافت نہیں بلکہ یائے تنکیر کے مساوی ہمزہ تنکیر یا ہمزۂ وحدت ہے۔ 'بموجِ گریۂ' کے معنی ہیں 'ایک گریہ کی موج میں' (صد خندۂ دنداں تماگم ہو)

ص ۲۶۷   اسد اندیشۂ ششدر شدن ہے   نہ پھریے مہرہ شاں خانہ بخانہ   ۱۸۸/۷۱

اس شعر میں فقیری کی بات ہے جو مرزا کے اس عہد کا مزاج نہیں ہے۔

ت: نسخۂ بھوپال کے حاشیے پر یعنی نسخۂ شیرانی سے قبل شعر ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب   اب عناصر میں اعتدال کہاں

اور حاشیۂ نسخۂ شیرانی پر وہ مشہور قطعہ:

ع ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

اور ذیل کا مصرع۔ ع ننگِ پیری ہے جوانی میری

ہے، جو جوانی میں اس قسم کے اشعار کہہ سکتے تھے وہ چند سال قبل خ میں بھی فقیری کے مضمون باندھ سکتے تھے۔

ص ۲۷۴ لخت لختِ دلِ نگینِ خانہ از زنجیر ہے ۱۹۴/۷۴

ق اور قا میں ' یکین ' ہے اس لئے ' نگین ' غلط ہے۔ کیا مرزا اپنا کلام خود غلط لکھتے ؟

ت: یہ درست ہے کہ ق اور قا میں یکین ہے لیکن معنی کے لحاظ سے ' نگین ' بہتر ہے۔ نگین اور یکین میں محض ایک نقطے کا فرق ہے۔ بہر حال معنی دونوں الفاظ دیتے ہیں۔

ص ۲۷۹ کھلتا کسوں پہ کیوں مرے دل کے معاملے ۱۹۱/۷۷

نسخۂ عرشی کے مطابق ق میں یہ مصرع " کھلتے کسوں پہ کیوں مرے دل کے معاملے " تھا۔ خ کے اتنے اچھے مصرع کو ق میں کیوں بدلا گیا اور بعد میں اسی کو کیوں بحال کیا گیا۔

ت: مندرجہ بالا شعر خ میں بعد کا اضافہ ہے۔ اضافہ کا زمانہ کون جانے۔ کیا معلوم کہ یہ ق کے بعد کا اضافہ ہو۔

ص ۲۷۹ ع ہر نیستاں قلم روِ اعجاز ہے مجھے ۱۹۸/۷۶

پہلے یک لکھا تھا اسے ' ہر ' بنا دیا لیکن ق میں یک ہی ہے۔

ت: الف اور عین کے مرتبوں کا یہ کہنا صحیح کہ یک کو ' ہر ' بنایا ہے۔ ' ہر ' کسی طرح ہے ہی نہیں۔ قلم زد قرأت واضح نہیں۔ بعد میں یقیناً ' یک ' بنایا گیا ہے۔

ص ۲۸۷ آنکھوں میں انتظار سے جاں پُر شتاب ہے ۲۰۰/۷۷
آنا ہے آؤ گر نہ یہ پا در رکاب ہے

پہلے مصرع میں پُر پڑھیے خواہ پَر۔ دونوں صورتوں میں مطلب ادا نہیں ہوتا حالانکہ ذرا سی کوشش سے پہلا مصرع یوں ہو سکتا تھا:

اٹکی ہوئی ہے آنکھوں میں جاں اضطراب ہے

یا اٹکا ہوا ہے آنکھوں میں دمِ اضطراب ہے

ت: " جاں پُر شتاب " کے معنی ہیں جاں بہت جلدی کر رہی ہے۔ اصلاح کی کوئی ضرورت

نہ تھی۔

ص ۲۸۸ حیراں ہوں دامنِ مژہ کیوں جھاڑتا نہیں
خطِ صفحۂ عذرا پہ گردِ کتاب ہے ۲۰۲/۷۸

" دامنِ مژہ " بالکل لغو ترکیب ہے۔ مژہ کو برش یا جھاڑو سے تشبیہ دی جا سکتی ہے لیکن برش اس وقت ہوتے نہیں تھے اور جھاڑو سے کتاب نہیں جھاڑتے۔

ت: ایک چیز بالوں کی چوری (یا چنور) ہوتی ہے جس سے مکھیاں اُڑاتے ہیں۔ اس سے گرد بھی جھاڑی جاتی ہے اور مژہ اس سے مشابہ ہوتی ہے۔

ص ۲۹۲ وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالب
چٹکنا غنچۂ گُل کا صدائے خندۂ دل ہے ۲۰۴/۷۹

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اگر حمیدیہ میں ' غنچۂ دل ' تھا تو خ میں متداول دیوان کی قرأت کیونکر در آئی۔

ت: نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ حمید احمد خاں میں ' غنچۂ گُل ' لکھ کر نوٹ دیا ہے کہ مفتی انوار الحق کے نسخے میں ' غنچۂ دل ' بداہتہً سہوِ کاتب ہے۔

مصنف کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں اسد تخلص کو بدل کر غالب کیا گیا یہ بڑی مصنوعی بات ہے۔ پھر اگر اسد کے مقطعوں کو بدلنا ہی مرزا کا منشا ہوتا تو بہت سے مقطعے کیوں چھوڑ دیے جاتے۔

ت: غالب نے اس مخطوطے کے علاوہ بھی بارہا اسد کے مقطعے بدلے ہیں۔ نسخۂ حمیدیہ مرتبۂ انوار الحق میں دیکھ لیجیے جگہ جگہ اسد والا شعر قلم زد ہو کر غالب تخلص کے ساتھ نیا شعر آ گیا۔ سرسری دیکھنے ہی پر نسخۂ حمیدیہ میں دو مقطعوں میں تخلص کی تبدیلی دکھائی دی۔

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش اسد لیکن یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں
لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے غالب یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں } ص ۱۰۸

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی شعرِ اسد کے ایک دو پڑھ کے اسے سنا کہ یوں
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں } ص ۱۱۰

ص ۲۹۹ اسد کو حسرتِ عرضِ نیاز تھی دمِ قتل
ہنوز یک سخنِ بے صدا نکلتی ہے ۲۰۷/۸۰

مخطوطے کے علاوہ ق، قا، نسخۂ عرشی میں بھی یہ شعر اسی طرح ہے۔ غالب سخن کو مونث نہیں باندھ سکتے تھے۔ اس کے معنی مخطوطے کا ماخذ نسخۂ عرشی یا دوسرے نسخے ہیں۔

اس کے بعد مصنف نے قیاسی صورتیں تجویز کی ہیں۔

ت : واقعی سخن کی تانیث بڑا سقم ہے لیکن دوسرے مستند نسخوں میں اس کے موجود ہونے سے ثابت ہوتا ہے کہ غالب نے واقعی مونث باندھا۔ اُس دَور میں شاید تذکیر و تانیث کی صحت پر اتنا زور نہ ہوگا۔ مثلاً متداول کا یہ شعر دیکھیے :

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا — دی ہے جائے دہن اس کو دمِ ایجاد نہیں

اس میں 'اثبات' کو سہواً مونث باندھا ہے۔ حالانکہ دوسری جگہ صحیح باندھا ہے۔

ع ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

ص ۳۰۳ — حسرتے اے ضبط سوزش، حیرتِ اظہارِ حال

داغ ہے مہرِ دہن جوں چشمِ قربانی مجھے $\frac{۲۰۸}{۸۱}$

لکھتے ہیں کہ 'حسرتے' ہے تو 'حیرتے' بھی ہونا چاہیے۔ بات پھر بھی نہ بنتی۔ "حسرتا اے ضبطِ سوزش، حیرتا اظہارِ حال"، ہوتا تو مصرع کی صورت نکھرتی۔

ت : 'حیرتِ اظہارِ حال' صحیح ہے۔ 'حیرتے' سے یہاں ترکیب بے معنی ہو جاتی۔ مصنف اعتراض تک قانع رہیں تو ٹھیک ہے۔ اپنی اصلاحیں پیش نہ کیا کریں۔ 'حیرتا' کتنا بھونڈا معلوم ہوتا ہے۔

ص ۳۰۵ — باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے

پائے وحشت میں ہے زنجیرِ رمِ آہو مجھے $\frac{۲۰۸}{۸۱}$

دوسرے مصرعے کے ابتدائی الفاظ کو کاٹ کر اصلاحی صورت لکھی گئی ہے۔ مندرجہ بالا قلم زد قرأت ہے جو مولفِ عین نے قیاس کی ہے۔ یہ ایسا بیہودہ مصرع ہے کہ کوئی ہوشمند اسے میرزا سے منسوب نہیں کر سکتا۔

ت : مصرع بیہودہ نہیں لیکن ردیف 'مجھے' ضرور کمزور پڑ گئی ہے۔ شاعر کہتا ہے 'مجھے پائے وحشت میں زنجیرِ آہو ہے'، یعنی میرے پائے وحشت میں رمِ آہو کا سلسلہ پڑا ہے۔ دوسرے الفاظ میں 'میرا پائے وحشت ہر وقت آہو کی طرح رم کرتا رہتا ہے'۔

ص ۳۰۹ — حسن کا خط پر نہاں خندیدنی انداز ہے $\frac{۲۱۴}{۸۴}$

'خط نہاں' کوئی زبان نہیں۔ 'خط میں نہاں' چاہیے۔ شعر الحاقی ہے۔

ت : شعر کے معنی میری کتاب 'تفسیرِ غالب' میں دیکھیے۔ 'پر' صحیح ہے 'میں' غلط ہوتا۔ 'پر' سے مراد ہے کہ حسن خط پر در پردہ خندہ و استہزا کر رہا ہے۔

ص ۳۱۳ — بہر تاراجِ تمنا فتنہ درکار ہے $\frac{۲۱۶}{۸۵}$

'فتنہ درکار' مہمل ترکیب ہے۔ مصرع الحاقی ہے۔

ت : 'فتنہ' میں ہمزہ یائے تنکیر یا یائے وحدت کا قائم مقام ہے۔ اسے درکار سے اضافت کا رشتہ نہیں۔ 'فتنہ درکار ہے' کے معنی ہوئے، کوئی فتنہ یا ایک فتنہ درکار ہے!

ص ۳۱۴ — بیضہ آسا تنگِ بال و پر (یہ) ہے کنجِ قفس

دونوں مرتبوں نے لے حمیدیہ کی تقلید میں 'بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے (یہ) کنجِ قفس' پڑھا ہے حالانکہ تنگ میں ت کے دو نقطے صاف ہیں۔

ت : نقوش جولائی ۱۹۷۰ء میں، بیاضِ غالب کے غلط نامہ ص ۲۸ پر تصحیح کر دی گئی ہے کہ مصرع کی قرأت یوں ہونی چاہیے۔

بیضہ آسا تنگ بال و پر (یہ ہے) کنجِ قفس

ص ۳۲۴ — تمثالِ تماشاہائے، اقبالِ تمناہا — عجزے عرقِ شرے اے آئینہ حیرانی $\frac{۲۲۲}{۸۸}$

عجزے پہ یا یائے تنکیر درست نہیں۔ نسخۂ عرشی میں 'عجز' ہے لیکن مصنف کی رائے میں 'عجز اے عرقِ شرے ۔ ۔ ۔' ہونا چاہیے۔

ت : معنی 'عجزے' اور 'عجز' دونوں سے نکلتے ہیں لیکن اصلاحی شکل 'عجزِ' بہتر معنی دیتی ہے۔ دونوں متنوں کے بامعنی ہونے کی وجہ سے ایک اور ترمیم 'عجز اے' غیر ضروری ہے۔

میری رائے میں تمثال اور اقبال میں اضافت نہیں ہونی چاہیے۔

ص ۳۲۵ — گلزارِ تمنا ہوں گلچینِ تماشا کو — حد نالہ اسد بلبل در بند زباں دانی $\frac{۲۲۴}{۸۹}$

پہلے مصرع میں ایک جگہ 'ہوں'، دوسری جگہ 'کو' صحیح نہیں۔ دونوں جگہ ہوں چاہیے تھا یا 'کو'۔

ت : بہ صورتِ موجودہ بھی صحیح ہے۔ دوسرا 'کو' فارسی حرفِ استفہام ہے۔

گلزارِ تمنا ہوں، گلچینِ تماشا کو؟

ص ۳۲۶ — خوشا خیالِ کسانے کہ محوِ بیخبری ہیں
حصولِ یاس والمِ رزقِ مدعا طلبی ہے — ایضاً

'کسانے' پڑھیے کہ 'کسانی' دونوں بے محل ہیں کیونکہ کسان ہندی لفظ ہے۔

ت : کیا لطیفہ ہے! یہ ہندی لفظ نہیں، فارسی لفظ کس کی جمع 'کساں' (مثلِ بے کساں) ہے۔ اس پر یائے تنکیر یا یائے زائد لگا کر کسانے بنایا۔

ص ۳۲۸۔ طلسمِ آئینۂ زانوئے فکرِ خودبینی — ہنوز حسن کو ہے سعیِ جلوہ افروزی — ایضاً

نسخۂ عرشی میں یہ مصرع ہے 'طلسمِ آئینۂ زانوے فکر ہے غافل'،

مصنف کی رائے میں زانوئے فکر کی ترکیب غلط ہے۔ یہ 'زالوئے فکر' ہونا چاہیئے۔ زالو کے معنی 'جونک' ہیں۔

ت : مصنف شاید زانوئے فکر کی ترکیب سے واقف نہیں۔ زانو پر سر رکھ کر فکر کیا جاتا ہے۔ یہاں جونک کا کوئی موقع نہیں۔ غالب کے یہاں زانو فکر کی علامت ہے۔ یہ اس نسخے کے ایک اور شعر میں دیکھیے :

بہ ہنگامِ تصور ساغرِ زانو سے پیتا ہوں — مئے کیفیتِ خمیازہ ہائے صبحِ آغوشاں

ص ۳۲۹۔ بہ پرفشانیِ پروانہ، چراغِ مزار — کہ بعدِ مرگ بھی ہے لذتِ جگر سوزی — ایضاً

'بہ' غلط 'یہ' ہونا چاہیئے۔ یہی غلطی نسخۂ عرشی میں ہے۔ مخطوطہ بخطِ غالب ہونے کی ایک اور شہادت۔

ت : 'بہ' قسم کے لئے ہے۔ پرفشانیِ پروانہ کی قسم۔ 'یہ' ہو تو دوسرے مصرع میں 'کہ' بے کار ہو جاتا ہے۔

ص ۳۳۳ — ع چراغانِ نگاہ و شوخیِ اشکِ جگر گوں ہے ۲۲۸/۹۱

مخطوطے اور نسخۂ عرشی میں 'گوں' غلط ہے 'خوں' ہونا چاہیئے۔

ت : جگر گوں کے معنی ہوئے جگر کے رنگ کا۔ 'خوں' کی کوئی ضرورت نہیں 'اشکِ خونِ جگر' ہو سکتا تھا۔ 'اشکِ جگر خوں' صحیح ترکیب نہیں۔

چھا گیا فرطِ صفا سے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ اے ظالم سیہ نامی تری ۲۳۲/۹۳

اس میں فرطِ صفا کو زلف کی صفت قرار دینے کی طرف ذہن نہیں جاتا۔ اس پہ مصرع الحاقی ہے۔ (اس کالی زلفوں کا عکس پڑا تو جلد سیہ فام دکھائی دینے لگی۔ حسنِ تعلیل ہے۔)

ص ۳۳۸ — کچھ نہیں حاصل تعلق میں بغیر از سوز و ساز
اے خوشا رندے کہ شمعِ محفلِ تجرید ہے — ایضاً

چونکہ شمعِ تجرید سے آزادی کا نہیں بلکہ گھلنے اور جلنے کا تصور وابستہ ہے اس لئے 'خوشا' سے اس کی مطابقت نہیں۔

ت : فرطِ صفا محفلِ تجرید میں شمع کے روشن ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ بغیر جلی ہو گی اس لئے خوشا کہا۔

ص ۳۴۵ — بے دماغِ تپش و عجزِ دو عالم فریاد
ہوں میں وہ خاک کہ ماتم میں اڑایا ہے مجھے ۳۳۸/۹۶

'عجز' بے محل ہے۔ شاید اسے نسخۂ عرشی کے اس مصرع سے لیا ہے۔

بے دماغِ تپش و عرضِ دو عالم فریاد

'عرض' کے معنی یہاں اس وصف کے ہیں جو جوہر کے ساتھ ہوتا ہے۔ جبل سازنے عرض بمعنی درخواست سمجھ کر 'عرض' کی جگہ 'عجز' کر دیا۔

ت : مصنف سے افسوسناک سہو ہوا۔ وصف کے معنی میں 'عرض' بہ تحریک را ہوتا ہے۔ نسخۂ عرشی کے شعر میں عرض کے معنی پیش کرنا ہی ہیں۔ مجھے تپش نے بے دماغ کر دیا ہے اور میں دنیا بھر کی فریاد پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مخطوطے کے مصرع میں 'عجزِ دو عالم فریاد' کے معنی ہیں میں بہت سی فریاد کا عجز ہوں بالفاظِ دیگر فریاد کرتے کرتے جو عجز و پریشانی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ میں سراپا وہی ہوں۔

ص ۳۴۸ — رنگ سے گل نے دمِ عرضِ پریشانیِ بزم
برگِ گل ریزۂ مینا کی نشانی مانگے

مخطوطے میں نیز نسخۂ عرشی میں اس شعر کی ردیف "مانگے" غلط ہے۔ یہاں "مانگی" کا مقام ہے اس لئے یہ شعر اس غزل کا نہیں۔

ت : مانگے صحیح، مانگی غلط۔ (برگِ گل جو ریزۂ مینا کی نشانی ہیں) مانگے شعر کے معنی تفسیرِ غالب میں دیکھئے۔

ص ۳۵۷ فرصتِ آئینۂ و پردازِ عدم تا ہستی یک شرر بال دل و دیدہ چراغاں زدہ ہے ۲۴۲/۹۹

خ میں پرواز، ق میں پرداز، قا میں پرواز۔ خ اور قا میں پرواز سہوِ کاتب ہے۔ قا کی غلطی طے میں کیونکر درآئی یہ۔

ت : پرواز یقیناً پرداز سے بہتر ہے۔ اُردو تحریر میں دال اور واؤ میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اگر مصرع یوں ہوتا تو معنی "پرداز" سے واضح تر ہوتے۔

فرصتِ آئینہ پردازِ عدم تا ہستی

"آئینہ پرداز" غالب کی مخصوص ترکیب ہے مثلاً ملاحظہ ہو اسی نسخے میں:

تپشِ آئینہ پردازِ تمنا معلوم نامۂ شوق بہ بالِ پرِ بسمل باندھا ۸۶/۲۰

فی الحال "فرصت" کو اضافت کے بغیر پڑھئے۔ آئینہ کے بعد واؤ عطف اور پرواز کو واؤ سے یعنی اڑان ماننا ہوگا۔

۳۵۸ شام سایہ میں نہ تاراجِ سحر پنہاں ہے

مرزا لکھتے تو "بہ" کی جگہ "نہ" نہیں لکھتے۔

ت : یہ مصنف کی زبردستی ہے۔ بہ ہی لکھا ہے نہ نہیں۔ بہ کی ب کا نقطہ "میں" کے پیٹ کی کشش میں چپکا ہوا ہے۔ "میں" کے اوپر جو نقطہ ہے وہ دراصل بالائی مصرع کے لفظ "خواب" کی ب کا ہے۔ اس کے آگے جو نقطہ ہے وہ مبینہ "نہ" کا نہیں بلکہ "میں" کے نون کا ہے۔ مرزا نون غنہ میں ہمیشہ نقطہ لگاتے تھے۔

ص ۳۷۱۔ نمک بر داغِ مشک آلودہ وحشت تماشا ہے، سوادِ دیدۂ آہو شبِ مہتاب میں جلے ۲۵۸/۱۰۵

میرزا ایسا شعر نہیں کہہ سکتے تھے اور شور کی رو والا معاملہ میرزا کے زمانے میں نہیں تھا۔

ت : بڑا یاربط شعر ہے جس کے معنی بالکل چوکھے ہیں۔ میری شرح میں ملاحظہ ہوں۔

۳۷۶۔ مصنف کہتے ہیں اسی زمین میں (سفری ہے) چار شعر ایک ماخذ سے راقم کو حاصل ہوئے ہیں۔ یہ بھی میرزا کے شعر بتائے جاتے ہیں۔ شعر حاضر ہیں۔

ص ۳۹۳، ۳۹۴ پر پھر کہتے ہیں کہ ایک ماخذ سے اسی زمین میں (گل کے تلے) کچھ شعر دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ بھی میرزا کے بتائے جاتے ہیں۔ شاید مولانا عرشی اور جناب مالک رام ان کے بارے میں کچھ کہہ سکیں۔

ت : تحقیق مذاق کی چیز نہیں۔ مخطوطہ جعلی ہو کر نہ ہو مصنف نے غیر سنجیدگی سے ان اشعار کو پیش کر کے یقیناً نادانستہ جعل کیا ہے کیونکہ ظاہراً یہ شعر انھیں کی تصنیف ہیں۔

ص ۳۸۰ بیابانِ فنا ہے بعدِ صحرائے طلب تازی پسینہ توسنِ ہمت کا سیل خانہ زیں ہے ۲۶۲/۱۰۹

نسخۂ عرشی میں "تازی" کی جگہ "غالب" ہے۔ یہاں تازی تخلص معلوم ہوتا ہے کیونکہ تازی کے معنی ہیں عربی زبان میں "عربی گھوڑا، شکاری کتا"۔ تازی کے یہاں کوئی معنی نہیں۔

ت : ایک فارسی مصدر تاختن ہے جس کے معنی دوڑنا، جھپٹنا ہیں۔ طلب تازی کے معنی طلب پورا کرنے کے لئے بھاگ دوڑ۔

ص ۳۸۴ صفائے اشک میں داغِ جگر آئینہ پرتو ہیں پرِ طاؤس برقِ ابرِ چشمِ اشکِ باراں ہے ۲۶۶/۱۱۰

قافیہ بہ یک وقت "ناداں" بھی پڑھا جا سکتا ہے اور "باراں" بھی۔

ت : معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سہواً "ناداں" لکھ گئے تھے بعد میں "د" کا اوپری بایاں سرا چھیل کر "ر" بنائی لیکن ناداں کی "نا" کا نقطہ باقی رہ گیا۔ فی الحال "اشک باراں" بدونِ اضافت پڑھئے۔

ص ۳۸۷ اسد بندِ قبائے غنچۂ گلزار سامانی اگر ہو وے شگفتن جوش یک عالم گلستاں ہے ۲۶۸/۱۱۱

شگفتن محلِ نظر ہے۔ اوّل تو مصدر مناسب نہیں۔ پھر بندِ قبا کھلتا ہے، کھلتا نہیں۔

ت : شگفتن غنچہ کی رعایت سے آیا ہے۔ جوش پر اضافت نہ لگائیے "شگفتن جوش" ایک ترکیب ہے۔ شعر کی قرأت یوں بہتر رہے گی۔

اسد! بندِ قبائے غنچۂ گلزار سامانے اگر ہو وے شگفتن جوش یک عالم گلستاں ہے

ص ۳۹۳۔ کثرتِ جوشِ سویدا سے نہیں تل کی جگہ خال کب مشاطۂ سکتی ہے کاکل کے تلے ۲۷۲/۱۱۳

"کثرتِ جوشِ سویدا" مہمل ترکیب ہے۔

ت: مہمل نہیں۔ سویدا دل کا مرکز ہوتا ہے۔ یہاں مراد ہے عاشقوں کے دلوں کی کثرت۔ یہ دل یار کے بالوں میں بھرے ہیں۔ سویدا خال کی رعایت سے آیا ہے۔

ص ۳۹۷۔ زباں بکامِ خموشاں ز فرطِ تلخیٔ ضبط   برنگِ پستہ بزہرآب دادہ پیکاں ہے   ۲۷۴/۱۱۴

پستہ سہوِ کاتب ہے۔ صحیح بستہ ہے۔ غالب کے ہاتھ کے نسخے میں "پستہ" کیونکر لکھا ہوتا۔

ت: واقعی "پستہ" لکھنے کا جواز مجھ میں نہیں آتا۔ شعر کا متن بالکل نسخۂ بھوپال کے مطابق ہے۔ پستہ، بھی سبز ہوتا ہے لیکن بستہ مراد لینے سے دوسرے جزو کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ اب تو صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ ذہنی غیر حاضری کی وجہ سے بستہ کی جگہ پستہ لکھ گئے۔

ص ۳۹۸۔ لبِ گزیدۂ معشوق ہے دلِ افگار   نشانِ جوہرِ شمشیر زخمِ دنداں ہے   ایضاً

جوہر کاٹ کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ وصف اور جوہر میں فرق ہے۔ نسخۂ بھوپال میں برشِ شمشیر ہے۔

ت: جوہر کے ایک معنی اچھے فولاد کے ان ذرہ نما نقطوں یا دھاریوں کے بھی ہیں، جو فولاد کے کھرے ہونے کی شہادت دیتے ہیں۔ یہاں وہی مراد ہیں۔

ص ۳۹۹۔ بر خاک اوفتادگیِ کشتگانِ عشق   ہے سجدۂ سپاس بمنزل رسیدگی   ۲۷۶/۱۱۵

"خاکِ اوفتادہ" کی جگہ خاکِ اوفتادگی یا خاکِ افتادگی مرزا نہیں لکھ سکتے تھے۔

ت: خاک پر اضافت نہیں پہلے مصرع کے معنی ہیں۔ کشتگانِ عشق کا خاک پر گرنا

ص ۴۴۴   سخن تاریک طبعوں کا ہے اظہارِ کسافتہا   ۲۸۰/۱۱۷

جن حضرت نے یہ غزل از رہِ غالب ترسی موزوں کی ان کو کثافت کے ہجے نہیں آتے تھے۔

ت: لیکن الف کے ص ۴۴، اور عین کے ص ۱۴۴ پر:

ع   لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

میں تو کثافت کے ہجے ٹھیک لکھے ہیں۔ اب میری ایک عرض سنئے۔ قدیم مخطوطوں میں یہ نہایت عام ہے کہ مثنوی کو مسنوی لکھا ہوتا ہے۔ میں نے ایک بزرگ عالم سے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ انھوں نے تاویل کی کہ س کی طرح درمیانی ث کو بھی شوشے کے علاوہ طویل کشش سے (س) کی طرح لکھ سکتے ہیں اور لکھتے ہیں اور چونکہ پرانے زمانے میں نقطے لگانے کی پابندی نہیں کی جاتی تھی اس لئے لمبی کشش کے ساتھ ث کے نقطے حذف کر دیتے تھے جس سے بالکل س جیسا معلوم ہونے لگتا تھا۔

اس نسخے میں "کسافتہا" میں بالکل وہی بات ہے۔ ث کو مسنوی کے ث کی طرح لکھا ہے۔

ص ۴۱۳، ۴۱۴ کا فٹ نوٹ۔ حقیر کمال تبخالۂ لب کو درست نہیں سمجھتا کیونکہ میرزا نے یہ ترکیب استعمال کی ہے اس لئے عین کے ص ۱۸، اور الف کے ورق ۹ ب پر مصرع "تبخالۂ لب ہو نہ سکا آبلہ پا" پر جو اعتراض کیا گیا تھا واپس لیا جاتا ہے۔

ت: مندرجہ مصرع کتابچے ص ۵۳ پر ہے۔ وہاں اس مصرع پر یا "تبخالہ" پر کوئی اعتراض ہی نہیں۔ واپس کیسے لیا۔

ص ۴۱۶   گفتم کہ اسدؔ؟ گفت دلِ آشفتۂ من   ۲۹۲/۱۳۲

میرزا فارسی میں ابتدا ہی سے غالب تخلص کرتے تھے۔ اس رباعی میں اسد تخلص ہونا ثابت کرتا ہے کہ یہ الحاقی کلام ہے۔

ت: ڈاکٹر محمد سحر بہت پہلے توجہ دلا چکے ہیں کہ نسخۂ بھوپال میں جو فاتحۂ فارسی (قصیدہ) شامل ہے اس میں اسد تخلص ہے جس سے معلوم ہوا کہ مرزا نے شروع میں فارسی میں اسد تخلص استعمال کیا تھا۔

ص ۴۱۸   آ پہنچے ہیں تا سوادِ اقلیم عدم   اے عمرِ گذشتہ یک قدم استقبال   ۲۹۴/۱۲۴

کیا ۱۹ برس کی عمر میں وہ "تا سوادِ اقلیم عدم" آ گئے تھے۔ یہ رباعی یقیناً بہت بعد کی ہے۔

ت: یہ نسخۂ بھوپال میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگر ۲۵ برس کی عمر میں "تا سوادِ اقلیم عدم" پہنچنے کا مضمون باندھا جا سکتا ہے تو ۱۹ برس کی عمر میں روایتی خیال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں جعل کے امکانات پر غور کیا جائے تو بات عقل کی کسوٹی پر نہیں ٹھہرتی۔ ان کے الزامات میں بھی کسی قدر تضاد بیانی ہے۔ مثلاً ۵۴، ۷۴، ۱۵۲، اور دوسری کئی جگہوں پر کہتے ہیں کہ مخطوط بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں لکھا گیا۔ دوسری طرف بعض جگہ اسے ۱۹۶۹ء کا کارنامہ قرار دیتے ہیں۔

مثلاً: ع   "برقِ خرمن ہائے گوہر ہے نگاہِ تیز یہاں"

عین میں یہاں بخطِ غالب الف کے لئے مائکرو فلم تیار ہونے کے بعد لکھا گیا ہے۔ یہ بات کسی شک و شبہ کے شائبے کے بغیر ثابت ہے کہ سنہ ۱۹۶۹ء میں یہاں اس مصرع میں بخطِ غالب لکھا گیا ہے۔ نتیجہ، جس نے سنہ ۱۹۶۹ء میں اس مصرع میں یہاں لکھا ہے۔ اسی نے سنہ ۱۹۶۹ء میں یا ایک آدھ برس پہلے

مخطوطہ بخطِ غالب لکھا ہے (ص ۹۹ -)

اور عین میں تین نقطوں کی مبینہ تحریف پر کہتے ہیں۔

"یہ وسط ۱۹۶۹ء کا واقعہ ہے یعنی بخطِ غالب تصحیح کرنے والا موجود تھا۔ مخطوطہ لکھنے والا ۱۹۶۹ء میں موجود تھا۔" (ص ۳۶۶)

"یہ نسخہ غالب کی صد سالہ برسی سے کچھ ہی پہلے لکھا گیا ہے۔" (ص ۳۶۶)

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۰ء تک ہے۔ ۱۹۶۹ء ساتویں دہائی میں آتا ہے۔ کوئی نسخہ بہ یک وقت بیسویں صدی کی چھٹی دہائی اور ۱۹۶۹ء میں نہیں لکھا جا سکتا۔ شاید مصنف نے "چھٹی دہائی"، انگریزی کے لفظ Sixties کا ترجمہ ہے۔ اس کا احاطہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۹ء تک ہے۔ ظاہر ہے کہ ترجمہ صحیح نہیں ہے وہ مرتب نسخہ عرشی زادہ سے بہت کھٹکے ہوئے ہیں۔ بار بار ان کے مادی اور روحانی وسائل کی طرف معنی خیز اشارہ کرتے ہیں۔

"یہ لکیریں بعد میں پھیری گئی ہیں۔ عین بھی اس غزل کو نیزے کے قلم سے نہیں کسی روشنائی والی جدید قسم کی پنسل[1] سے کاٹا گیا ہے اور اس سے اگلی غزل پر رم بنایا گیا ہے۔" ص ۱۱۴

لیکن مرتب الف کو بھی بری کرنے کو تیار نہیں۔ دونوں مرتبوں کے بارے میں لکھتے ہیں: "یہ تحریفیں اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ الف اور عین کے مؤلف بھی اس مخطوطے کے جعلی ہونے کے بارے میں مطمئن تھے۔" (ص ۱۴۷، ۱۴۸)

"علمی کام میں نیتوں پر شک کرنا معیوب بات ہے لیکن اس "مخطوطے" کے سلسلے میں نیتوں کا کھوٹا ہونا بھی ثابت ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جان بوجھ کر یہ مخطوطہ بنوایا گیا۔۔۔ الف میں جو مصرع قلم زد نہیں ہے اس کو قلم زد بنایا گیا ہے۔ شاید الف کے مؤلف بھی اس مصرع کو قلم زد کرنا چاہتے تھے لیکن بھول گئے۔" (ص ۳۲)

"نثار احمد فاروقی۔۔ "مخطوطے" سے زیادہ واقف ہیں اور اس کو منظرِ عام پر لانے میں انھوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔"

"اس تحریف سے الف اور عین کے مرتبین کے کام کے بارے میں بھی مناسب نتائج اخذ

---

[1] بال پوائنٹ پین کی طرف اشارہ ہے۔

کئے جا سکتے ہیں۔

مخطوطہ شفیق احمد بھوپالی کے پاس سے دستیاب ہوا جس نے ایک کباڑی سے خریدا تھا۔ شفیق سے توفیق امروہوی نے لیا۔ اس کے بعد یوپی آرکائیوز کے ایک افسر جلال الدین نے اس کا معائنہ کیا۔ اگر اس کا کاغذ حال کا ہوتا تو آرکائیوز والا کم از کم یہ تو شناخت کر سکتا تھا۔ مرتبِ الف اور عین تو بعد میں سامنے آئے ہیں۔ عرشی زادہ نسخے کی دریافت کے تقریباً ایک مہینہ بعد اسے رام پور لاتے ہیں۔ اگر مخطوطے کی تیاری ان[1] کا کارنامہ ہوتی تو وہ شفیق بھوپالی جیسے مجہول شخص کو کیوں آلۂ کار بناتے۔ پھر شفیق اور توفیق میں مقدمہ بازی ہوئی ہے۔ توفیق نثار احمد فاروقی اور اکبر علی خان کے تعلقات بھی خوش گوار نہیں۔ اگر ملی بھگت ہوتی تو کہیں کسی موقع پر کوئی تو بھانڈا پھوڑ دیتا۔ میرے لئے سب سے بڑی داخلی شہادت یہ ہے کہ مخطوطے میں جس رنگ کے تقریباً پونے دو سو نئے اردو اشعار اور کئی فارسی رباعیات ہیں نیز جس طرح کئی شعروں کی قدیم تر قرأت دی ہے وہ آج کل کسی عالم سے ممکن نہیں۔ اگر مصنف کے بقول جعل ساز نے منجملہ دوسرے نسخوں کے نسخۂ شیرانی، لطیف ایڈیشن اور دیوانِ غالب طبع اوّل سے استفادہ کیا تو وہ بہت بڑا محقق ہوگا کیونکہ نسخۂ شیرانی لاہور میں اگست ۱۹۶۹ء میں چھپا۔ خود نوشت مخطوطے کی دریافت سے پہلے اس کا عکس محض عرشی صاحب کے پاس تھا۔ اسی طرح لطیف ایڈیشن جو کبھی شائع نہیں ہوا جزوی حیثیت سے محض عرشی صاحب کے پاس تھا۔ کوئی عالم اس قسم کے مفت کرم داشتن کام میں کیوں اپنا وقت ضائع کرے گا۔

اگر یہ جعل ہے تو اس کے لئے غیر معمولی علم کی ضرورت رہی ہوگی۔ لیکن مصنف کے نزدیک یہ بچوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وہ واضع کی کم سوادی میں کیا کیا مبالغہ کرتے ہیں۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن نسخوں کو سامنے رکھ کر اس مخطوطے کا بلیو پرنٹ تیار کیا گیا تھا ان میں نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کے اختلافات کے بارے میں ضروری معلومات درج نہیں۔" (ص ۱۲۵)

مصنف نے دسیوں بار لکھا ہے کہ مخطوطہ نسخۂ عرشی سے تیار کیا گیا اور اس میں ان اختلافات کی تفصیل دی۔

---

[1] میں ایسی بحث کے لئے عرشی زادہ اور نثار احمد فاروقی صاحب سے معذرت چاہتا ہوں۔ میں ان کا ذکر کر ہی اس لئے رہا ہوں کہ میرے نزدیک وہ کسی طرح ملوث نہیں۔

"یہ شعر گڑھنے والا بہت پست ذہن سطح کا متشاعر تھا جو نہ صرف غالب کے مزاجِ شاعری سے نابلد تھا بلکہ معمولی شعر بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔"

"مخطوطے کا بلیو پرنٹ تیار کرنے (والے) اس مخطوطے کو بخطِ غالب تسلیم کرنے والوں کی طرح غالب کی تصنیفوں اور غالب کے متعلق تصنیفوں سے نابلد محض تھے۔"

"مخطوطہ اصلاحاتِ معکوس کے بعد نسخۂ عرشی سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ نسخہ ٹائپ سے چھپا ہے اور ٹائپ کا حرف پڑھنے کی مشق نہ ہو تو اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔" ص ۲۵۵

"جن حضرات نے یہ غزل (یدست آوردن دل گوہرِ دریائے شاہی ہے) از رہِ غالب ترسی موزوں کی ان کو کشافت کے ہجے نہیں آتے تھے۔ غالب کے نام پر دریافت کلام تصنیف کرنے والے یہ صاحب کچھ واجبی ہی سے پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ وہ غالب کے مزاج سے بھی ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔" ص ۴۴، ۴۰

اور ناقل کی مدح میں ارشاد ہے:

"مخطوطے کے ناقل نے غلط اور غیر معتبر مصدر سے عقل کا کم سے کم استعمال کرتے ہوئے مخطوطے کی کتابت کی۔" ص ۱۲۲

اگر مخطوطہ نسخۂ عرشی سے تیار کیا گیا ہے تو یہ غلط اور غیر معتبر مصدر نہیں۔ مصنف کہیں مرتبِ الف اور مرتبِ عین جیسے ماہرینِ غالبیات پر شک کرتے ہیں تو کہیں وانج کو کم سوادِ محض قرار دیتے ہیں اور جس ناقل نے اس چابک دستی کے ساتھ غالب کی تحریر سے تحریر ملائی وہ عقل کا کم استعمال کرنے والا نہیں بلکہ اپنی جگہ پر اول درجے کا ماہرِ غالبیات ہونا چاہیے۔ ہم تو یہ جانتے ہیں:

ضمانِ جادہ رویاندن ہے خطِ جامِ مے نوشاں — وگرنہ منزلِ حیرت سے کیا واقف ہیں مدہوشاں
بہ ہنگامِ تصور، ساغرِ زانو سے پیتا ہوں — مے کیفیتِ خمیازہ ہائے صبح آغوشاں

جیسے دقیق اشعار اور:

ع شرارِ فرصتے سرمایۂ چندیں چراغاں ہے

جیسی مشکل لیکن بامعنی فرسودہ ترقرأتیں بی زمانا کسی اردو والے سے ممکن نہیں۔ مصنف کی غیر معمولی محنت اور کوشش کے باوجود میں قائل نہ ہو سکا کہ نسخۂ غالب کی تعنیف نہیں۔ اس کے اشعار پکار پکار کر اپنے خالق کا اعلان کر رہے ہیں۔ اردو میں اور کون ایسا کج فکر و ژولیدہ بیان ہو سکتا ہے ••

مولانا عبدالسلام خاں

عرشی صاحب

جیسا میں نے پایا اور جانا

عرشی صاحب سے میرا تعارف ۱۹۲۴ء کی بات ہے میں مدرسۂ مطلع العلوم میں مرحوم بھائی صاحب مولینا عبدالوہاب خاں صاحب سے، جو اُس زمانے میں وہاں استاد تھے، خصوصی طور پر پڑھتا تھا، دس گیارہ سال کی عمر تھی۔ اور عرشی صاحب اُسی مدرسے کے صدر مدرس مولانا سید احمد صاحب ہزاروی مرحوم کے خصوصی شاگرد تھے اور اکثر مدرسے میں مولینا کے پاس آتے جاتے رہتے۔ یوں تو بوڑھے، جوان اور لڑکے مدرسے میں آتے جاتے ہی رہتے تھے لیکن عرشی صاحب کا انداز جداگانہ تھا؛ کھلتا ہوا گندمی رنگ، متین چہرہ، صاف ستھری شیروانی، مخملی سیدھی تراش کی رامپوری ٹوپی، چھوٹی خوشنما داڑھی اور جاذبِ توجہ شخصیت۔ وہ اگرچہ اب مدرسے میں نہیں پڑھتے تھے لیکن اپنی ذہانت، توجہ اور محنت وسعی کی بنا پر بعض ان کے دوسرے ساتھیوں کے ناموں کے ساتھ ان کا نام ابھی تک تازہ تھا اور میرے کان ان کے نام سے اور آنکھیں ان کے چہرے سے آشنا تھیں، لیکن تعارف نہ تھا۔ میرا تو محلّہ ہی تھا اور عرشی صاحب پکّے باغ پر رہتے تھے۔ مطلع العلوم کے پشت کی سڑک ان کا عام رستہ تھا۔ سامنا ہوتا تو میں سلام کر لیتا اور وہ گزر جاتے۔ دل کو دل سے راہ تو ہوتی ہی ہے، میرا اُس کم سنی میں لمبی چوڑی کتابیں بغل میں اور ادب واحترام کے ساتھ ہمیشہ سلام کرنا خالی نہیں گیا اور ایک روز رستے میں ٹھہر کر پوچھ ہی بیٹھے کہ کیا پڑھتے ہو، کہاں پڑھتے ہو، نام کیا ہے اور پھر مطالعہ اور محنت کی تلقین کر کے آگے بڑھ گئے۔ اب بات چیت اور پوچھ گچھ کی بھی نوبت آگئی۔ یہ تھا ابتدائی تعارف جس میں شروع سے ہی

چھوٹے بڑے کا رشتہ ملحوظ تھا۔ طبیعتوں کی مناسبت، ذوق کی یکسانی اور اندازِ فکر کا اشتراک کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ تعلق بڑھتا ہی رہا اور چھوٹے اور بڑے بھائی کے رشتے سے متجاوز نہیں ہوا۔ رکھ رکھاؤ، لحاظ اور فرقِ مراتب برابر قائم رہے۔ انھوں نے میرے ہر معاملے سے ویسی ہی دل چسپی لی جیسے ایک بڑے بھائی کو لینی چاہیے تھی۔

عرشی صاحب کی تدریسی زندگی سے طبعًا بے رغبتی

عام طور سے درسِ نظامی کے طلبا کے سامنے تدریسی زندگی ہوتی ہے اور غالبًا اِس درس کی نہاد میں ہی تعلیم وافادہ کے لیے اساتذہ تیار کرنا شامل رہا ہے۔ لیکن عرشی صاحب کو اس زندگی سے کبھی دل چسپی پیدا نہیں ہوئی۔ عرشی صاحب کے عام مطالعے میں دار المصنّفین اعظم گڑھ کی کتابیں رہی تھیں اور اس مطالعے کے زیرِ اثر ان کا رجحان تصنیف و تالیف کی طرف رہا۔ ان کے خصوصی استاد مولینا سیّد احمد صاحب مرحوم کو اپنے شاگردوں میں ان سے خصوصی تعلقِ خاطر تھا، خود عرشی صاحب بھی اُن کا غیر معمولی ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ مولینا کی دلی خواہش تھی کہ وہ مطلع العلوم میں استاد کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیں لیکن عرشی صاحب کا درس کی طرف میلان نہ دیکھتے ہوئے براہِ راست اپنی خواہش پر اصرار نہیں کیا۔

عرشی صاحب رام پور کے اہلِ علم میں اپنی ذکاوت خوش تصویری اور علمی استعداد کے لحاظ سے جانے بوجھے جوان تھے اور ریاست کے افسروں میں بھی اُن کا تعارف تھا۔ یہ ۱۹۳۰ء کی بات ہے، مدرسۂ عالیہ میں درجۂ عالم کی اسامی خالی تھی، مولینا سیّد عبد الدّائم صاحب مرحوم جلالی اسٹیٹ ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی تھے اور بددل تھے، مدرسۂ عالیہ میں عالم کے مدرس کی آسامی پر آنے کے لیے کوشاں تھے لیکن حکّام کی نظر عرشی صاحب پر تھی۔ جب عرشی صاحب نے تدریسی خدمات انجام دینے سے انکار کر دیا تو مولینا سیّد عبد الدّائم صاحب مرحوم کا عالم کی اسامی پر تبادلہ ہو گیا اور اسی اسامی سے وظیفہ لے کر سبکدوش ہوئے۔

عرشی صاحب کا علمی سفر اور واپسی پر مدرسۂ عالیہ میں درسِ نظامی کی تکمیل

۱۹۲۴ء میں عرشی صاحب لاہور چلے گئے اور پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا اور اس زمانے کے وہاں کے مشہور اساتذہ سیّد محمد طلحہ، نجم الدّین اور عبد العزیز میمن سے فائدہ اٹھایا اور سال بھر رہ کر مولوی فاضل پاس کیا۔ لاہوری دروازے میں شیخ مبارک علی کی کتابوں کی دکان تھی، ہر قسم کے اہلِ علم وہاں بیٹھتے تھے، عرشی صاحب بھی بیٹھنے لگے۔ شیخ مبارک علی نے عربی کے بی۔ اے کورس کا ترجمہ کرا کے شائع کیا تھا کہ کسی چلبلے خریدار نے یہ لکھ کر اصل کورس اور اُس کا ترجمہ واپس کیا کہ اگر اصل نصاب یہی انتخاب ہے تو اس کا ترجمہ بھیجیے اور اگر یہ ترجمہ شاملِ نصاب انتخاب کا حقیقی ترجمہ ہے تو پھر اس کی اصل بھیجیے۔ شیخ مبارک علی نے طالبِ علم کے اس دل چسپ خط کے ساتھ عربی بی۔ اے کورس اور اس کا ترجمہ عرشی صاحب کو دیا کہ وہ مقابلہ کر کے بتائیں کہ حقیقت کیا ہے۔ عرشی صاحب نے مقابلہ کیا تو واقعی ترجمہ بہت غلط تھا، چنانچہ شیخ مبارک علی نے اس ترجمے کو نظری کر کے عرشی صاحب سے ترجمہ کرایا اور پھر عربی کے انٹرمیڈیٹ کورس کا بھی ترجمہ کرا کے شائع کیا۔ عرشی صاحب کا یہ پہلا علمی کارنامہ تھا جس نے اُن کے تصنیفی ذوق کو مہمیز کیا۔

رام پور کا مرحوم[1] مدرسۂ عالیہ جس کا قیام ۱۷۷۴ء میں مولینا بحر العلوم متوفی ۱۲۲۵ء کی صدر مدرسی سے ہوا تھا، منطق فلسفے اور کلام کا خصوصی ادارہ رہا ہے اور والیانِ ریاست نے اس کی اس امتیازی حیثیت کو اس کے پرنسپلوں کے تقرر میں برابر ملحوظ رکھا، چنانچہ اس زمانے میں مدرسے کے صدر مدرس اور پرنسپل مولینا فضلِ حق[2] رام پوری ہندستان کے

---

[1] مدرسۂ عالیہ اپنے نام، استقرار اور معدودے مدرسین کے ساتھ اب بھی برقرار ہے۔ میں نے اسے مرحوم جان بوجھ کر کہا ہے۔ وہ ادارہ جو قریب قریب ڈیڑھ سو سال تک برِ عظیم ہند و پاک کا تنہا منطق، فلسفے اور کلام کا مستند اور مشہور ادارہ رہ چکا تھا، آج زوال کی دلدل میں دھنس رہا ہے اور اس پر کوئی دو آنسو بھی بہانے والا نہیں، جس کے پرنسپلوں میں بحر العلوم، ملا حسن، مفتی شرف الدین، فضل حق خیر آبادی، عبد الحق خیر آبادی، فضلِ حق رام پوری جیسے اساتذہ رہے ہوں اور مدرسین میں اپنے عہد کے مشاہیر درس دیتے ہوں، شعبۂ فارسی میں ملا غیاث الدین اور ان کے خصوصی تلامذہ پیر مولوی فرقی حبل المتین سے شریکِ ادارہ، شاداں بلگرامی، شاد رمان لکھنوی جیسے فارسی کے مستند زبان دان استاد رہے ہوں اور ملکوں ملکوں کے طلبہ کا مجمع رہتا ہو، وہاں اب نہ طلبہ ہوں نہ قابل اساتذہ۔ ویران درجے حکومت کی بے توجہی اور رام پور کے مسلم ممبرانِ پارلیمنٹ اور ممبرانِ اسمبلی کی بے حسی کا ماتم کرتے کرتے آخری سانسیں لے رہے ہیں۔ سدا نام رہے اللہ کا۔

[2] یہ اتفاق ہے کہ مولینا فضلِ حق رام پوری کا سالِ ولادت مولینا فضلِ حق خیر آبادی کا سالِ رحلت ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

منطق، فلسفہ اور کلام کے مشہور اور یگانہ استادوں میں شمار ہوتے تھے۔ عرشی صاحب نے اورینٹل کالج سے مولوی فاضل پاس کرکے مولینا سیّد احمد صاحب مرحوم کے مشورے پر مولینا فضل حق صاحب مرحوم کے درجۂ اوّل میں داخلہ لے لیا اور درجے کی اکثر خصوصی کتابیں مولینا سے پڑھیں۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے سرکاری کتب خانے میں جانے اور استفادہ کرنے کی اجازت لی تھی اور جانا شروع کر دیا تھا اور عام مطالعے کے ساتھ وہ حضرت عمر کے مکاتیب اور ملفوظات جمع کرنے میں منہمک تھے جس کی تحریکِ لاہور میں عربی کے بی اے اور انٹرمیڈیٹ کورسوں کے ترجموں کے اثنا میں حضرت عمر کے چند خطوط کو دیکھ کر ہی ہوئی تھی۔ کتب خانے سے ہی مرحوم سیّد ہاشم ندوی سے تعارف اور ملاقات ہوئی جو ذوق کی یکسانی اور فکر کی ہم آہنگی کی بنا پر بہت جلد دوستی میں بدل گئی۔

مدرسہ ندوۃ العلما کی سفارت | ندوۃ العلما کو مدرسے کے لیے سفیر کی ضرورت تھی عرشی صاحب اگرچہ درسِ نظامی کے طالب علم تھے لیکن ذہنی طور پر وہ شبلی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ندوے کے مدرسے ان کی دل چسپی قدرتی تھی۔ قدو قامت، چہرے مہرے سے پروقار اور اثر انداز شخصیت، سنجیدہ اور متوازن گفتگو، غرض یہ کہ ان میں وہ تمام اوصاف تھے جو ایک اچھے اور کامیاب سفیر کے لیے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ سیّد ہاشم ندوی مرحوم نے دارالعلوم کے مہتمم ڈاکٹر سیّد عبدالعلی مرحوم سے عرشی صاحب کا ذکر کیا اور وہ بہ خوشی ان کے سفیر مقرر کرنے پر راضی ہوگئے۔ اِدھر عرشی صاحب کو اس خدمت کے قبول کرنے پر آمادہ کرلیا اور سفیرِ ندوہ کی حیثیت سے انھوں نے ذمّہ داری سنبھال لی۔ اُن کے یہ سفارتی سفر خاصے کامیاب رہے لیکن یہ خدمت جس قسم کے تحمّل اور نرم گرم کی برداشت چاہتی ہے۔ عرشی صاحب اس سے عاری تھے، چنانچہ ایک ہی جھٹکا لگا تھا جس کو ندوے کی سفارت کے منصب کی مصلحت سے بہ جبر برداشت کرلیا لیکن آئندہ برداشت کی ہمّت نہ پاکر

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) حضرت مولینا نے مولینا عبدالحق خیرآبادی سے میر زاہد امورِ عامّہ کے چند سبق اپنے زمانۂ استاذی میں سنے تھے کیونکہ مولینا عبدالحق پرنسپل تھے اور وہ بڑے درجات کی استاذی کے لیے اپنے منتسبین کے علاوہ کسی کو برداشت نہیں کرتے تھے لیکن چند سبقوں کے بعد مولینا نے کہہ دیا کہ انہیں حاضر ہونے کی ضرورت نہیں۔ مولینا کا انتساب خیرآبادی سلسلے سے اپنے استاذ شمس العلما ہدایت علی صاحب بریلوی تلمیذ فضلِ حق خیرآبادی کے توسّط سے تھا۔

بہت جلد اس خدمت سے استعفا دے دیا۔

عرشی صاحب کی تجارت سے دل چسپی | ذریعۂ معاش کے طور پر عرشی صاحب تجارت کو پیشہ بنانا چاہتے تھے اور احباب سے سرمایہ جمع کرکے سلائی مشین اور ٹائپ رائٹر کی ایک جرمن کمپنی کی ایجنسی لے کر تجارت کا ڈول ڈال دیا تھا لیکن یہ ان کا شوق تھا، افتادِ مزاج نہ تھی۔ تجارت کے لیے جس قسم کا مزاج درکار ہے، وہ اس سے کوسوں دور تھے۔ جہاں تک کاروباری تجربے کا تعلق ہے، وہ صفر تھے، چنانچہ ان کی تجارت کامیاب نہ ہوسکی اور نقصان ہوا، آخر کاروبار چھوڑنا پڑا۔

سرکاری کتب خانے کی نظامت | تجارت اور اس کی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہوکر وہ ہمہ تن علمی کاموں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کتب خانے وہ جاتے ہی تھے اور اصلی مقصد علمی استفادہ ہی ہوتا تھا لیکن کھلی آنکھوں سے کتب خانے کے نظم و نسق پر اور ان کی خامیوں پر بھی ان کی نظر رہتی تھی۔ اس کے مخطوطات، مطبوعات اور نوادر پر بھی ان کی توجہ تھی، اس کی قدیم فہرستوں کی خامیوں کو بھی وہ جانتے تھے۔ کتابوں کی دیوار دوز الماریوں کے نقصان بھی ان کے سامنے رہتے تھے غرض یہ کہ مطالعے کے ساتھ ساتھ اس خزانے سے بھی انھیں ناقدانہ اور تعمیری واقف کاری تھی۔ یہ ۱۹۳۲ء کی بات ہے کہ کتب خانے کے عہدہ نظامت کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں۔ عرشی صاحب نے بھی درخواست دی۔ نظامت کا انتخاب ہوا اور اپنی شخصیت، صلاحیت اور کتب خانے سے مکمّل واقفیت کی بنا پر اُن کا انتخاب کرلیا گیا لیکن اس کی مقررہ تنخواہ کی تکمیل کے لیے لائبریرین کی فنی تربیت کی شرط عائد کردی گئی جسے بعد کو مسٹر چیپ مین سابق لائبریرین امپیریل لائبریری کلکتہ نے، جن کو کتب خانے کی انگریزی میں تفصیلی فہرست مرتب کرنے کے لیے دعوت دی گئی تھی، عرشی صاحب نے فنّی تربیت کی سند حاصل کرکے شرط پوری کردی اور ریاست نے اس سند کو قبول کرلیا۔

کتب خانے کی اصلاح اور فہرست نگاری | یہ تقرّر ان کی عین منشا تھا چنانچہ اب ان کی زندگی میں ٹھیراو آگیا اور وہ اپنے تصنیفی ذوق کی تسکین کے ساتھ ساتھ کتب خانے کے نظم و نسق کی اصلاح،

اس کی ترقی اور اس کی افادیت کو بڑھانے کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گئے اور اسی کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ ملازمت تو محض بہانہ اور ماہانہ تنخواہ صرف معاشی وظیفہ تھا، وہی کتب خانے کی خدمت، تو وہ ان کا ذاتی شوق اور گویا طبعی میلان تھا۔ سابقہ فہرست میں مخطوطات اور مطبوعات مخلوط تھے، کتابیں ملی جلی رکھی تھیں، فہرست پوری صحت اور دیدہ ریزی کے ساتھ مرتب نہ تھی، دیوار دوز الماریوں میں کتابیں تھیں، نہ جلد بندی ہیں یکسانی تھی نہ ہر کتاب کے لیے علیحدہ جلد کا التزام، ملازمین پابند اوقات نہ تھے۔ عرشی صاحب نے خود پابندیٔ اوقات کا شدت سے التزام کیا، ٹھیک وقت پر اپنے سامنے کتب خانے کی مہر تڑوا کر قفل کھلواتے اور مقررہ وقت پر اپنے سامنے قفل لگواتے اور مہر لگواتے، کتب خانے پہنچتے ہی کام میں منہمک ہو جاتے، رفتہ رفتہ سارا عملہ وقت کا پابند اور منصبی فرائض کو اوقات کار میں پوری تن دہی سے انجام دینے لگا۔ عام نظم و نسق کی درستی کے ساتھ جلد بندی کی یکسانی کی طرف توجہ کی مخطوطات اور مطبوعات کو الگ کیا اور جدید اصول پر فہرست نگاری کا ڈول ڈالا۔ تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے صحیح اور ضروری معلومات کی حامل فہرست کتنی ضروری ہے، اہلِ علم واقف ہیں پھر صحیح فہرست نگاری کے لیے جن دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، اُن کو وہی جانتے ہیں جنہوں نے ان مراحل کو طے کیا ہے۔ ساتھ ساتھ فہرست کی ترتیب نہایت ناشکور سعی ہے کہ جس پر عام ناظر کی نظر ہی نہیں جاتی اور وہ اُس دیدہ ریزی اور محنت کو محسوس ہی نہیں کر پاتا جو صرف ہوئی ہے خصوصاً مخطوطات کی فہرست میں۔ چونکہ میں نے عربی، فارسی اور اردو کتابوں کی پرچیوں پر عرشی صاحب کی نگرانی میں فہرست بنائی ہے اور ان کو مرتب کیا ہے اِس لیے عملاً میں ان دشواریوں سے واقف ہوں، جو اس راہ میں پیش آتی ہیں۔

فہرست نگاری | اصل متنوں کو (اگر وہ موجود ہیں) تاریخی ترتیب کے ساتھ مع ان کے متعلقات شروح و حواشی کی تاریخی ترتیب سے مرتب کرنا آسان نہیں پھر غیر معلوم الاسم اور غیر معلوم المصنف یا غیر محقق کتابوں کے ناموں یا مصنفین کے ناموں یا ہر دو کی تفتیش و تحقیق کے لیے اکثر پوری پوری کتاب پر نظر ڈالنا، دیگر فہرستوں سے اور دوسری کتب حوالہ سے مدد لینا کافی دردسری ہے،

اس میں بعض اوقات کئی کئی دن بھی لگ جاتے ہیں اور بعض اوقات یہ ساری عرق ریزی بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ ترقیموں، دستخطوں اور مہروں کو پڑھنے کی کوشش جو کبھی کبھی کافی محنت چاہتی ہے اور کبھی کبھی یہ ساری دردسری بے کار جاتی ہے پھر نام یا زمانے کی تعیین میں اُن سے فائدہ اُٹھانا اور ان کی اہمیت کی بنا پر فہرست میں ان کا حوالہ دینا۔ کتابوں کی روایتی فنون میں تقسیم کبھی بہت گہری نظر چاہتی ہے اور بعض صورتوں میں محض مناسب ترین فن پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے اور فہرست نگار اپنی رائے پر ہی اعتماد کرتا ہے اور رائیں مختلف بھی ہوتی ہیں۔ پھر اندراج کا مرحلہ آتا ہے، کتابوں کا ان کے مصنفین کے ناموں، عرفوں، لقبوں اور خطابوں اور زمانوں کے مطابق اندراج۔ یہ اور ان جیسے مراحل کے بعد مصنفین کا ان کی موجود کتابوں کے مقررہ حوالوں کے ساتھ اشاریہ۔

غرض یہ کہ کسی کتب خانے کی فہرست تاجر کتب کے ذخیرے کی فہرست نہیں جو ہر محرر قلم برداشتہ بنا کر رکھ دے، اس کے لیے علم، تجربہ، دقتِ نظر، قوتِ فیصلہ، تحقیقی ذوق اور محنت درکار ہیں۔ چنانچہ مغربی جامعات نے مشرقیات کی فہرست نگاری پر علامہ کی سندیں پیش کر کے ان کے کاموں کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

عرشی صاحب اور کتب خانے کی فہرستوں کی ترتیب | قدیم فہرستوں کی خامیاں عرشی صاحب کے سامنے تھیں اور وہ ان کو از سرِ نو مرتب کرنا چاہتے تھے اور اس کی ابتدا کر چکے تھے لیکن جدید ترتیب، کتب خانے کے عام معمولات کے ساتھ تنہا ان کے لیے ممکن نہ تھی، اس کے لیے انہوں نے ریاست کو متوجہ کیا۔ اربابِ اقتدار نے مختصر فہرست کے ساتھ انگریزی میں تفصیلی فہرست مرتب کرانے کی منظوری دے دی اور عرشی صاحب کی تسوید کی تصحیح اور ضروری کمی بیشی کے لیے امپیریل لائبریری کے سابق لائبریرین کو جو پٹنے کی خدا بخش لائبریری کی تفصیلی فہرست کی ترتیب میں بھی کام کر چکے تھے، ملازم رکھ لیا اور حاجی معین الدّین ندوی کا جو پٹنے میں کام کر چکے تھے، تقرر کیا، ساتھ ساتھ بعض مقامی ذی استعداد جوانوں کا عرشی صاحب نے انتخاب کیا، اب فہرست نویسی کا کام تیزی سے شروع ہو گیا۔ جہاں تک تفصیلی فہرست کی ترتیب کا تعلق تھا، یہ محسوس کیا گیا کہ نہ اس کے لیے کتب خانے کا

موجودہ عملہ کافی ہے اور نہ وہ جلد مرتب ہو سکتی ہے چنانچہ جتنے حصے کی تبییض ہو چکی تھی اس کو وہیں چھوڑ دیا گیا اور پوری توجہ مختصر فہرست کی طرف مبذول ہو گئی۔ عرشی صاحب کی رائے تھی اور غالباً صحیح تھی کہ عربی کی فہرست عربی میں، فارسی کی فارسی میں اور اردو کی اردو میں مرتب ہونی چاہیے لیکن بعض با اثر حضرات کا اصرار تھا کہ کل زبانوں کی فہرستیں انگریزی میں مرتب ہوں اور عرشی صاحب کو مجبوراً ان کے مشورے کو قبول کرنا پڑا۔۔۔ اور انھوں نے مرتبہ پرچیوں سے ترمیم و تنسیخ، حک و اصلاح اور جو بعد کو تحقیق مزید سے اضافے اور کمیاں ضروری تھیں، ان کو شامل اور کم کر کے انگریزی میں عربی کی مختصر فہرست کی تسوید و تبییض شروع کر دی ساتھ ساتھ طباعت اور پروف ریڈنگ بھی چلتے رہے جس میں وہ ضعف، تھکان اور بیماریوں کے باوجود آخری دم تک مصروف رہے۔ عربی مخطوطات کی بڑی تعداد کی چھے جلدوں میں فہرست مرتب ہو کر شائع ہو گئی، تقریباً ۱/۲ حصہ عربی مخطوطات کا اور ان کا اشاریہ اور فارسی، اردو کی انگریزی فہرستیں باقی ہیں۔ اس درمیان اردو کی کچھ کتابوں کی اردو فہرست بھی انھوں نے شائع کر دی تھی۔ اب ایسے لوگوں کا ملنا آسان نہیں جو کام کی تکمیل کر سکیں۔

موجودہ ایڈیشنل ڈایرکٹر فہرستوں کے چھوٹے ہوئے کاموں کو آگے بڑھا سکتے تھے۔ لیکن بورڈ کے مخالفانہ رویّے کی بنا پر اُنہیں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑ گیا۔ ساتھ ساتھ اندرونی دشواریوں سے بھی دوچار ہونا پڑا پھر ابھی تک نہ عدالت فیصلہ کر پائی ہے اور نہ اندرونی مشکلات سے نجات ملی ہے، ان حالات میں انہیں عرشی صاحب کے بعد سے وہ ذہنی سکون و اطمینان ہی میسّر نہیں آیا جو علمی کاموں میں مصروفیت کی پہلی شرط ہے۔

عرشی صاحب کی کتب خانے میں غیر معمولی مصروفیت

ترتیب فہارس تو ان کی نظامت یا ڈایریکٹری کے منصبی فرائض میں شامل تھی۔ جس میں وہ اپنے پورے ایام کارکردگی میں مصروف رہے اور حتی الامکان اس کو باحسنِ وجوہ انجام دیا لیکن حیرت ہوتی ہے کہ اس مصروفیت کے باوجود اتنی کثیر کتابوں، مقالوں اور علمی مکاتیب کا یہ عظیم، قابلِ قدر اور تحقیقی ذخیرہ اور وہ بھی رنگ برنگ موضاعات

پر کس طرح چھوڑا۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بساط سے زیادہ محنت مشقت کی۔ مسلسل کام کیا، کم سے کم اور انتہائی مجبوری پر چھٹیاں لیں اور اپنی صحت و تندرستی کی بازی پر لگا دیا، صحت برباد ہو گئی اور وہ بیماریوں کی پوٹ ہو گئے۔

مرض موت اور وفات عرشی صاحب کی صحت بہت دنوں سے خراب ہو چکی تھی، دردِ گردہ میں وہ مبتلا ہو گئے وقتاً فوقتاً درد کے دورے ہوتے تھے، کئی کئی دن صاحب فراش رہنے لگے تھے اور جوں ہی طبیعت درست ہوئی اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوتے کتب خانے جانا شروع کر دیتے اور پھر وہی ہمیشہ جیسی مصروفیت اور انہماک، آخری سالوں میں ان پر درد قلب کا اچانک دورہ ہوا، میں عیادت کے لیے گیا تو کہنے لگے کہ درد گردہ کے دورے پڑتے رہے ہیں اور ان کی شدت کسی نہ کسی طرح برداشت ہی کی ہے لیکن یہ وجع القلب الامان والحفیظ، اس کا اور درد گردہ کا کوئی مقابلہ نہیں، یہ ناقابلِ برداشت ہے، وہ تو کچھ سکنڈوں ہی کی کیفیت تھی، ناقابلِ ضبط اور ناقابلِ بیان تاہم، اس غیر معمولی طور پر انہیں ہلکان کر دیا، بے انتہا ضعف ہو گیا، آہستہ آہستہ ضعف تو دور ہو گیا لیکن انجانیا کے مستقل مریض ہو گئے اور گاہ بہ گاہ اس کے دورے پڑتے رہتے تھے، شدید بھی اور ہلکے بھی لیکن پہلے جیسا سخت دورہ کبھی بعد کو نہیں پڑا تاہم اب وہ جذباتی ہیجان نہیں برداشت کر سکتے تھے، خواہ مسرت سے ہو یا غم سے، ان کی زندگی احتیاطوں بھری زندگی تھی گھر والے بھی ان سے ایسی خبریں چھپاتے تھے جو ہیجان پیدا کریں، ہمیشہ اینجیڈ کی شیشی جیب میں رکھنے لگے، چلنے پھرنے اترنے چڑھنے میں لحاظ رکھتے تھے اور برابر ٹھیر ٹھیر کر اترتے چڑھتے، جہاں کسی قسم کی بے احتیاطی ہوئی اور سینے میں درد شروع ہو گیا گو شدید نہیں اور انھوں نے فوراً ہی اینجیڈ کی گولی زبان کے نیچے رکھ لی۔ دوائیں گویا روزمرّہ کی غذا ہو گئیں۔ علاج دلّی میں بھی ہوا اور بمبئی میں بھی، برابر ماہرین کے زیرِ علاج رہے لیکن کسی علاج سے مرض کا مکمل اور مستقل مداوا نہیں ہوا، تاہم وہ کتب خانے برابر جاتے رہے اور کام بھی پہلے کے سے ہی انہماک سے کرتے رہے۔ لیکن پہلی سی چلت پھرت نہ تھی۔ بیشتر اور بعد کو بالکل آرام کرسی پر بیٹھ کر وقت گذارتے لیکن کام میں کمی نہیں آئی۔ تین طرف کتابیں، بیچ میں

عرشی صاحب، یاکتاب سامنے اور اس کے اوراق کی لوٹ پلٹ یا سامنے کاغذ اور ہاتھ میں قلم۔ صبح وقت پر آنا جانا اور پورے وقت رہنا اور کام کرنا۔ کتب خانے سے آکر چائے پی کر وہ باہر نکل جاتے لیکن اب گھر ہی رہنے لگے اور عصر کی نماز کے بعد گھر کے صحن میں ہی دو چار چکر لگا لیتے۔

شروع ۱۹۸۱ء تھا کہ طبیعت خراب ہو گئی، کتب خانے جانا بھی چھوٹ گیا وہ گردوں کے بہت پرانے مریض تھے ہی چنانچہ گردوں کی تکلیف شروع ہو گئی، علاج ہوا اور جاتی رہی۔ فروری کا دوسرا ہفتہ تھا کہ کمزوری بڑھنے لگی بار بار غنودگی طاری ہو جاتی، خون کی جانچ کرائی گئی، بلڈیوریا تشخیص کیا گیا، اسی کی وجہ سے گردے ماؤف ہو گئے تھے زیادہ سے زیادہ پانی پینے کی ہدایت کی گئی، پانی وہ صحت کی طاقت میں بھی کم سے کم پیتے تھے۔ اس ہدایت پر بھی وہ پانی کی مقدار میں غیر معمولی اضافہ نہیں کر سکے، گلوکوز کی بوتلیں چڑھائی گئیں، طبیعت میں قدرے سدھار محسوس ہوا، خون کی دوبارہ جانچ کرائی گئی، معلوم ہوا کہ یوریا کی مقدار میں کمی نہیں ہوئی ہے پھر گلوکوز چڑھانے کی تجویز ہوئی، یہ ۲۴ر فروری کی بات ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد ڈاکٹروں کی تجویز کا ذکر کیا، وہ مزید گلوکوز چڑھوانے پر راضی نہیں ہوئے اور کہنے لگے کہ زیادہ احتیاطیں کبھی کبھی حماقت ثابت ہوتی ہیں لیکن بچوں اور گھر والوں کے مسلسل اصرار کے سامنے انہیں جھکنا پڑا اور رات کے دس بجے سے ڈیڑھ بجے تک گلوکوز چڑھی۔ خطرہ کچھ ایسا زیادہ قریب معلوم نہیں ہو رہا تھا گھر والوں کو کچھ زیادہ بے اطمینانی نہیں محسوس ہو رہی تھی کہ ڈو بجے کے بعد طبیعت اچانک خراب ہو گئی اور تشویشناک حالت ہو گئی، ڈاکٹر کو بلایا گیا، اس نے دماغ کی رگ پھٹ جانا تشخیص کیا، اب کسی فوری مؤثر علاج کا وقت گذر چکا تھا، چنانچہ ڈھائی، تین بجے ہندوپاک کا یہ محقق، غالب پر برِ عظیم کی سب سے بڑی سند، عربی لغت کا مزاج شناس اور اہلِ زباں کا مانا ہوا منشی، تفسیراتِ سلف کا نامور عالم، انتقادی اور تحقیقی مرتب، اور مشرقی مخطوطات کا ماہر فہرست نگار اپنے اہل و عیال اور متعلقین کو بلکتا سسکتا اور اہلِ علم کی محفل کو سونا کر کے پچھتّر سال دو ماہ بائیس دن کی عمر میں رخصت ہو گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ فجر سے ہی یہ دل دوز خبر پورے شہر میں آگ کی طرح پھیل گئی، اہلِ شہر ہجوم در ہجوم تعزیت کے لیے آنا شروع ہو گئے، دوسرے دن عصر کے بعد جنازہ اُٹھا، مشایعت کرنے والوں کا ایک سرا دروازے پر تھا اور دوسرا سرا قلعے کے میدان میں جنازے کے انتظار کرنے والے ہجوم سے مل گیا تھا۔ مولنا وجیہ الدین صاحب مرحوم نے نماز پڑھائی اور کتب خانے سے متصل نواب محمد سعید خاں اور نواب یوسف علی خاں کے مقبرے سے باہر افتادہ اراضی میں رام پور کے ہی نہیں بلکہ روہیلوں اور ملک کے فخر کو حاسدوں کی بدنظر سے بچانے کے لیے زمین نے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ رحمہ اللہ و غفر لہ و اسکنہ بجنات النعیم۔

عرشی صاحب کی شخصیت اور اخلاق عادات

عرشی صاحب عالم دین، واعظِ خوش بیان تھے، قصہ گوئی سے دور، ان کی تقریر مسلسل، مربوط اور موضوع سے چسپاں ہوتی، ان کا وعظ گویا عام فہم مذہبی خطابت تھی۔ ان میں نہ خشکی تھی نہ کھرا پن، خندہ پیشانی، نرم خو، خوش طبع اور خوش خلق تھے۔ بے تکلف احباب کی تفریحی نشستوں میں جن میں ان کی شخصیت مرکزی بن جاتی ان کے درمیان میں ہلکے پھلکے مزاحیہ جملے، برمحل اشعار اور لطائف ظرائف مجلس سے اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ ان کی گفتگو سادہ، واضح، رواں، سنجیدہ اور مربوط ہوتی تھی، دلائل سے مستحکم اور سننے والے کو متاثر اور ان کی ہمنوائی پر مجبور کر دیتی تھی۔

عرشی صاحب نہ خود پسند اور مغرور تھے نہ دوسروں کے بدبین یا کم بین، عیب جوئی اور عیب چینی ان کی عادت کے خلاف تھی، حرف گیری، طعن و طنز ان کا مزاج نہ تھا، غیبت اور بدگوئی ان کی افتادِ طبع نہ تھی، اپنی علمیت کا رعب جمانا یا چبا چبا کر اور جملوں اور لفظوں پر زور دے دے کر سننے والوں پر اثر ڈالنے کی کوشش کرنا ان کا اندازِ گفتگو نہ تھا، وہ مخاطب کو اس کی کہتری یا اپنی برتری کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ برابر درجے کے لوگوں کی گفتگو ہوتی تھی، بڑوں کا بات چیت، تخاطب اور نشست و برخاست میں حسب مراتب احترام ملحوظ رکھتے تھے، چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور ان کی حوصلہ افزائی؛

ہی خواہی اور ضرورت پڑنے پر اُن کی فہمائش شفیق اور مخلص مشیر کی طرح کرتے۔ وہ متواضع تھے لیکن تواضع میں غیر ضروری انکسار نہ تھا، بلا تصنع اور فطری۔

وہ غیور اور حساس تھے لیکن غیور اور حساس ہونے کے ساتھ حلیم اور متحمل المزاج بھی تھے مگر جہاں انہیں یہ وہم بھی ہو جاتا کہ کہیں ان کا مذاق تو نہیں بنایا جا رہا ہے تو بھپر اُٹھتے، ریاست قائم تھی غالباً ۳۵-۱۹۳۶ء تھا، ریاست کے دو چار اعلیٰ حکام کی دعوت تھی عرشی صاحب بھی مدعو تھے۔ ریاست کے ایک اعلیٰ قانونی مشیر جو جسمانی طور پر بہت نحیف تھے اور طبقۂ حکام میں اپنی بسیار خوری میں ان کی شہرت تھی، چنانچہ اعلیٰ قسم کی خصوصی دعوتوں میں ان کے ساتھیوں کی طرف سے ان کی بسیار خوری کا مذاق اُڑایا جاتا، کہ ہر طرف سے ہر رنگ کے کھانے پر ان پر بار بار اصرار کیا جاتا کہ اور لیجیے اور کھائیے۔ اتفاقاً اس دعوت میں وہ نہ تھے۔ شرکاء عرشی صاحب پر کھانے کا اصرار کرنے لگے، عرشی صاحب نے یہ اصرار معمول سے بڑھتا ہوا دیکھا تو انہیں خیال ہوا کہ کہیں یہ مجھے اُن قانونی مشیر کی جگہ تو نہیں دینا چاہ رہے ہیں، چنانچہ انہوں نے ان کی وجاہتوں اور حیثیتوں کا لحاظ رکھے بغیر نہایت درشت لہجے میں اُنہیں جواب دے کر خاموش کر دیا۔ اور وہ معذرت کرنے پر مجبور ہوئے کہ ان کا مقصد محض خاطر داری اور تواضع تھا نہ کہ تمسخر اور تفریح۔ عرشی صاحب کا ایک رکھ رکھاؤ تھا اور وہ اس کو ہر قیمت پر محفوظ رکھتے تھے۔ نہ خود اس کی حدوں سے آگے بڑھتے تھے نہ کسی کو بڑھنے دینے کی اجازت دیتے تھے۔

عام حالات میں تو وہ انانیت و غرور سے بہت دور تھے لیکن وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی محض دولت کے بل پر ان کا مقام متعین کرے۔ رام پور کے ایک نئے دولتمند سے رستے میں ان کا سامنا ہوا، کہنے لگے عرشی صاحب! آپ سے تو رستے گلی ہی میں کہیں آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔ عرشی صاحب کہنے لگے کہ ملاقات کیسے ہو، میں حاضر نہیں ہوتا کہ اس میں میری ذلت ہے اور آپ کی عزت میں میری حاضری سے کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ آپ تشریف نہیں لاتے جو میری اور آپ کی دونوں کی عزت میں اضافے کا باعث ہے۔ میں حاضر ہوں گا تو دیکھنے والے کہیں گے کہ کوئی ضرورت اور احتیاج ہوگی جو کھینچ کر لائی ہے،

خلوص اور دوستی نہیں سمجھیں گے۔ آپ تشریف لائیں گے تو میری عزت میں تو اضافہ ہوگا ہی لیکن دیکھنے والے یہ بھی کہیں گے کہ کیسے بے نفس اور متواضع ہیں کہ کسی غریب و مفلس کے گھر آنے میں عار نہیں محسوس کرتے اور اس طرح لوگوں کی نظروں میں آپ کی عزت بڑھے گی۔ یہ صاحب اس تشریح کو سن کر خاموش چلے گئے۔

یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اپنی علمیت کا اظہار ان کی عادت نہ تھی لیکن انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ہر کس و ناکس ان کے سامنے اپنی لیاقت اور علمی فہم و فراست کو مقابلے میں پیش کرے، مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے! رام پور کے ایک دولتمند کاروباری نے جو اپنے مصاحبوں میں علمی ذوق، کثرتِ مطالعہ اور نقد و نظر میں ایک خاص مقام رکھتے تھے، اپنے کسی مصاحب کو عرشی صاحب کے پاس کتب خانے غالب کے کسی شعر کا مطلب دریافت کرنے بھیجا، انھوں نے اس کا مطلب اُسے سمجھا دیا، وہ دوسرا کر آیا اور کہا کہ سیٹھ صاحب کہتے ہیں کہ میں اس کا مطلب یہ سمجھا ہوں۔ عرشی صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ میرا سلام کہیے اور کہیے کہ ہم لوگوں کی انانیت کی تسکین کے لیے ایک ہی تنگ سا میدان رہ گیا ہے اگر اس پر بھی آپ قبضہ کر لیں گے تو پھر ہماری تشفی اور تسلی کے لیے کیا رہ جائے گا۔

عرشی صاحب کی یہ عادت تھی کہ خود سلام میں پیش قدمی کی کوشش کرتے لیکن اگر انہیں یہ احساس ہو جاتا کہ فریقِ مقابل ان سے سلام کا طلب گار ہے تو ابتداً ترک کر دیتے، انہیں یہ برداشت نہ تھا کہ سلام کرنا انہیں کا منصب ہے۔ اگرچہ ایسے لوگ شاذ و نادر ہی تھے ورنہ شہر کے خواص اور تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ عوام بھی ان کی عزت اور پذیرائی کرتے تھے۔

عرشی صاحب نہایت ملنسار، خوش اخلاق، اپنوں کے ہی نہیں بلکہ غیروں کے دکھ درد میں بھی حتی المقدور ہمدردی اور مدد سے دریغ نہیں کرتے تھے اور یہ تو ان کی امتیازی

---

۵ مجھے اس وقت اپنے حافظے کی کمزوری کی بنا پر نام یاد نہیں آ رہا ہے۔ یہ اصل میں تلمیص ہے۔ (غالباً) چھٹی صدی کے ایک عالم کی کسی رئیس سے گفتگو کی۔ ابن خلکان کی "وفیات" میں ان عالم کے تذکرے میں اس گفتگو کا ذکر ہے۔

خصوصیت تھی کہ ان کے پاس سے کوئی شخص ناراض نہیں اٹھتا تھا، وہ کام کر سکیں یا نہ کر سکیں، وہ متوقع مدد پہنچا سکیں یا نہ پہنچا سکیں اس کو مطمئن کر دینے اور خوش رکھنے کی غیر معمولی قابلیت رکھتے تھے۔ ان کا مخالف بھی ان کے سامنے سے شاکی ہو کر نہیں جاتا تھا۔ یہ ان کی خداداد قابلیت اور گفتگو کا انداز تھا۔

عرشی صاحب کا اپنی اہل و عیال سے تعلق

عرشی صاحب کی اولاد ان کے احترام کے ساتھ محبت بھی غیر معمولی کرتی تھی۔ متعلقین و اہلِ خانہ میں بھی محبت و احترام ملے جلے تھے، گھر کے اندرونی معاملات، رکھ رکھاؤ اور برتنے کے طریقوں سے وہ بالکل بے تعلق رہتے۔ اولاد کے ساتھ ان کے برتاؤ میں شفقت اور محبت کے ساتھ ایک خاص حد تک بے تکلفی اور اپنا ہٹ تھی، گھر کے اندر ان کے تفریحی کھیلوں میں بھی شریک ہو جاتے، اُن سے ان کی دلچسپیوں کے متعلق باتیں کرتے، انہیں مشورے دیتے لیکن اپنا بڑا پن قائم رکھتے اور اولاد بھی ادب و تہذیب کو ملحوظ رکھتی۔ عرشی صاحب نے اگرچہ اپنی اولاد کو اپنے طرزِ عمل سے خود ہی ایک حد تک بے تکلف بنایا تھا تاہم وہ ان کی گستاخی کو کسی طرح برداشت نہیں کرتے تھے نہ اتنی ڈھیل دینے کے روادار تھے کہ وہ ان کی حکم عدولی کریں اور تجرد اختیار کریں یا ان کی موجودگی میں ان کی ہمت افزائی کے بغیر شور و غل کریں یا کھیل کود میں مصروف ہوں۔ غرض یہ کہ اولاد کے ساتھ ان کا عمل بڑی حد تک متوازن تھا، نہ وہ بالکل الگ تھلگ رہنے اور رعب داب کی زندگی گذارنے کے حامی تھے نہ ایسے اختلاط کو پسند کرتے تھے کہ اولاد بے قابو ہو جائے اور بزرگانہ و خوردانہ رکھ رکھاؤ کو فراموش کر بیٹھے۔ ان کی اولاد کے لیے اس سے بڑی کوئی سزا نہ تھی کہ وہ ان سے بول چال ختم کر دیں اور ان میں دلچسپی لینا چھوڑ دیں۔

عرشی صاحب اور افسرانِ بالا و حکام عرشی صاحب اپنے افسران اور حاکمانِ بالا سے ملنے جلنے کے قائل تھے، سماجی تعلقات بھی رکھتے تھے لیکن بے ضرورت یا بے طلب آمد و رفت سے اپنی قدر نہیں کھوتے تھے نہ اپنی عزتِ نفس پر آنچ آنے دیتے تھے۔ رسمی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور رائج فرقِ مراتب کی پاسداری کے ساتھ ان کی ملاقاتیں بڑی حد تک مساوی

سطح پر ہوتی تھیں اور حکام و افسران کو بھی اپنی بھاری بھر کم شخصیت اور پر وقار انداز سے مجبور کر دیتے تھے کہ وہ بھی ان کا احترام کریں اور ان کی حیثیت کو ملحوظ رکھیں۔

ان کی راستی، راست گوئی، نیک نیتی، فہم و فراست اور کتب خانے کی ترقی و بہبود سے طبعی وابستگی کا اثر تھا کہ افسرانِ بالا ان پر غیر معمولی اعتماد کرتے، ان کی تجویزوں اور مطالبوں پر توجہ دیتے اور منظور کرتے پھر انہیں یہ بھی احساس رہتا کہ وہ اپنی ذات کے لیے ان سے کوئی استدعا نہیں کرتے، اپنی کوئی شخصی ضرورت اور احتیاج ان کے سامنے نہیں لے جاتے یہی وجہ تھی کہ وہ پوری جرأت اور اعتماد کے ساتھ اپنے معروضات رکھتے اور پوری قوت سے ان کی وکالت کرتے اور بڑے سلیقے سے اور غیر جارحانہ انداز میں پیش کرتے۔

رام پور کے آخری با اختیار رئیس نواب رضا علی خاں کا عہد سیاسی خلفشار کا عہد تھا، رئیس و رعایا میں حقوق و اختیارات کی لڑائی شروع ہو گئی تھی لیکن عرشی صاحب کو اپنے کام سے کام رہا، انھوں نے راعی و رعیت کے اختلافات سے الگ تھلگ رہنے کی کامیاب کوشش کی اور اپنی حقیقی غیر جانب داری اور صرف اپنے کام سے کام رکھنے کے طرزِ عمل سے کسی طرف کا اعتماد مجروح نہ ہونے دیا۔

عرشی صاحب اور کتب خانے میں ان کا ماتحت عملہ

عرشی صاحب کا کتب خانے میں کوئی وقفہ بغیر کام کے نہیں گذرتا تھا جس کا اثر ماتحت عملے پر بھی پڑتا تھا اور وہ بھی اپنے فرائض دیکھ بھال، سوجھ بوجھ اور آتی دہی سے انجام دیتا تھا، بہت کم انہیں تنبیہ کی ضرورت پڑتی تھی اور وہ انہیں سخت گیر افسر کے بجائے اپنے مخلص، محترم اور قابلِ اعتماد بڑے بھائی کی حیثیت دیتے تھے اور کتب خانے سے متعلق فرائض کو مشترکہ ذمہ داری سمجھتے تھے۔ کتب خانے کے نظم و نسق اور اس کے اندر کے اصول و ضوابط کی عرشی صاحب نگرانی بھی کرتے تھے اور پابندی بھی اور مناسب انداز سے ان کی پابندی حسبِ مراتب کرانا بھی جانتے تھے، کتب خانے میں سگریٹ پینا یا دیا سلائی جلانا ممنوع ہے اور یہ ممانعت ایک تختی پر لکھی ہوئی مطلع

کی میز پر موجود رہتی ہے، ایک بار کا واقعہ ہے کہ نواب صاحب اپنے عہد حکمرانی میں کتب خانے آئے، نواب صاحب سگرٹ کے سخت عادی تھے، اُنھوں نے سگرٹ سلگا کر پینا شروع کر دیا، عرشی صاحب روک تو سکتے ہی نہ تھے، انھوں نے غیر متعلق اور ارادی انداز سے تختی کو سامنے کر دیا، نواب صاحب نے تختی پر نظر پڑتے ہی سگرٹ بجھالیا۔ اور کہنے لگے، مجھے خیال نہیں رہا۔ غرض یہ کہ خود عرشی صاحب کا اپنا عمل عملے اور کتب خانے میں آنے جانے والوں کے لیے سبق آموز ہوتا تھا اور کسی خاص تنبیہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

عرشی صاحب عملے سے کام ہی نہیں لیتے تھے بلکہ ان کے مفاد کی نگرانی بھی کرتے تھے اور اگر اُن کو کوئی فائدہ پہنچا سکتے تو اس سے دریغ نہیں کرتے تھے اس لیے ان سے کسی کو مخالفت تو کیا اختلاف بھی نہیں تھا اور کام پوری یکسوئی سے چلتا رہتا تھا اور دفتر کے روزمرہ کاموں کے ساتھ نہایت اطمینان اور سکون سے وہ اپنے تصنیفی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔

یہ بھی واقعہ ہے کہ افسران حتیٰ کہ خود نواب صاحب بھی عرشی صاحب پر غیر معمولی اعتماد کرتے تھے، ان کی سفارش اور شکایت دونوں کی اہمیت تھی تقرّر اور برخاستگی میں ان کی سفارش اور شکایت کو خاصا دخل تھا جس کو عملہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور اس سے بھی مجھے انکار نہیں کہ عملے کے بے عذر تعاون میں عرشی صاحب کے ذاتی اثر کے ساتھ ان کی اس حیثیت کو بھی دخل ہو۔

عرشی صاحب اور لباس وضع اس زمانے کے عام شرفاء کی طرح عرشی صاحب اپنی وضع کا زندگی کے شعبے میں خاص لحاظ رکھتے تھے، تنگ مہری کا پاجامہ، قمیص، شیروانی، بوٹ اور سیدھی باڑ کی مخملی ٹوپی ان کا عام بیرونی لباس تھا، قلعے میں داخلے کے لیے چونکہ پگڑی لازم تھی اس لیے کلاہ پر پگڑی اندرونِ قلعہ ان کی ضرورت تھی، عام لباس میں شامل نہ تھی۔ جاڑوں میں شیروانی پر اُور کوٹ بھی پہن لیتے تھے، نوجوانی میں شیروانی کے ساتھ پتلون بھی استعمال کر لیتے تھے لیکن کتب خانے کی ملازمت کے بعد ان کو پتلون کے

ساتھ نہیں دیکھا گیا۔ کتب خانے، بازار یا شہر کی عام سڑکوں پر وہ بغیر شیروانی کے نہیں جاتے تھے۔ جس سے جو تعلق تھا اور جس انداز کا تھا اس کو برابر نبھاتے تھے، جہاں جاتے تھے اور جس انداز سے جاتے تھے اسی طرح برابر جاتے تھے، جہاں ان کی نشست تھی التزام سے وہاں بیٹھتے تھے، ملاقات کا جو انداز تھا اس کی پابندی کرتے تھے۔

روزمرّہ کے معمولات

عرشی صاحب کے جدی مکانات تو پھلوار میں ہی تھے لیکن ان کے والد مرحوم محلہ پکا باغ میں رہنے لگے تھے عرشی صاحب کا معمول تھا کہ صبح کو چائے پیتے تھے اور دس بجے سے پہلے کھانے سے فراغت کے بعد کتب خانے کے لیے روانہ ہو جاتے، چار بجے کے بعد گھر آکر چائے اور ہلکا ناشتہ کرنے کے بعد بازار آجاتے اور جامع مسجد کی مشرقی سمت کے نیچے ابتداءً ایک بساط خانے کی دکان پر اور اس پر جب نشست ختم ہوگئی تو نصر اللہ خاں کے بازار میں ایک کتابوں کا پیوں کی دوکان پر اور اُس دوکان کے ختم ہو چکنے کے بعد جامع مسجد کی مشرقی سمت کی دوسری ایک پارچہ فروش کی دوکان پر بیٹھنے لگے۔ جب انھوں نے اپنی تنخواہ کی قسطوں پر ادائی کی بنا پر ریاست سے قرض لے کر پھلوار میں مکان بنوالیا تو کچھ زمانے قاضی گلی کے کرائے کے مکان میں رہنے اور بہت کم دنوں اپنی خسرال کے مکان گھیر سنی میں رہنے کے بعد اپنے نئے مکان اور قدیم جدی محلے میں رہنا شروع کر دیا اور معمول یہی رہا۔ ہاں پہلے کھانا گھر کھا کر کتب خانے آتے تھے پھر کتب خانے میں ہی کھانا منگانے لگے۔ روزانہ کبھی صبح کو کتب خانے جانے سے پہلے اور کبھی مغرب یا عشا کے بعد اپنے پھوپی زاد بھائی اور بعد کے سمدھی بھی، کے مکان پر جو پھلوار میں ہی تھا چلے جاتے اور جب تک ان کے ماموں قاضی گلی میں رہے مغرب کے بعد وہاں بھی ضرور جاتے۔ جب تک ان کی خوش دامن حیات رہیں کتب خانے سے لوٹتے ہوئے ان کے یہاں آجاتے۔ جمعے کا دن مغرب کے بعد میرے گھر کے لیے مخصوص تھا، قاری محمد اسماعیل صاحب مجددی جب تک زندہ رہے سنیچر کے دن مغرب کے بعد مجھے لیتے ہوئے ان کے یہاں حلقے والی زیارت پر چلے جاتے۔ ان معمولات میں اس

وقت تک کوئی فرق نہیں آیا جس وقت تک ان کو بیماریوں اور ضعف نے انہیں گھر میں رہنے پر مجبور نہیں کر دیا۔ عرشی صاحب گھر پر کوئی رسالہ، کتاب پڑھنے، گھریلو خط و کتابت کرنے کے علاوہ تحقیق و تصنیفی مطالعہ اور کام بالعموم گھر پر نہیں کرتے تھے۔ ان کا کاموں کے لیے کتب خانہ ہی تھا۔ عام طور سے ظہر کی نماز کتب خانے میں پڑھتے اور باقی نمازیں گھر میں ادا ہوتیں، جمعے کی نماز محلے کی مسجد میں پڑھتے۔ روزے التزام سے رکھتے۔ آخری زمانے میں ضعف زیادہ ہوگیا تو فدیہ دینا شروع کر دیا۔

عرشی صاحب کی مجموعی زندگی عرشی صاحب کی مجموعی زندگی دوسرے اہل علم کی طرح یکساں اور سپاٹ تھی، نہ اس میں رنگینیاں تھیں نہ چونکا دینے والے واقعات و حوادث ایک پرسکون بہاؤ تھا جو مدھم رفتار سے جاری تھا تاہم ان کی شخصیت میں دلکشی تھی۔ ان کا وسیع اور گہرا مطالعہ، استحضار اور حافظہ، خوش بیانی اور خوش گفتاری، خوش مذاقی اور خوش خصالی، پرمغز اور پر معلومات صاف ستھری گفتگو، برمحل اور مناسب چبھتے جملے، فقرے، تاریخی لطائف و ظرائف، شخصی تجربے، دل چسپ اور دل نشیں انداز، محتاط مزاج، حسب ضرورت دل پسند دید کے و پرخلوص دلسوزی کے ساتھ بزرگانہ نصیحتیں، نئے تاریخی اور علمی انکشاف، منتخب پسندیدہ اشعار، بالوجوہ تغلیطیں اور تصحیحیں۔ ان سب میں مخاطبین، مجلس اور موقع و محل کو ملحوظ رکھنا یا پھر ان کی مستقل شگفتہ مزاجی، ان سب نے مل کر ان کی شخصیت میں رس گھول دیا تھا۔ وہ عطر مجموعہ تھے جس سے ہر مذاق کے لوگ مستفید ہوتے اور لطف اندوز ہوتے۔

عرشی صاحب کا شعری مذاق عرشی صاحب شاعر تو تھے ہی لیکن ان کی شعر گوئی اپنے لیے تھی نہ وہ مشاعروں میں پڑھتے تھے نہ دوسروں کو اپنے اشعار سناتے تھے بلکہ اپنی شعر گوئی کا اظہار بھی انہیں پسند نہ تھا، میں نے انہیں صرف ایک بار ان کے جرمن زبان کے استاذ صاحبزادہ واجد علی خاں صاحب واجد واشک کے اصرار پر تحت اللفظ اور نہایت سادہ انداز میں ایک مشاعرے میں اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اور وہ بھی مشاعرے کی ابتدا میں پڑھتے سنا، انھوں نے اردو، فارسی کے سیکڑوں شعر سنائے ہیں اور کبھی کبھی عربی

کے بھی لیکن میں نے کبھی ان سے ان کے اپنے شعر نہیں سنے۔

وہ غزل کے شاعر تھے اور سادہ زبان میں صاف اور بامزا شعر نکالتے تھے اور محض تفننِ طبع کے طور پر۔ جتنا کچھ ان کا کلام موجود ہے، اس پر تبصرہ کرنے کے بجائے میں نمونے کے طور پر ان کی ایک غزل پیش کیے دیتا ہوں جو تحریک کے کسی شمارے میں ان کی کچھ دوسری غزلوں کے ساتھ ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی ہے:

لبوں پہ شکوۂ ایام آہی جاتا ہے — کچھ اس طرح بھی ترا نام آہی جاتا ہے
قفس میں راحت و آرام ڈھونڈنے والے — تڑپ تڑپ کے بھی آرام آہی جاتا ہے
نسیم کے نہ سہی بجلیوں کے ہاتھ سہی — کبھی کبھی کوئی پیغام آہی جاتا ہے
وہ شکستہ سہی پھر بھی تری محفل میں (کذا) — ہمارے ہاتھ تلک جام آہی جاتا ہے
نگاہ لطف کی جرأت فزائیاں توبہ — ہمارے ضبط پہ الزام آہی جاتا ہے
یہ اپنے بخت کی خوبی تو دیکھنا عرشی — کہ ہوش ہم کو سر شام آہی جاتا ہے

عرشی صاحب قدیم روایتی شاعری کو پسند کرتے تھے، ترقی پسند یا جدیدیت کی نمائندہ شاعری ان کا ذوق نہ تھا۔ ان کی تقریظیں، تبصرے جو کچھ بھی ہیں میرے علم میں ان کا تعلق روایتی شاعری سے ہے۔ معاصر شعرا پر وہ جو تبصرے کرتے تھے، اصرار یا مروت کی بنا پر کرتے تھے اور لحاظ رکھتے تھے کہ وہ باعثِ ناراضی و ناخوشی نہ ہو، اور ان کا یہ رویہ تقریر، تحریر اور عام گفتگو میں بھی عام اور ان سے خاص تھا۔ اور اس میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کے ان تبصروں اور تقریظوں میں مجھے ایک تقریظ ہمیشہ یاد رہے گی۔ ایک صاحب تھے جو ان کے خاص طور سے پرستار تھے اپنے کلام کا مجموعہ تبصرے کے لیے دیا، یہ میں نے بھی دیکھا تھا۔ اس ضخیم مجموعے میں شاید ہی کچھ موزوں کلام ہو پھر ہر طرح کی لفظی معنوی غلطیوں سے بھرا ہوا۔ ان صاحب کو عرشی صاحب کے تبصرے پر اصرار تھا اور عرشی صاحب ان کے مخلصانہ تعلق کی بنا پر قوت سے انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ عرشی صاحب نے تبصرہ کیا اور وہ کتاب کے ساتھ چھپا بھی۔ عرشی صاحب نے اس دیوان پر مقدمے اور پیش لفظ کے طور پر تفصیل سے لکھا کہ یہ عہد تجربوں کا ہے، اردو شاعری میں

بھی نت نئے تجربے ہو رہے ہیں یہ تو وقت بتائے گا کہ کون سے تجربے کامیاب اور مقبول ثابت ہوئے اور کون سے ناکام اور مسترد اور کون کہہ سکتا ہے کہ جو تجربے اس میں کیے گئے ہیں وہ قابلِ اعتنا اور قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔ عرشی صاحب کا اصل تبصرہ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے لیکن اس کا خلاصۂ مفہوم یہی ہے۔ عرشی صاحب نے یہ تبصرہ مجھے بھی دکھایا تھا اور میں ان کی ذہانت پر حیران رہ گیا تھا اور میں نے کہا تھا کہ اپنا پہلو بچا کر اس رُخ سے تقریظ لکھنا آپ کا ہی کام تھا۔

کتب خانے کی اصلاح و ترقی میں عرشی صاحب کا حصّہ

عرشی صاحب نے کتب خانے کی خدمت میں قریب قریب پچاس سال گزرے اور اُسے اپنی چیز سمجھ کر دل چسپی لی، حکومت نے ان پر بھروسا کیا، اُن سے بھرپور تعاون کیا، ان کو انتظام، اصلاح و ترقی کا موقع دیا اور عرشی صاحب نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا چنانچہ انھوں نے مطبوعات، مخطوطات اور نوادر کو الگ کیا، مخطوطات کے لیے خصوصیت سے گاڈریج کی لوہے کی الماریاں مہیا کیں، فہرستوں کی تجدید کی اور ان کو زیادہ صحت کے ساتھ مرتب کرایا، اس تجدید کے لیے ضروری عارضی عملہ بہم پہنچایا، انگریزی میں مختصر ضروری اور اہم معلومات کے ساتھ فہرستیں مرتب کرنی شروع کیں اور اچھی خاصی جلدیں اپنی موجودگی میں شائع کر دیں۔ کارڈ کیٹلاگ، تصنیف وار اور مصنف وار تیار کرایا۔ کتب خانے کی بے کار ردّی کے ڈھیر سے بہت سے قیمتی مخطوطات اور نوادر چھانٹے۔ بعض پورے پورے کتب خانوں کو اس کتب خانے کے لیے حاصل کرانے کی کوشش کی، رام پور کے بہت سارے افراد کو بے قیمت یا باقیمت کتابوں کو کتب خانے میں داخل کرانے پر آمادہ کیا، چنانچہ خود میں نے ساتویں صدی کے بعض تصوّف کے مخطوطات ہدیہ کیے اور تفسیر کشاف کا کچھ اُوپر سات سو ہجری کا مخطوطہ جو زمخشری کے شاگرد ابو اسحاق کرہی کے نسخے کی نقل تھا اور اس پر زمخشری کی منظوم سند بھی منقول تھی، جو میرے پاس دیمک نے ضائع کر دی تھی، بطور ہدیہ دیا[1] اس نسخے کی ایک ندرت یہ بھی ہے کہ یہ دو کالموں میں

---

[1] بنارس کے "مولوی مہیش پرشاد نے اس کے سن کتابت اور اس کے منقول عنہ کی تفصیل اور منظوم سند نقل کر لی تھی اور کوشش کے باوجود مجھے ان کا مکتوبہ اندراج نہیں حاصل ہو سکا۔

ہے۔ ساتھ ساتھ متعدد پرانے مطبوعات بھی دیے۔ عرشی صاحب نے جلدوں کی طرف بھی توجہ کی اور متعدد کتابوں والی جلد سے کتابیں الگ کیں اور جلدوں میں یکسانی پیدا کی اور اس کے لیے مستقل دائمی انتظام کیا، اس کے انتظام کو درست کیا اور اس میں اصلاحات کیں۔ غرض یہ کہ عرشی صاحب نے اپنی صواب دید سے جو اصلاحیں اور جدتیں کی تھیں کتب خانے کے لیے قلعے کی نہایت اہم اور خوبصورت عمارت حامد منزل حاصل کی جس کا نہایت وسیع اور خوبصورت ایوان کبھی دربار ہال تھا۔

لیکن افسوس ہوتا ہے کہ عرشی صاحب کی دائم المرضی اور فہرست نگاری میں غیر معمولی مصروفیت کی بنا پر نئی مطبوعات خصوصاً عربی فارسی کی مطبوعات میں بہت پیچھے رہ گیا۔ لعل اللہ یحدث بعد ذٰلک امرا۔

عرشی صاحب کی تصانیف اور اعزازات

میں یہاں عرشی صاحب کی تصانیف کی تفصیل میں نہیں پڑوں گا، ان کی تقریباً مکمل فہرست ان کے صاحبزادے اکبر میاں نے نذرِ عرشی میں دے دی ہے۔ میں یہاں ان کی تصنیفات کے متعلق چند باتوں پر ہی اکتفا کروں گا۔

مضامین اور مقالات کو چھوڑ کر ان کا بڑا کام تحقیق اور ترتیبی ہے، انھوں نے نہایت تحقیق و تفتیش کے ساتھ دوسروں کی تصنیفات یا ان کے مواد کو مرتب کیا ہے، مکمل کیا ہے۔ اور نہایت قیمتی حواشی سے ان کو مفید تر بنانے کی کوشش کی ہے اور نہایت محنت اور کاوش سے ان پر مقدمات لکھے ہیں جو اپنی مستقل تحقیقی تصنیفات کا درجہ رکھتی اور ان کی وسعت نظر اور عمیق مطالعے کی نمایندہ ہیں۔

عرشی صاحب کے مرتبات، حواشی اور مقدمات کا زیادہ تر تعلق اردو، فارسی عربی ادب و لغت سے ہے، کمتر تاریخ و تذکرے سے اور سب سے کم اسلامیات و تفسیر سے۔

ان کی عام تصنیفی زبان اردو ہے لیکن انھوں نے عربی قدیم میں بھی لکھا ہے اور صحتِ زبان کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے جس کا عرب علما نے بھی اعتراف کیا ہے، ان کی

تفسیر ثوری کا ان کا نام ..... بغیر جو دوسرا ایڈیشن عرب سے شائع ہوا ہے اس میں تحی مقدمے، حواشی اور تکملون کی زبان میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ انھوں نے انگریزی میں عربی کتابوں کی فہرست تو مرتب کی ہی ہے اور بعض تعارفی مقالے بھی لکھے ہیں۔

عقلیات یا معقولات، منطق، فلسفہ، کلام اور اصول ان کا مذاق نہیں رہا چنانچہ ان فنون سے متعلق انھوں نے کوئی کتاب مرتب کی نہ ان کے متعلق مقالات و مضامین لکھے۔

عرشی صاحب کے فضل و کمال اور ذوقِ تحقیق و تفتیش کو ملک کے اہلِ علم تحقیق نے تو خراجِ تحسین پیش ہی کیا ہے، ان کی حیات میں بھی اور بعد وفات بھی جن کی مثال نذر عرشی اور اس مذاکرے کو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ملک کی مؤقر مجلس ساہتیہ اکیڈمی نے نقد انعام دے کر اور بھارت کے صدر نے پریزیڈنٹ اوارڈ دے کر ان کی علمی لیاقت اور تحقیقی ذوق کا اعتراف کیا ہے۔

تفسیرِ قرآن کے متعلق عرشی صاحب کا مسلک

عرشی صاحب کا خیال تھا کہ قرآن مجید کی آیتوں، جملوں، فقروں اور لفظوں کا وہی مفہوم ہے جو قرآنِ اوّل میں صحابہ اور تابعین نے سمجھا تھا۔ ان کے معنی کسی اور طرح سمجھنا غلط ہیں۔ لغت اور قواعد کی مساعدت کے باوجود ان کی کوئی ایسی تاویل جو سلف کے تفاہم کے خلاف ہو قابلِ رد ہے۔ اس موضوع پر مجھ سے متعدد بار گفتگو ہوئی ہے۔ قرآن میں ضمنی طور پر طبیعاتی، ارضیاتی، فلکیاتی اور جغرافیائی بیانات اور قصص و واقعات کو کسی اور طرح سمجھنے کی کوشش کرنا جس سے جدید سائنسی اور اثری معلومات سے تصادم نہ پیدا ہو، قرآن کی صحیح تاویل نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ قرآن کا مقصدِ نزول لوگوں کی ہدایت ہے، اس میں مذکور واقعات یا طبیعیاتی بیانات میں عربوں کا اسی عہد کا تفاہم معتبر ہے، مقصد ان کے مقبولات، مسلمات اور مشہورات یا متفاہمات سے ان کی ہدایت ہے اور وہ حاصل ہوتی ہو تو مقصدِ نزول پورا ہو جاتا ہے۔ رہی ان کی ذاتی صداقت، تو وہ قرآن کے اصل موضوع یعنی ہدایت سے خارج ہے اور قابلِ اعتنا نہیں اور باوجود لغت و قواعد اور محاورۂ عرب کے ساتھ دینے کے ان کی ایسی تاویل جو عصری معلومات سے متصادم نہ ہو قابلِ قبول نہیں۔ قابلِ قبول اور صحیح معانی اور

مفاہیم وہی ہیں جو عہدِ نزول میں سمجھے گئے۔ میں قرآن مجید میں ایسے لوچ کا قائل تھا کہ اس کی بنا پر ہر عہد کے معلومات سے قرآنی بیانات کی مطابقت قائم رہے اور ان کی صداقت کسی زمانے میں مشکوک نہ ہونے پائے۔ چنانچہ میرے نزدیک ’لاتنقضی عجائبہٗ‘ کے تحت جس طرح اس کے بیانات کی اس عہد کے عرب تکذیب نہیں کر سکے اسی طرح یونانی طبیعات و الٰہیات کی درآمد کے بعد مسلم فلاسفہ نے بھی اپنے تفاہم کے لحاظ سے ان کی تصدیق ہی کی اور آج علمائے طبیعات بھی اپنے تفاہم کے مطابق ان کی تکذیب نہیں کر سکے۔ اس کا یہ لوچ بھی ایک طرح سے اس کے وجوہِ اعجاز میں شامل ہے۔ میرا یہ اختلاف عرشی صاحب سے برابر قائم رہا اور ہم دونوں نے اس اختلاف کو بہ خندہ پیشانی برداشت کیا اور ایک دوسرے کی نیک نیتی اور فہم کو ہدفِ ملامت نہیں بنایا۔

عرشی صاحب کا فقہی مسلک عرشی صاحب بغیر تحزب اور تعصب کے حنفی مسلک کے پیرو تھے، اور امام ابوحنیفہ کے تفقہ اور ان کی معرفتِ حدیث کے قائل، ایک اہلِ حدیث عالم جو اہلِ حدیث علما کا تذکرہ مرتب کر رہے تھے، مجھے اپنے حافظے کی غیر معمولی کمزوری کی وجہ سے ان کا نام یاد نہیں پڑتا، کتب خانے میں آکر یہاں کے محدثین کے متعلق ان کے مسلک کی تحقیق کرنے کے لیے عرشی صاحب سے بھی ملے تھے۔ ان صاحب سے عرشی صاحب کی امام ابوحنیفہ کی حدیث دانی پر گفتگو شروع ہو گئی، اور کیا کیا ہوئی میرے علم میں نہیں، عرشی صاحب نے اس بات چیت کے متعلق اتنا بتایا کہ میں نے آخر میں ان سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک امام ابوحنیفہ کے استخراج کیے ہوئے مسائل تخمیناً کتنے فی صدی احادیث صحیحہ کے خلاف ہیں۔ انھوں نے غالباً پچیس تیس فی صدی کے قریب بتائے تو عرشی صاحب نے کہا کہ ذرا سوچیے تو وہ کتنا بڑا آدمی ہوگا جو نبی نہ ہونے کے باوجود ایک نبی کے ملہمات کے ساتھ تقریباً پچھتر فی صد مسائل میں مطابقت رکھ رہا ہے۔

عرشی صاحب حنفی ہونے کے باوجود بالکل اندھی تقلید کے حامی نہ تھے۔ اگر انہیں کسی بات کی تحقیق ہو جاتی تو وہ اس پر ہی عمل کرتے چنانچہ ’الصدقات للفقراء الخ‘ میں صدقات کے عام ہونے کی بنا پر نافلہ صدقات کے کھانے کو وہ اپنے لیے ناجائز جانتے تھے جس سے

مجھے اختلاف تھا۔ میرے نزدیک نافلہ صدقات کے عام ہونے کی بنا پر نافلہ صدقات کا وہ حصّہ جو اغنیا، کو کھلایا جائے، وہ صدقے سے خارج ہو کر دعوت اور ہدیے میں شامل ہو جاتا ہے، صدقہ نہیں رہتا اور ہدیہ اور دعوت قبول کرنا اور کھانا ناجائز نہیں۔ یہ اختلاف بھی مجھ میں اور عرشی صاحب میں برابر قائم رہا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے، میں نے استصواباً کہا کہ ایسے اکابر صحابہ جنھوں نے بالعموم پنج وقتہ نمازیں آنحضرت کی امامت میں پڑھی ہیں، ان میں نماز کی جزئیات میں اختلاف کی توجیہ ہو سکتی ہے کہ قرنِ اوّل میں نماز کے غیر اہم فروع میں جزوی اختلاف قابلِ لحاظ نہ تھے اور آنحضرت کی اقتدا میں لوگ مختلف انداز سے نماز پڑھتے تھے، کوئی متعیّن صورت اور لازمی طریقہ نہ تھا۔ کوئی ہاتھ سینے پر باندھتا تھا کوئی ناف پر اور کوئی ناف کے نیچے۔ اس میں اس کی اپنی پسند کو دخل ہوتا تھا اور خود آنحضرت کا بھی کوئی متعین طریقہ نہ تھا۔ بالکل متعیّن صورتیں مختلف صحابہ کی پسندیدہ صورتوں کی تقلید میں مختلف فقہانے اختیار کریں۔ چنانچہ یہ اختلاف فقہا کے طبعی میلان سے تعلق رکھتا ہے، اس میں واجب اور مسنون ہونے کو دخل نہیں، سب ہی مسنون طریقے ہیں۔ عرشی صاحب نے میری اس توجیہ کو پسند کیا اور اس میں ان کی حنفی تقلید آڑے نہیں آئی۔

اُن کی بے تحزّبی کا ایک واقعہ اور میری نظر میں ہے بلکہ میرے سامنے کا ہے۔ میں عرشی صاحب اور رام پور کے ایک جانے پہچانے عالم ایک جنازے میں شریک تھے اور ایک صف میں قریب قریب بیٹھے تھے۔ اہلِ شہر عرشی صاحب کو جانتے تھے اور ان کی علمیت بھی چھپی ہوئی نہ تھی لیکن وہ رام پور کے مولویوں اور مولاناؤں میں نہ تھے اور نہ فتوے دیتے یا لکھتے تھے۔ محلّے کے ایک صاحب آے اور مولانا صاحب سے دریافت کیا کہ ہماری مسجد میں ایک صاحب آتے ہیں اور ہمارے ساتھ ہی ہمارے امام کی اقتدا میں نماز پڑھتے ہیں لیکن رفعِ یدین کرتے ہیں اور آمین بالجہر کہتے ہیں، ان کے اس عمل سے ہماری نمازیں تو خراب نہیں ہوتیں؟ اور آیا ہم انھیں اپنی مسجد میں آنے سے روک دیں؟ مولینا نے جواب دیا کہ جب وہ تمہارے طریقے پر نماز نہیں پڑھتے تو اُنھیں خود ہی تمھارے ساتھ

نماز نہیں پڑھنی چاہیے، وہ اپنی نماز علاحدہ پڑھ لیں اور گھر پر پڑھیں۔ سائل مطمئن ہو کر جانے لگا تو عرشی صاحب نے اسے بلایا اور کہا کہ تمھارے ساتھ نماز پڑھنے سے نہ تمھاری نمازمیں کسی قسم کا فتور آتا ہے نہ اس کی نماز میں اور نہ اس کو مسجد میں آنے سے روکنا صحیح ہے اور یہ اس طرح کہا کہ مولینا بالکل سن رہے تھے۔ معلوم نہیں کہ سائل نے عرشی صاحب کی بات مانی یا نہیں، بہر حال وہ یہ سُن کر چلا گیا۔

یہ ہیں کچھ یادداشتیں جو عرشی صاحب سے عمر بھر کے تعلقات، سفر، حضر، گھر اور باہر کے ساتھ رہنے سے یاد رہ گئی ہیں اور حافظے پر زور دیے بغیر سامنے آگئی ہیں۔

یادگارِ غالب

مولانا حالی کی کتاب "یادگارِ غالب" اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اردو میں اسی کتاب سے غالب شناسی کا آغاز ہوتا ہے۔ تحقیق اور تنقید نے بہت کچھ ترقی کرلی ہے، مگر یہ کتاب اپنے موضوع پر آج بھی بے مثال حیثیت کی مالک ہے۔ مولانا حالی مرزا غالب کے شاگرد بھی تھے اور انھوں نے دہلی کی اُس عہد کی ادبی محفلوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لحاظ سے یہ کتاب "حوالے کی کتاب" کا بھی درجہ رکھتی ہے۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۸۹۷ء میں نامی پریس کان پور میں چھپی تھی۔ یہی اس کتاب کا واحد مستند اڈیشن ہے۔ اب یہ اڈیشن کم یاب، بل کہ نایاب ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے اِسی اولین اڈیشن کو فوٹو آفسٹ کے ذریعے بہت اہتمام کے ساتھ چھاپا ہے، عمدہ سفید کاغذ پر مضبوط جلد اور دل کش سرورق کے ساتھ۔

صفحات : ۴۳۸
قیمت : ساٹھ روپے

ملنے کا پتا

غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پروفیسر نذیر احمد

طہور الاسرار اور مطہر کڑہ

ایک گزارش

طہور الاسرار اور مطہر کڑہ کے عنوان سے محترم عرشی صاحب کا ایک مضمون معارف اعظم گڑھ بابت ماہ جولائی و اگست ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا جو ان کے مجموعۂ مقالات (مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۰ء) میں شامل ہے، نظامی گنجوی کی مثنوی مخزن الاسرار کی ایک شرح طہور الاسرار کے نام سے مطبع نول کشور میں چند بار شائع ہوئی جس کے دیباچے میں شارح کا نام طہور الحسن بھوری بتایا گیا ہے، عرشی صاحب نے اس مضمون میں ثابت کیا ہے کہ یہ انتساب غلط ہے، دراصل یہ شرح بدرالدین مطہر بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود البلخی المعروف بکری نے ۷۹۵ھ میں لکھی تھی، انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شارح مخزن اسرار فیروز شاہ تغلق (۷۵۲-۷۹۰) کے عہد کا مشہور شاعر مطہر کڑہ ہے، مجھے عرشی صاحب کے اس دوسرے قیاس سے اتفاق نہیں، مجھے شارح مخزن اور مطہر شاعر دو الگ الگ شخص معلوم ہوتے ہیں، اس کی تفصیل بعد میں عرض کی جائے گی، فی الحال یہ عرض کرنا ہے کہ محترم عرشی صاحب سے ۱۲ سال قبل حافظ محمود شیرانی صاحب نے رسالہ مخزن لاہور بابت مارچ، اپریل ۱۹۲۹ء میں "فارسی زبان کی ایک قدیم فرہنگ میں اُردو زبان کے عنصر" کے عنوان سے ایک مفصل مقالہ شائع کیا تھا، جس میں اس موضوع پر گفتگو ملتی ہے، یہ مقالہ مقالات شیرانی مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۶ء میں شامل ہے، شیرانی صاحب نے اپنے مقالے میں محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن

محمود بدر خزانہ البلخی المعروف بکرئی کی فرہنگ بحرالفضائل پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور اس میں سے ہندوستانی کے کئی سو لفظوں کی فہرست مرتب کی ہے، صاحب فرہنگ نے مختلف لغات کے ذیل میں ہندوستانی مترادفات نقل کیے ہیں اور باب چہاردہم میں حسب ذیل عنوان کے ذیل میں کافی ہندوستانی الفاظ جمع کر دیے ہیں: "در الفاظ ہندوی کہ در نظم بکار آید" شیرانی صاحب نے بحرالفضائل کے علاوہ اسی مقالے میں اسی مصنف کی دوسری کتاب شرح مخزن اسرار سے بھی بحث کی ہے یہ موضوع محترم عرشی صاحب کا بھی ہے، شیرانی صاحب نے بتایا ہے کہ شارح مخزن اسرار اور مولف بحرالفضائل ایک ہی شخص تھے جس کا پورا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ البلخی الکرئی ہے، شرح مخزن پر انھوں نے بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نول کشور پریس میں یہ شرح غلط نام سے شائع ہوئی، ظہور الحسن ٹھوری اس کا مولف نہیں ہو سکتا، اس کے بعد انھوں نے یورپی مستشرقین اشپرنگر، ایتھے، ریو وغیرہ کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جنھوں نے اس فرہنگ کا زمانہ گیارہویں صدی ہجری کا بتایا ہے اور یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ محمد بن قوام بن رستم یعنی شارح مخزن گیارہویں صدی کے اواخر کا مولف ہے۔ عرشی صاحب نے بھی اپنے مقالے میں انھیں دونوں باتوں کی بڑی تفصیل سے وضاحت کی ہے، اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ ان دونوں محققین کے نتائج یکساں ہیں بلکہ طرز استدلال میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے، دونوں نے ثابت کیا ہے کہ شرح مخزن کا انتساب ظہور الحسن ٹھوری کی طرف بالکل غلط ہے، بقول شیرانی "ادبی رہزنی کی تاریخ میں یہ ایک دلیرانہ مثال ہے" اور شارح مخزن کے زمانے کے تعین میں مستشرقین سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ لیکن محترم عرشی صاحب کے پیش نظر شیرانی کا مقالہ نہ تھا، اس لیے ان کو علم نہ ہو سکا کہ اسی شارح کی ایک فرہنگ بحرالفضائل بھی ہے جس پر شیرانی صاحب کے یہاں سیر حاصل بحث ہے، اس کے بجائے عرشی صاحب کے مقالے میں ایک دوسرا موضوع شامل ہو گیا۔ ان کے نزدیک شارح مخزن اسرار عہدِ فیروز شاہی کا مشہور کڑہ ہے، شیرانی صاحب کے یہاں اس امر کا مطلق ذکر نہیں البتہ انھوں نے بحرالفضائل کا پتا دیا اور مضمون میں پورا زور اسی فرہنگ کی تشریح و توضیح پر صرف ہوا ہے۔

حسن اتفاق سے جس طرح شرح مخزن اسرار کے بہت زیادہ نسخے مشرق و مغرب کے کتابخانوں میں محفوظ ہیں بحرالفضائل کے متعدد نسخوں کا پتا چل گیا ہے جن میں حسب ذیل میرے علم میں ہیں:

کتابخانۂ آصفیہ	دو نسخے
انڈیا آفس لائبریری	تین نسخے
لاہور پبلک لائبریری	ایک نسخہ
دانشگاہ تہران	تین نسخے
کتابخانۂ شیرانی	ایک نسخہ

اور جس طرح شرح مخزن کے ایک آدھ نسخے کو چھوڑ کر باقی تمام نسخوں میں شارح کا نام محمد بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ بلخی کرئی ہے، بعینہ یہی نام بحرالفضائل کے مقدمے میں ملتا ہے۔

شرح مخزن کا سال تصنیف ۷۹۵ھ ہے جو شرح کے اکثر نسخوں میں موجود ہے، البتہ بحرالفضائل کی تاریخ تصنیف متن کتاب میں ایک جگہ اس عبارت میں ہے:

آغاز تاریخ ہجری از غرۂ ماہ محرم گرفتند و درین وقت از تاریخ ہجرت ہشتصد سی و ہفت سال است۔

دوسری جگہ سمبت سال درج ہے۔

"تاریخ ایشان از جلوس راے بکرماجیت است در راجین و درین وقت از تاریخ او یکہزار و چارصد و نود سال است۔

گویا ۸۳۷ھ میں سمبت سال ۱۴۹۰[۱] ہے، جو سنہ عیسوی ۱۴۳۳ کے مطابق ہوتا ہے پروفیسر شیرانی نے قیاس کیا ہے کہ شرح مخزن محمد بن قوام کی اوائل زندگی کی ہے اور بحرالفضائل اواخر زندگی کی

سنہ سمبت میں سے ۵۷ سال گھٹانے سے سال عیسوی نکل آتا ہے، تفتہ کی وفات کا سال عیسوی ۱۸۷۹ اور سال سمبت ۱۹۳۶، دونوں میں وہی ۵۷ سال کا فرق رہتا ہے۔

اس لیے کہ ان دونوں کتابوں کی تالیف کے درمیان ۲۴ سال کا فرق ہے۔

عرشی صاحب نے ثابت کرنا چاہا ہے کہ شرح مخزن اسرار کا مولف مطہر کڑہ ہے، اس لیے کہ شارح اور مطہر دونوں کا زمانہ یکساں اور دونوں کا وطن ایک ہے، اور کم از کم شرح کے ایک نسخے میں شارح کا نام بدرالدین مطہر درج ہے لیکن میرے نزدیک نتیجہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس لیے کہ شارح اور شاعر کے زمانے اور نام میں کسی قدر فرق ہے۔

یہ عام طور پر معلوم ہے کہ مطہر فیروز شاہ تغلق کے دور کا مشہور شاعر ہے، لیکن اس کے دیوان کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ فیروز تغلق کی جانشینی (۷۵۲ھ) سے قبل ہی اس نے کافی شہرت حاصل کرلی تھی، اس کا ایک ممدوح عین الملک تھا، اس کی مدح میں اس نے متعدد قصائد لکھے ہیں، ایک قصیدے میں غازی پور یعنی خطۂ شرق کا ذکر کرتا ہے، عین الملک محمد تغلق کے عہد میں اودھ اور ظفرآباد کا حاکم تھا، ۷۴۲ھ میں بغاوت کی تو وہ دہلی واپس بلالیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ قصیدہ ۷۴۲ھ سے قبل کا ہوگا۔ مطہر کا ایک قصیدہ ۷۸۹ھ کا ہے جس میں اس نے اپنی عمر ۷۳ سال بتائی ہے، اس سے واضح ہے اس کی تاریخ پیدائش ۷۱۶ھ کے قریب ہوگی، شارح مخزن نے اپنی دوسری کتاب بحرالفضائل ۸۳۷ھ میں لکھی، تو اگر مخزن اسرار کا شارح اور بحرالفضائل کا مولف مطہر ہی ہے تو آخرالذکر تصنیف کے وقت اس کی عمر (۸۳۷ - ۷۱۶ھ) ۱۲۱ کی ٹھہرتی ہے، ممکن نہیں ہے کہ ۱۲۱ سالہ آدمی بحرالفضائل جیسی تصنیف کا مصنف ہو، یہ زمانے کی بات ہوئی، اب دونوں کے نام کے بارے میں کچھ تفصیل ملاحظہ ہو، شارح مخزن اور مطہر کے ناموں میں جو فرق ہے وہ نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ عرشی صاحب کے پیش نظر جو نسخہ ہے اس میں شارح کا نام محمد کے بجائے بدرالدین مطہر ملتا ہے، پیشاور کے ایک نسخے میں بھی مطہر نام کی اطلاع عرشی صاحب نے دی، ان کے علاوہ شرح مخزن کے متعدد نسخوں میں شارح کا اس طرح نام ملتا ہے : محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانۂ البلخی المعروف بکری مزید برآں قاضی ابراہیم تتوی نے یوسف محمد خاں والی سند (۱۰۴۱-۱۰۴۹) کے نام پر مخزن اسرار کی شرح لکھی، اس میں شارح مخزن کا نام محمد بلخی ہی لکھا ہے، تیسرے یہ کہ بحرالفضائل کے تمام نسخوں میں مصنف کا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ بلخی کری ملتا ہے۔

ان وجوہ سے اس بات میں شبہے کی گنجائش کم ہی ہے کہ شارح مخزن کا نام محمد کے بجائے کچھ اور ہوگا، اس سلسلے میں یہ بات بھی نظرانداز نہیں کی جاسکتی کہ شرح مخزن میں ایک بار مطہر کا ذکر اس طرح آیا ہے :

افضل العصر مولانا مطہر گوید۔ اس سے ظاہر ہے کہ شارح مطہر کو اپنے دور کا فاضل قرار دیتا ہے، ہم افضل العصر کو کتابت کی غلطی یا کاتب کے اضافے پر محمول نہیں کرسکتے اس لیے کہ شارح اپنے ایک معاصر مغیث الدین ہانسوی کو افضل العصر لکھتا ہے۔

عرشی صاحب نے شارح مخزن کے نام کے ایک جز بدرالخزانتہ کے بارے میں لکھا ہے : "بدرالخزانتہ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ شارح کا لقب ہے، موجودہ نسخوں کے منقول عنہ میں الدین کو خطی مشابہت کے باعث الخزانتہ یا الحزانتہ پڑھا گیا ہوگا اس کے بعد یہی لفظ مروج ہوگیا۔"

اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ شرح مخزن کے سارے نسخوں میں بدر خزانتہ پایا جاتا ہے، اور بحرالفضائل کے نسخوں میں یہی صورت موجود ہے، اس لیے اس کی توجیہ کسی اور انداز سے کرنے کی ضرورت ہے۔

عرشی صاحب نے شارح کا لقب بدرالدین قیاس کیا ہے، لیکن شارح کا لقب افضل الدین تھا جو شرح کے علاوہ اس کی دوسری تصنیف بحرالفضائل میں بھی موجود ہے، اس کی وجہ سے بدر خزانہ کا رشتہ بدرالدین سے جوڑنے کا کوئی موقع نہیں۔

عرشی صاحب نے شارح کا قول لکھا ہے کہ محمد تغلق شاہ نے خرگاہ کا نام خرم گاہ تجویز کیا تھا۔ "وخرگاہ را سلطان محمد تغلق شاہ نوراللہ مرقدہ نام کردہ سبب کراہیت لفظ خرگہ، ازاں روز باز در دیار دہلی خرم گاہ می گویند۔

(ایضاً ص ۳۱۰، ۶۰، ۳۵۳)

اس پر عرشی صاحب لکھتے ہیں :

میں نے عہد محمد تغلق کی تاریخوں پر سرسری نظر ڈالی مگر یہ واقعہ نہیں ملا، اگر حقیقۃً تاریخوں میں اس کا ذکر نہیں آیا ہے تو محمد تغلق کی خوش ذوقی کی ایک اہم شہادت دستیاب ہوتی ہے،

اور اگر مذکور ہے گو میری نظر نہیں پڑی تو تاریخ کے بیان کی مزید شہادت قرار پاتی ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ شیرانی صاحب کی بھی نظر میں خرم گاہ لفظ آیا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

بلخی کے ہاں ایک اور جدید اطلاع یہ ہے کہ فارسی لفظ خرگاہ بمعنی خیمہ بزرگ سلطان محمد بن تغلق (۲۸، ھ، ۵۳، ھ) کو اس کی ترکیب کی بنا پر کہ اس سے ذم کا پہلو بھی مترشح تھا ناپسند تھا اس لیے اس نے خرگاہ کو خرمگاہ کی شکل میں بدل دیا چنانچہ دہلی اور اس کے اطراف میں خرم گاہ ہوتے ہیں، تائید میں یہ فقرہ ملاحظہ ہو: برای این نوع آگاہی داد تا خواجہ جہاں را درین چوڈول سوار کنند و بہ خرم گاہ برند (تاریخ فیروز شاہی شمس عفیف ص ۷۱)

اس کے مضمون کے حاشیے پر شیرانی صاحب کے قلم سے یہ اضافہ ہے:

لیکن تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ امیر حسن سجزی دہلوی کے نسخہ فوائد الفواد میں جو یقیناً ۷۲۴ھ سے قبل کی تصنیف ہے لفظ خرم گاہ موجود ہے مثلاً

آن زمان سلطان در خرم گاہی نشستہ بود، سید نورالدین مبارک علیہ الرحمہ نیز بر یک جانب خورمگاہی نشستہ بود (ص ۲۴۸)

و ہر دو بیرون خورم گاہ بودند

درون خورم گاہ برد (ص ۲۴۹)

اس سے ظاہر ہے کہ یہ اصطلاح محمد بن تغلق کے عہد سے قدیم ہے اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ لفظ ہندوستان میں وضع ہوا۔

اگرچہ لفظ خرم گاہ کی بحث ہمارے مقالے سے براہ راست متعلق نہیں، پھر بھی یہ اضافہ غیر مناسب نہ ہوگا فرہنگ جہانگیری طبع مشہد ج ا ص ۹۶۵ میں ہے:

خرمگاہ، خرم گہ باول مضموم وثانی مفتوح مشدد بمیم زدہ، خرگاہ را گویند، شمس جندی راست:

از علوِ ہمتت فراش خرمگاہ قدر

خیمۂ قدر ترا بر اوج "او ادنی" زدہ

سروری نے مجمع الفرس (تہران، ج ا ص ۴۷۶-۴۷۷) میں لکھا ہے: خرمگاہ و خرمگہ یعنی خرگاہ مثال:

حکیم خاقانی گوید۔

تابش رخسار تو از راہ چشم

کرد خرمگاہ دل از ارغوان

شمس جندی: از علو ہمتت فراش خرمگاہ قدر

خیمۂ قدر ترا بر اوج "او ادنی" زدہ

عمید لویکی: گہی صحن ہوا خرمگہ اوست

گہی در دامن کوہش مآب است

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ لفظ "خرم گاہ" محمد بن تغلق سے بہت پہلے فارسی زبان میں رائج تھا، اور یہ قیاس بھی درست نہیں کہ یہ لفظ ہندوستان میں بنا۔

آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہندوستان کے ان دونوں عظیم محققین نے اپنے اپنے مقالوں میں جو داد تحقیق دی ہے وہ قابل صد ستائش ہے اور قبل اس کے کہ وہ میری تحریر کو پڑھیں، ان دونوں فاضلوں کے مقالات کا مطالعہ ضرور کر لیں۔ راقم حروف نے اس سلسلے میں ایک تفصیلی مقالہ محترم عرشی صاحب کی خدمت میں غالباً ۱۹۶۵ء میں بھیجا تھا، جو ان کی اجازت سے معارف جلد ۹۹، شمارہ ا (جنوری ۱۹۶۷ء) میں شائع ہوا، اس کا خلاصہ اوپر پیش ہوا، لیکن اس خلاصہ میں بعض امور ایسے ہیں جو ۱۹۶۷ء کے مقالے میں نہیں۔

اس درمیان دیوان مظہر کا ایک تنقیدی متن بھی تیار ہو گیا، مظہر کی ایک دوسری کتاب مکشوف ہوئی، اور اس کا نصاب بھی راقم کی کوشش سے طبع ہوا، مطبوعہ مضمون کا خلاصہ پیش کرتے وقت یہ نئے مواد بھی پیش نظر رکھے گئے ہیں۔

نقد قاطع برہان

معہ ضمائم

پروفیسر نذیر احمد

قیمت : ساٹھ روپے

ـــــ ملنے کا پتا ـــــ

غالب انسٹی ٹیوٹ ، ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی ۲۔۱۱۰۰۰

پروفیسر نثار احمد فاروقی

تاریخِ محمدی

(مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی)

تحقیق وتدوینِ متن کی ذمہ داریوں کا اگر پورا علم اور احساس ہو تو یہ تصنیف سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ ہر متن کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، کبھی اُس متن کے سیکڑوں نسخے اور روایتیں ملتی ہیں اور اُن میں تال میل پیدا کر کے مقصودِ مصنف کو پانے کی کوشش کی جاتی ہے، کبھی وہ متن منحصر بفرد ہوتا ہے۔ کہیں واضح ہے تو کہیں بے حد مبہم اور مغشوش ہوگا۔ زبان واسلوب کے بھی ہر عہد کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں اُن کا علم نہ ہو تو متن کی پوری تصحیح نہیں ہوسکتی، متن کی تدوین میں صحت کے علاوہ یہ بھی دھیان رکھنا ضروری ہے کہ اس کا افادی پہلو اجاگر کیا جائے متقاطع حوالے اور اشاریے اس طرح ہوں کہ اہلِ علم اُن سے فائدہ پورا اور جلد حاصل کرسکیں بعض متون کی تصحیح اور حاشیہ نگاری میں سیکڑوں دوسری کتابوں سے مدد لینا ناگزیر ہوتا ہے اتنی کتابوں تک ہر مدوّنِ متن کی رسائی نہیں ہوتی یا سہل انگاری کی وجہ سے اس پہلو کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ اُردو میں، یا اس طرح کہوں کہ مشرقی علوم کے مختلف موضوعات پر کام کرنے والے ہندوستانی علما نے تحقیق وتدوینِ متن کے معیاری اور مثالی نمونے بہت ہی کم پیش کیے ہیں۔ گذشتہ پچاس برسوں میں تو کچھ اچھے کام تحقیقِ متن کے سامنے آئے ہیں اور اس کا شعور بیدار ہوا ہے، اس سے پہلے ہماری علمی دُنیا میں متن

کی تصیح قاری ہی کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔

جن حضرات نے تحقیق متن میں دقیقہ رسی کے ساتھ مثالی اور معیاری کام کیا ہے اُن میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی عرشی کے نام نمایاں ہیں۔ اِن بزرگوں میں معیار و مقدار کے اعتبار سے مولانا امتیاز علی عرشی کا نام سب سے ممتاز ہے۔ انھوں نے تذکرۂ شعرا، تاریخ، تفسیر، لغت، وغیرہ متعدد موضوعات کی متنوع کتابوں کو بڑے اہتمام اور سلیقے سے ایڈٹ کیا ہے۔ مولانا عرشی کے سبھی کام اُن کی علمیت اور سلیقے کی شہادت دیتے ہیں، مگر دیوانِ غالب، مکاتیب غالب، دستور الفصاحت، تفسیر سفیان ثوری اور تاریخ محمدی کا بطور خاص تذکرہ کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ محمدی ایک بہت اہم حوالے کی کتاب ہے اس کا مؤلف میرزا محمد رستم مخاطب بہ معتمد خاں بن قباد مخاطب بہ دیانت خاں حارثی بدخشی دہلوی ہے[۱]۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس میں تاریخی اور علمی شخصیات کا مختصر حال اور سنہ وفات سنہ وار درج کیا گیا ہے۔ مولانا عرشی نے اس کی جلد دوم کا چھٹا حصہ پہلے ایڈٹ کیا جو آخر عہد مغلیہ سے متعلق ہے اور اس میں اُن شخصیات کا اندراج ہوا ہے جن کا انتقال سنہ ۱۱۰۱ھ اور ۱۱۶۱ھ کے درمیان ہوا ہے عرشی صاحب نے کتاب کے متن کی تصحیح کی ہے اور اس پر حواشی لکھے ہیں متن ۱۴۲ صفحوں میں آیا ہے اور حواشی ۱۰۷ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پھر ان کی فہرست سازی کی ہے جس میں :

فہرست اشخاص و اقوام و فرق

---

۱ رستم المخاطب بہ معتمد خاں بن قباد جو مصنف تاریخ محمدی کا باپ ہے شوال سنہ ۱۰۴۸ھ (فروری ۱۶۳۹ء) کو ناندیڑ مہاراشٹرا میں پیدا ہوا اور دوشنبہ ۱۸ جمادی الاولی ۱۱۱۸ھ (۶ ستمبر ۱۷۰۵ء) کو قلعہ ونکیکرا کے قریب لشکر عالمگیری میں وفات پائی، نعش دہلی لاکر دفن کی گئی، اس وقت مولف تاریخ محمدی کی عمر ۱۹ سال تھی۔ وہ کہتا ہے کہ رستم عربی اور علوم اسلامیہ میں مہارت تامہ رکھتا تھا اور یونانی زبان بھی جانتا تھا اس نے بعض کتابوں کا یونانی سے عربی اور فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ (محمدی/ ۱۸-۱۹)

فہرست مقامات
فہرست انساب
فہرست عہدہ جات و کارخانہ جات
فہرست مناصب
فہرست کتب اور
فہرست مآخذ حواشی

یہ سب (۸۰) صفحات کو محیط ہیں۔

مصنف میرزا محمد حارثی کے احوال اور نسخہ ہائے خطی کے بارے میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اس کی تفصیل جلد اوّل کے دیباچے میں آئے گی، لیکن افسوس کہ یہ جلد مرتب نہ ہو سکی۔

تاریخ محمدی کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے اور قرائن ایسے ہیں کہ یہ مصنف کے اپنے خط میں ہے، بعض مقامات دریدہ و بوسیدہ ہیں، ان کی تصحیح برٹش میوزیم لندن کے نسخے (OR 1824) سے کی گئی ہے جس کا عکس رضا لائبریری میں موجود بتایا ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ ولیم اروین کے ذخیرے میں بھی تھا، اب وہ کہاں ہے اس کا فی الوقت علم نہیں۔ برٹش میوزیم کے فہرست نگار ریو نے کتاب کا سال اتمام ۱۱۹۰ھ بتایا ہے (۷۷-۱۷۷۶ء) مگر عرشی صاحب کا خیال ہے کہ اس میں ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) تک فوت ہونے والوں کا اندراج میرزا محمد حارثی نے کیا ہے اور غالباً اسی سال اس کی وفات ہوئی ہے، اس سنہ کے بعد کسی اور شخص نے اضافے کیے ہیں اسی طرح سنین ماقبل کے وفیات میں بھی بعض اضافے کسی دوسرے قلم سے ہوئے ہیں ان اضافوں کے بارے میں عرشی صاحب کا ارادہ تھا کہ اصل کتاب کا متن تمام ہو جانے کے بعد انھیں ایک علیٰحدہ جلد میں پیش کیا جائے گا۔ اُن کا یہ ارادہ بھی پورا نہ ہو سکا۔

فاضل مرتب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کتاب کی طباعت کے زمانے میں گوناگوں امراض میں مبتلا رہے اس لیے تصیح کا کام جیسا چاہتے تھے نہ ہو سکا۔ اُنھوں نے "تصیح واستدراک" کے عنوان سے بعض اغلاط کی صحت آخر میں کر دی ہے۔

میرزا محمد حارثی نے عہد فرخ سیر کی ایک تاریخ تذکرہ یا عبرت نامہ کے نام سے بھی لکھی

تھی، اس کے علاوہ

(۱) نزل الابرار لما صح من مناقب أهل البيت الاطهار

(۲) مفتاح النجا من مناقب آل العبا

(۳) تحفة المحبين فی مناقب الخلفاء الراشدين

بھی اس کی تصانیف میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اس کی چند کتابیں ہمیں معلوم ہیں مگر ان میں سب سے اہم یہی تاریخ محمدی ہے جس کی تالیف میں حارثی نے کتابوں سے استفادہ کرنے کے علاوہ ثقات کی زبانی روایات یا دوسرے شخصی مصادر سے بھی استفادہ کیا ہے۔

دیباچے میں حارثی نے لکھا ہے کہ اگرچہ اس نوعیت کا کام خوندمیر ہروی نے حبیب السیر میں، حسن بیگ خاکی نے منتخب التواریخ میں اور محمد صادق اصفہانی نے اپنی تاریخ میں پیش کیا ہے مگر کوئی بھی جامع نہیں ہے، اغلاط بھی راہ پاگئی ہیں اس لیے میں نے ایک جامع اور حاوی کتاب کی تالیف کا ارادہ کیا اور روشنبہ، ۲ جمادالآخرہ ۱۱۲۴ھ (یکم اگست ۱۷۱۲ء) سے اس کام کا آغاز کیا۔ ترتیب اس کی سنہ وار رکھی اور ہر سال میں خلفاء و ملوک و سلاطین و مشائخ و علماء و مشاہیر میں جس کا انتقال ہوا وہ درج کیا اور آخر میں اس کتاب کا نام لکھ دیا جہاں سے وہ ماخوذ ہے۔ ہر کتاب کے لیے مخفف علامت استعمال کی ہے مثلاً

ابن عبدالبر کے لیے عب، ابن حجر عسقلانی کے لیے قب، حلیۃ الاولیاء کے لیے حل، نفحات الانس کے لیے فح وغیرہ

مصادر کی تفصیل اور مخففات کی تشریح دیباچے میں بیان کردی گئی ہے۔ کتاب کو دو جلدوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر جلد میں ۶ سو سال کے وفیات درج کیے ہیں۔ دوسری جلد کے آخری سو سال تاریخ محمدی کے اس حصے میں آئے ہیں جو مولانا عرشی مرحوم نے ایڈٹ کیا ہے۔

اس جلد میں حارثی نے ان کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔

(۹) تاریخ محمدی میں شیخ سلیمان مخاطب بہ فضائل خاں کی وفات جمادالاولی ۱۱۰۳ھ میں بتائی

عبدالحی: الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، ص ۱۴۲

ہے۔ مگر محمد افضل سرخوش نے مادہ تاریخ وفات "شیخ سلیمان" لکھا ہے (کلمات الشعراء/۱۳) اس سے ۱۱۰۱ھ برآمد ہوتا ہے۔

(۱۰) روح اللہ خاں بن خلیل اللہ خاں حسینی کا مادہ تاریخ وفات "روح در ملک تن نماند" (۱۱۰۳ھ) ہونا چاہیے۔ (محمدی/۳)

(۱۵) سید حسن رسول نما نارنولی کا نام سید حسین لکھا ہے (وفات ۲۲ شعبان ۱۱۰۳ھ) ہفتہ کے دن عصر کے وقت انتقال ہوا تھا جس جگہ بیٹھا کرتے تھے وہیں مدفون ہوئے ان کے ملفوظات فواتح العرفان میں ہیں۔ عمر ۱۰۰ سال ہوئی ولادت ۱۰۰۳ھ میں تھی۔

(۱۷) خواجہ میر خوافی کا انتقال ۱۱۰۴ھ میں بتایا ہے بحوالہ مآثر عالمگیری۔ مگر "فیہ نظر" بھی لکھ دیا ہے۔ صحیح سنہ ۱۱۰۳ھ ہے محمد بخش آشوب نے انھیں گلالبار کا موجد بتایا ہے۔

(۴۴) ۱۱۰۸ھ کے تحت ناصر علی سرہندی کی وفات "در احدی الجمادین" (۱۱۰۸ھ) بتائی ہے اور سرخوش کے حوالے سے ۶ رمضان بھی لکھی ہے۔ مصرع تاریخ وفات: "آہ از رحلت ناصر علی" بتایا ہے جس سے ۱۱۰۵ھ برآمد ہوتے ہیں اگر آہ میں دو الف شمار کیے جائیں تب بھی ۱۱۰۶ھ ہوں گے۔ خوشگو نے لکھا ہے کہ ۲۰ رمضان ۱۱۰۸ھ کو وفات ہوئی اور در راہ روضہ حضرت نظام الدین اولیاء مدفون گردید، اس نے قطب الدین مائل کے احوال میں یہ وضاحت بھی کردی ہے کہ یہ ناصر علی کی وفات سے ایک ہفتہ بعد ۲۷ رمضان ۱۱۰۸ھ کو فوت ہوئے (خوشگو/۱۱)

(۱۷۳) عایشہ بیگم بنت روح اللہ خاں جو عظیم الشان بن شاہ عالم اول کی زوجہ ہے اس کا انتقال "نصف آخر جماد الاولی ۱۱۲۱ھ" میں بتایا ہے۔ اس کی شادی ۳۳ جلوس عالمگیری (۱۱۰۰ھ) ہوئی تھی ہمایوں بخت اور روح القدس اس کے توأم بچے ۱۴ ربیع الاول ۱۱۲۱ھ (۲۴ مئی ۱۷۰۹ء) کو پیدا ہوئے اور یہ، جمادی الاولی (۱۵ جولائی ۱۷۰۹ء) کو فوت ہوئی۔ حضرت برہان الدین غریب کے روضہ خلد آباد مہاراشٹرا میں مدفون ہے۔

(۱۷۸) میر شہاب الدین غازی الدین خاں فیروز جنگ کے حال میں لکھا ہے کہ ۷ شوال کو احمد آباد گجرات میں بہ مرض استسقا فوت ہوئے زائد از ہشت سال سے اندھے تھے۔

حیات آصف (ص ۲۷) سے معلوم ہوتا ہے کہ چہار شنبہ ۲۷ شوال ۱۱۲۲ھ کو

مرض طاعون میں مبتلا ہو کر انتقال کیا، اس وقت بیجا پور میں طاعون کی وبا تھی جس کی تاریخ کسی نے یوں لکھی ہے: "قیامت بود یا شور و یا بود" (۱۱۰۱ھ)۔ ان کے مقبرہ کی عمارت میں اینگلو عربک اسکول واقع ہے ——— دونوں بیانوں میں فرق واضح ہے۔

(۱۸۴) میرزا محمد الملقب بہ نعمت خاں بن حکیم داؤد شیرازی کو "ازخبائث عصر" لکھا ہے اور وفات غرہ ربیع الثانی کو ۱۱۲۲ھ (۲۸ مئی ۱۷۱۰ء) کو دہلی میں بتائی ہے سرکار نے ۳۰ ربیع الاول مطابق ۲۸ مئی ۱۷۱۰ء لکھی ہے جو غلط ہے۔ خوشگو نے وفات لاہور میں لکھی ہے، مولف شام غریباں وفات ۱۱۲۱ھ میں اور قبر دائرہ میر محمد مومن حیدر آباد میں بتاتا ہے۔

(۲۵۱) ۱۱۳۰ھ کے متوفیان میں شہزادہ محمد ہمایوں بخت بن شاہ عظیم الشان کا نام ہے کہ ۲ یا ۴ ربیع الثانی کو ۱۶ سال کی عمر میں انتقال کیا، اسی کتاب میں رقم ۱۰۱۱ کے تحت لکھا ہے سلطان ہمایوں بخت بن شاہ عظیم الشان ۲۷ رجب، ۱۱۵۰ھ کو بعمر چہل و چند سال فوت ہوا۔ اگر عائشہ بیگم دختر روح اللہ خاں و زوجہ عظیم الشان کا بیٹا ہی مراد ہے تو وہ فرخ سیر کے حکم سے مکحول ہوا تھا۔

(۲۶۶) خواجہ ابوالمکارم المخاطب بہ جاں نثار خاں کی وفات ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ میں بتائی ہے اس کی حویلی چاندنی چوک میں تھی، درگاہ خواجہ باقی باللہ میں مدفون ہوا، کتبہ قبر کی نقل سیر المنازل میں موجود ہے اس سے سنہ وفات ۱۱۲۱ھ معلوم ہوتا ہے۔

(۴۲۵) میر عبدالجلیل بلگرامی متوفی ۱۱۳۸ھ کی وفات جمادالاولی میں بتائی ہے، تصحیح و استدراک کے تحت عرشی صاحب نے الربیع الثانی لکھا ہے۔ خوشگو کا بیان ہے کہ ۲۳ ربیع الآخر ۱۱۳۸ھ (۲۹ دسمبر ۱۷۲۵ء) کو دہلی میں انتقال ہوا، نعش ان کے وطن بلگرام لے جائی گئی اور ۶ جمادالاولی کو وہاں مدفون ہوئے عمر ۶۶ سال ۶ ماہ ۱۰ دن کی ہوئی۔ حارثی نے دفن کے مہینے کو انتقال کا مہینہ سمجھا ہے۔

(۵۸۶) جاں نثار خاں کے بیٹے محمد ابراہیم مخاطب بہ داراب خاں کی وفات ۱۱۴۴ھ میں بتائی ہے ان کے ملازم رنچھوڑ داس نے قطعہ تاریخ وفات لکھا تھا جس کا مصرعہ تاریخ ہے:
خرد گفتا: قضائے حق چنیں بود، اس سے ۱۱۴۵ھ برآمد ہوتے ہیں۔ ان کی بہن نواب قمرالدین خاں وزیر سے منسوب تھیں (مفتاح التواریخ ۴۷۳)

(۶۷۶) جلینا فرنگیہ طبیبہ ربیع الاول، ۱۱۴۷ھ (اگست ۱۷۳۴ء) میں فوت ہوئی اس کا نام GULIANA D.ACOSTA ہے ایک پرتگالی خاتون تھی اور شاہ عالم کے زمانے سے عہد محمد شاہ تک شاہی حرم کی طبیبہ رہی اس نے گوا سے ۳۰۰ پرتگالیوں کو بلا کر مختلف کاموں سے لگا دیا تھا۔ اوکھلا روڈ پر جامعہ ملیہ سے پہلے جو علاقہ جولینا کہلاتا ہے وہ اسی کے نام پر آباد ہے۔

(۸۳۵) رائے مان بن مخاطب بہ رستم ہند (وفات ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ / مارچ ۱۷۳۹ء) اندراج سے ظاہر ہے کہ یہ مرد ہے مگر سرکار نے لکھا ہے کہ یہ قلماقنی تھی۔ جہاندار شاہ نے اسے رستم ہند کا خطاب دیا تھا اور اسی لیے یہ کہا جاتا تھا کہ ہندوستان میں ایک ہی رستم ہے وہ بھی عورت ہے۔ خبر نہیں کہ ۱۱۲۶ھ کے متوفیان میں شادمان اس کا باپ ہے یا ماں ہے۔ خطاب اس کا بھی رستم ہند تھا۔ چاندنی چوک میں جو کوچہ رحمان مشہور ہو گیا ہے وہ دراصل اسی رائے مان کے نام پر ہے۔

(۹۶۳) سعدالدین خاں خانساماں ۹ جمادالاولی ۱۱۵۶ھ کو فوت ہوئے (۲ جولائی ۱۷۴۳ء) یہ ۱۲ جون ۱۷۳۹ء کو خانساماں ہوئے تھے میر آتشی کا عہدہ بھی ساتھ ہی ملا تھا۔ ۲۰ جون ۱۷۴۳ء کو ان کی وفات کے بعد حفیظ الدین خاں (سعدالدین خاں ثانی) کو یہ عہدہ ملا، اس کی ماں ابوتراب مشہدی کی بیٹی تھی اور ۱۱ مارچ ۱۷۴۴ء کو ان سے یہ عہدہ لے کر صفدر جنگ کو دے دیا گیا۔ سفرنامہ مخلص کے حاشیہ میں ان کی وفات سیر المتاخرین کے حوالے سے ۸ جمادالاولی ۱۱۵۴ھ لکھی گئی ہے۔ ذکر میر میں ایک موقع پر انھیں سعدالدین خاں کا نام آیا ہے۔

(۱۰۲۱) سیف الدولہ ذکریا خاں کی وفات ۱۲ یا ۱۳ جمادالثانیہ ۱۱۵۸ء بتائی ہے مخلص نے بدائع وقائع میں "۱۲ جمادالثانیہ سہ شنبہ یک پہر و سہ گھڑی روز بلند شدہ" لکھا ہے جو ۱۳ جولائی ۱۷۴۵ء کے مطابق ہے۔ مگر سرکار نے یکم جولائی ۱۷۴۵ء لکھا ہے (جلد ۱ ص ۱۱۸)

(۱۰۹۹) دیدہ مغل مخاطب بہ آغر خاں کی وفات رمضان ۱۱۶۰ھ میں لکھی ہے سفرنامہ مخلص کے حواشی میں بحوالہ سیر المتاخرین سلخ شعبان ۱۱۶۰ روز چہار شنبہ (۶ ستمبر ۱۷۴۷ء) درج ہے۔

یہ تاریخ محمدی کے چند اندراجات اس نظر سے پیش کیے گئے ہیں کہ میرزا محمد حارثی مصنف کتاب کا یہ دعوی کہ اس کے پیشرو مورخوں سے یہ کتاب زیادہ صحت میں فائق ہے درست نہیں اس میں اُس عہد کی بہت سی ممتاز شخصیتوں کا اندراج بھی نہیں ہو سکا ہے۔ مثال

کے طور پر چند نام لکھتا ہوں جن کا حوالہ تاریخ محمدی کی اس جلد میں نہیں ہے حالانکہ ان میں سے بیش تر کا انتقال دہلی میں ہوا ہے اور یہ لوگ غیر معروف نہیں تھے۔

محمد حسن ہمت خاں کوکلتاش (از امرائے عالمگیری) متوفی ۱۱۰۶
داراب خاں بن داراب خاں متوفی ۱۱۱۱ھ
میر زاہد ہروی استاد اورنگ زیب متوفی ۱۱۱۱ھ
شیخ محمد افضل الٰہ آبادی از خلفائے سید محمد کالپوی متوفی ۱۱۱۴ھ
شیخ حسام الدین حسامی پدر سراج الدین علی خان آرزو متوفی ۱۱۱۵ھ
محمد اسلم سالم کشمیری وفات ۱۱۱۹ھ
سیّد حسین خالص متوفی ۱۱۲۲ھ
میر کرم اللہ عاشق خلف نواب شکر اللہ خاں خاکسار متوفی ۱۱۲۴ھ
میر جعفر زٹلی نارنولی وفات ۱۱۲۵ھ
سدا نند بے تکلف وفات ۱۱۲۹ھ
میر محمد احسن ایجاد وفات ۱۱۳۰ھ
شاہ عبدالرحیم دہلوی پدر شاہ ولی اللہ دہلوی متوفی ۱۱۳۱ھ
میر محمد علی تمکین وفات ۱۱۳۳ھ
محمد مراد کشمیری وفات ۱۱۳۴ھ
نواب شمس الدولہ لطف اللہ خاں پانی پتی وفات ۱۱۳۵ھ
ع ہ فریاد ابوالعلائی نقشبندی وفات ۱۱۳۵ھ
عطا اللہ عطا امروہوی ساگرد بیدل وفات ۱۱۳۶ھ
عبدالغنی بیگ قبول وفات ۱۱۳۸ھ
شاہ سعد اللہ گلشن وفات ۱۱۴۰ھ
میر عبدالصمد سخن استاد خان آرزو وفات ۱۱۴۱ھ
میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی وفات ۱۱۴۲ھ
احمد یار خاں یکتا وفات متوفی ۱۱۴۵ھ

شاہ مُبارک آبرو متوفی ۱۱۴۶ھ
میر محمد ناصر سامان شاگرد میرزا مظہر متوفی ۱۱۴۷ھ
محمد باہ صداقت متوفی ۱۱۴۸ھ
محمد علی راجح سیالکوٹی متوفی ۱۱۵۰ھ

یہ چند نام بھی بطور مثال لکھے گئے ہیں اور زیادہ تر شعراء کے ہیں ورنہ اس دَور کے صوفیہ، علماء، اطباء اور امراء میں ایسے بہت سے نام ہیں جو تاریخ محمدی کے زیرِ تبصرہ حصے سے غیر حاضر ہیں۔

مولانا امتیاز علی عرشی نے اس کے حواشی بہت تفصیل اور دیدہ ریزی سے لکھے ہیں جو مقامات بیاض تھے یا مغشوش تھے اُن کی تکمیل یا تصحیح کر دی ہے، دوسرے اہم مصادر کے متقاطع حوالے دے کر اختلافی امور کو واضح کر دیا ہے اور ایک ہی قبیلے کے جو نام مختلف سنین میں بٹے ہوئے ہیں ان کی طرف خود حارثی بھی اشارہ کرتا ہے، عرشی صاحب نے مزید وضاحت کر دی ہے تاریخوں کا اگر دوسرے مصادر میں اختلاف ہے تو اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

خاندانی شجرے بھی حواشی میں درج کر دیے ہیں جن سے ان افراد کے باہمی رشتے سمجھ میں آجاتے ہیں خاندان مغلیہ کا شجرہ ص ۱۵۵ پر شاہ جہاں کے بعد سے درج کیا ہے مگر اس میں سب نام نہیں آسکے ہیں مثلاً شہزادہ محمد اکبر کے دو بیٹوں بلند اختر اور نیکو سیر کا نام ہے اس کا ایک بیٹا محمد اصغر اور دوسرا ذی جاہ بھی تھا۔ بیٹیوں میں صفیۃ النساء، زکیۃ النساء، نجیبۃ النساء کے نام بھی ملتے ہیں۔ بیدار بخت کی اولاد میں فیروز بخت، حیات اللہ، بیدار دل، سعید بخت، بخت افزوں بانو، بخت النساء کے نام آتے ہیں۔ جہاندار شاہ کے بھائیوں میں عز الدین اور محمد ہمایوں بھی ہیں عظیم الشان کے بیٹوں میں احسن اللہ اور روح القدس ہیں۔ بظاہر ایسا بھی نہیں ہے کہ عرشی صاحب نے شجرے میں وہی نام لیے ہوں جن کا تذکرہ تاریخِ محمدی میں موجود ہے۔

اس کتاب کی تدوین میں سب سے اہم کام اشاریہ سازی کا تھا، وہ جیسا کہ ہم نے ابتدا میں عرض کیا فاضل مرتب نے بہت تفصیل اور سلیقے سے مختلف اہم عنوانوں کے تحت انجام دیا ہے۔ امراء کے نام القاب وغیرہ کے ساتھ خاصے طویل اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں کسی کا نام

لقب میں روپوش ہو جاتا ہے، کبھی ایک ہی لقب کئی پشتوں تک ورثے میں چلتا ہے، بہادر شاہ اول کے زمانے میں اندھا دھند خطابات کی تقسیم ہوئی تو ایک ہی خطاب متعدد افراد کو دے دیا گیا، اس سے اشاریہ سازی کا کام خاصا دشوار ہو جاتا ہے جہاں ایک ہی لقب کے کئی افراد ہوں تو جس شخص کا حال ہمیں تلاش کرنا ہے اس کا اصلی نام معلوم ہونا ضروری ہے عرشی صاحب نے اس کا اہتمام کیا ہے، لیکن جہاں ایک ہی نام متعدد جگہوں پر آیا ہے وہاں یہ پتا نہیں چلتا کہ اس شخص کا ترجمہ کون سے صفحہ پر آیا ہے۔ اُس صفحہ کو اگر قوسین میں کر دیا جاتا تو آسانی ہو جاتی۔ ایسا کچھ ہی صفحات میں ہو سکا ہے۔ مثلاً ابو الفتح خاں کے سامنے ص ۸۸ اور ۱۱۵ دو ہندسے لکھے ہیں مگر ۱۱۵ پر ابو الفتح بن خان جہاں کا حال ہے۔

حاجی امیر اویس کا حال ص ۳۳ پر ہے مگر یہ ہندسہ اشاریے میں نہیں ہے۔

بنت الحاج عنایت اللہ کا تذکرہ ص ۳۷ پر آیا ہے اشاریے میں ندارد ہے۔

بہرمند خاں کا حال ص ۱۳۰ پر نہیں ۱۰۲ پر ہے یہ طباعت کی غلطی ہے۔

معنی یاب خاں شاعر اور عبد الصمد خاں صوبیدار ملتان بھی اشاریہ سے غیر حاضر ہیں۔

میر عبد الکریم کا حال ص ۱۰۹ پر نہیں ہے۔ خواجہ عبید اللہ بلخی (۸) ۹۶ بھی ندارد ہے۔

علی اصغر انصاری ۸۹، ۹۱ کو کار طلب خاں کے تحت ہونا چاہیے تھا۔

لطف اللہ خاں صادق اور مترسین بھی اشاریے میں نہیں ملتے وغیرہ۔

اس کتاب کے حواشی لکھنے میں مولانا عرشی نے ۹۴ کتابوں سے استفادہ کیا ہے جن کی فہرست آخر میں موجود ہے۔ تاریخِ محمدی کے کُل صفحات ۳۱۹ ہیں اور اسے ۱۹۶۰ء میں شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے ہندوستان پرنٹنگ ورکس رامپور میں چھاپا گیا تھا۔

مولانا عرشی نے یہ حصہ مرتب کر کے ایک نمونہ تو پیش کر دیا ہے کاش کوئی باہمت انسان تاریخ محمدی کی بقیہ جلدوں کو بھی ترتیب معکوس کے ساتھ مدوّن کر کے شائع کر دے تو یہ بہت بڑی علمی خدمت ہوگی۔

ڈاکٹر خلیق انجم

مولانا عرشی۔ اردو کے پہلے متنی نقاد

اسلام میں متنی تنقید کی روایت بہت قدیم ہے۔ جس صحت اور احتیاط کے ساتھ حدیثیں مرتب کی گئی ہیں، اس کی انسانی تاریخ میں کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ اگرچہ محدثین نے ہر ممکن احتیاط سے کام لیا پھر بھی بعض ایسی حدیثیں خاصی تعداد میں رواج پا گئیں جنھیں مشکوک سمجھا جاتا ہے۔ متنی تنقید کے اصولوں ہی نے ان حدیثوں کو مشکوک قرار دیا ہے۔ متنی تنقید ایک فن کی حیثیت سے مغرب میں وجود میں آئی۔ اس کے باقاعدہ اصول ان لوگوں نے مرتب کیے جنھوں نے بائبل کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا۔ بائبل کے بعد لاطینی اور انگریزی کلاسیکی ادب کے بعض شہ پاروں کا تنقیدی ایڈیشن تیار کیا گیا اور لگ بھگ ڈیڑھ سو سال میں متنی تنقید نے ایسے علم کی صورت اختیار کر لی جس کی بنیادیں سائنٹی فک انداز پر اٹھائی گئی تھیں۔ سرسید اردو کے پہلے محقق ہیں۔ ان کی کتاب "آثار الصنادید" اگرچہ آثار قدیمہ کے موضوع پر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ "آثار الصنادید" تحقیق کا بھی بہترین نمونہ ہے۔ سرسید نے تاریخ کے موضوع پر بھی اردو میں "جام جم" "سلسلۃ الملوک" "تاریخ بجنور" "تاریخ سرکشی ضلع بجنور" اور "اسباب بغاوت ہند" جیسی اہم کتابیں لکھی تھیں، جن میں سرسید کی غیر معمولی تحقیقی صلاحیتوں کا اظہار ہوا ہے۔ ان سب کتابوں کو اپنے زمانے میں بہت

مقبولیت حاصل ہوئی ۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ اردو محققین کی ذہنی تربیت اور فکری رویوں کی تشکیل میں ان کتابوں کا اہم حصہ نہ رہا ہو۔ سرسید کا احسان صرف اردو تحقیق پر نہیں ہے۔ بلکہ انھوں نے متنی تنقید کا بھی پہلا بہترین نمونہ پیش کیا۔ میں نے اپنے ایک مقالے میں سرسید کی ان خدمات کا جائزہ لیا تھا۔ جو انھوں نے متنی نقاد کی حیثیت سے انجام دی ہیں۔ میں اس مقالے کا ایک اقتباس یہاں نقل کر رہا ہوں ۔

سرسید کی مرتبہ " آئین اکبری " فارسی میں ہے۔ لیکن سرسید کے فوراً بعد جن لوگوں نے اردو متن ترتیب دیے، ان میں سے بیشتر کے پیش نظر " آئین اکبری " کا وہ اڈیشن رہا ہوگا جسے سرسید نے مرتب کیا تھا ۔

حاجی قطب الدین، دلی کے ایک ناشر اور کتب فروش تھے۔ انھوں نے حالی کے الفاظ میں سرسید سے درخواست کی کہ : " اگر آپ آئین اکبری پر ایک تفصیلی نظر ڈال کر اس کی تصحیح اور درستی کر دیں تو میں اس کو چھپوا دوں اور اس کے معاوضے میں " آئین اکبری " کے چھپے ہوئے نسخے قیمتی سولہ روپے کے آپ کی نذر کر دوں گا۔"

یہ درخواست اس وقت کی گئی تھی جب سرسید دہلی میں منصف کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے اس وقت تو یہ کام مناسب نہیں سمجھا، لیکن کچھ دن بعد جب بجنور تبادلہ ہو گیا تو انھوں نے یہ کام شروع کیا، " آئین اکبری "ہندوستان کی کسی بھی زبان کا پہلا متن ہے۔ جسے کسی ہندوستانی نے مغرب کے بنائے ہوئے متنی تنقید کے سائنٹی فک طریقوں کے مطابق مرتب کیا۔ مولانا حالی نے اس کی ترتیب کے بارے میں لکھا ہے: " .... آئین اکبری کے نسخے کاتبوں کے سہو و خطا سے اکثر مسخ ہو گئے تھے: اس لیے اس کا صحیح کرنا سخت دشوار تھا۔ سرسید نے اول جہاں تک مل سکے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے ۔ اس میں ایک آدھ نسخہ صحیح بھی مل گیا اور اس طرح غلط اور صحیح نسخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے ایک نسخہ سب سے زیادہ صحیح تیار ہو گیا۔ اس کے بعد انھوں نے

فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے اکثر غریب الفاظ کی شرح کی۔ جو اصطلاحیں اکبر کے زمانے میں ہر ایک آئین کے متعلق مستعمل تھیں یا خود ابوالفضل نے اختراع کی تھیں، ان کی جا بجا تشریح کی۔ اُس زمانے کے اوزان اور نقود کی اِس زمانے کے اوزان و نقود سے مطابقت کی۔ جن جدولوں میں مصنف نے کچھ خانے خالی چھوڑ دیے تھے اور تمام نسخوں میں وہ خانے خالی پائے گئے، ان کو اور کتابوں سے تحقیق کر کے معمور کیا۔ کہیں کہیں جدولوں میں جو خود مصنف نے غلطی کی تھی، اس کو بھی بہت تحقیق کر کے بعض جدولوں میں ہندسوں کی جگہ حرف لکھے ہوئے تھے، ان کی قیمت ہندسوں میں بھی ظاہر کر دی۔ بعض جدولیں جو تمام نسخوں میں مختلف پائی گئیں، وہ آئین کے انگریزی ترجمے کے مطابق جس میں ہر جدول نہایت صحت کے ساتھ لکھی گئی تھی: کتاب میں داخل کیں۔ اکثر جدولوں میں ایک خانہ اپنی طرف سے آخر میں اس لیے اضافہ کیا کہ اس سے پہلے خانے کا مفہوم ہر شخص بآسانی سمجھ جائے ۔"

(حیات جاوید، حالی، نئی دلی، ۱۹۷۹ء ص ۷۲-۷۳)

" آئین اکبری " کا تنقیدی ایڈیشن تیار کرنے کے لیے سرسید نے متنی تنقید کے جن اصولوں کو اپنایا تھا، ان کی پوری تفصیل حالی نے بیان کی ہے۔ یہ متن تین جلدوں میں مرتب ہوا۔ پہلی اور تیسری جلد تو غدر سے پہلے چھپ گئی تھی لیکن دوسری جلد، جو بعد میں تیار ہوئی تھی، چھپنے سے پہلے غدر میں ضائع ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب نے سرسید کی زندگی کو ایک نیا موڑ دیا تھا اب وہ اسکالر سے زیادہ مصلح قوم تھے۔ ان کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ اس کے باوجود اپنے علمی ذوق کی آسودگی کے لیے وہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ضیاءالدین برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" مرتب کر کے ۱۸۶۲ء میں اور " تزک جہانگیری " ترتیب دیکر ۱۸۶۴ء میں شائع کیں۔ یہ دونوں کام بھی اعلا درجے کے ہیں۔ لیکن ان پر

وہ محنت ممکن نہیں تھی، جو سرسید نے "آئین اکبری" کے متن پر کی تھی۔

انیسویں صدی میں اردو میں مولانا الطاف حسین حالی، ڈاکٹر نذیر احمد، علامہ شبلی، جیسے عظیم مورخ، ادیب، سوانح نگار اور نقاد پیدا ہوئے۔ لیکن ان حضرات نے کسی متن کا تنقیدی اڈیشن تیار نہیں کیا۔ نول کشور اور دوسرے بے شمار پبلشروں نے اردو اور فارسی کے کلاسیکی متن چھاپے ضرور لیکن کسی نقاد نے انھیں مرتب نہیں کیا تھا۔

بیسویں صدی میں بڑے پیمانے پر کلاسیکی متن چھاپے گئے لیکن بیشتر متن مرتب کیے بغیر شائع کیے گئے ہیں۔ بیسویں صدی نے دو عظیم محقق اور ایک متنی نقاد پیدا کیا: میری مراد ہے حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی سے، ان میں شیرانی صاحب اور قاضی صاحب محقق تھے اور عرشی صاحب متنی نقاد۔ عمر کے اعتبار سے حافظ محمود شیرانی ان تینوں میں بڑے تھے۔ اور میرے خیال سے تحقیق کے میدان میں بھی ان کا مرتبہ بلند تھا۔ شیرانی صاحب کا بنیادی کام تحقیق کے میدان میں ہے۔

شیرانی صاحب اور قاضی صاحب نے بھی متنی تنقید کے نمونے پیش کیے ہیں۔ عرشی صاحب کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے ان حضرات کی دو کتابوں کا جائزہ ضروری ہے

حافظ محمود شیرانی نے، میر قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ "مجموعہ نغز" دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ دو مخطوطات کی مدد سے یہ ایڈیشن تیار کیا گیا ہے۔ شیرانی صاحب نے اس کا جو دیباچہ اور مصنف کے حالات لکھے ہیں وہ کل ۳۲ صفحات پر مشتمل ہیں۔ دیباچے میں متن کے بارے میں کچھ اہم اطلاعات دی گئی ہیں۔ اس تذکرے کی ترتیب میں شیرانی صاحب نے دوسرے تذکروں سے بالکل مدد نہیں لی۔ یہ درست ہے کہ مجموعہ نغز کا متن بہت حد تک درست ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کی ترتیب کا وہ انداز نہیں ہے جو امتیاز علی خاں عرشی کی کتابوں کا ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب نے محمد روشن جوشش کا دیوان، دیوان جوشش کے نام سے مرتب کیا۔ اس اڈیشن کا متن ممکن ہے کہ بالکل درست ہو۔ لیکن اس کا متن قاضی عبدالودود کی، مختصر نویسی، خشک عبارت اور قاضی صاحب کے مخصوص مزاج کی نذر ہو گیا

ہے۔ قاضی صاحب نے عرض حال کے نام سے جو دیباچہ لکھا ہے اس کے دوسرے صفحے کی عبارت کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو۔ "ص۔ ۸ ش کی تکمیل خ سے پہلے ہوئی ہے۔" "بعض شعر مثلاً ۲/۴ ش میں ن کے مطابق ہیں اور خ میں مختلف۔" بعض صفحات تو بالکل حساب کی کتاب کے معلوم ہوتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ انجمن ترقی اردو (ہند) نے یہ اڈیشن ۱۹۴۱ء میں شائع کیا تھا لیکن اب بھی اس کے نسخے خاصی تعداد میں انجمن کے بکڈپو میں موجود ہیں۔

شیرانی صاحب کے مجموعۂ نغز اور قاضی عبدالودود صاحب کے دیوان جوشش سے قبل عرشی صاحب کی مرتبہ "مکاتیب غالب" شائع ہو چکی تھی۔ لیکن ان دونوں حضرات نے عملی متنی تنقید کے اس بہترین کام کو اپنے لیے نمونہ نہیں بنایا۔ میں نے یہ بات شروع میں کہی تھی کہ سائنٹی فک انداز میں متنی تنقید کے بنیادی اصولوں کی ترتیب مغرب میں ہوئی۔

عرشی صاحب نے مشرقی تعلیم حاصل کی تھی۔ انھوں نے مختلف مکاتب میں تعلیم پائی اور ۱۹۲۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ عرشی صاحب جب پرائمری اسکول کے طالب علم تھے تو انھیں انگریزی پڑھانے کے لیے گھر پر استاد رکھا گیا تھا۔ لیکن ان کو انگریزی میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس لیے کچھ دن بعد انھوں نے انگریزی پڑھنی چھوڑ دی۔ ۱۹۲۶ء میں انھوں نے صرف انگریزی میں انٹرنس کی سند حاصل کر لی۔ اس کے بعد انگریزی جتنی پڑھی اپنے شوق سے۔ ان کے تیار کیے ہوئے تنقیدی ایڈیشن دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس فن میں انگریزی کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ انھوں نے انگریزی کے کسی تنقیدی اڈیشن کو اپنے لیے نمونہ بنایا ہو۔ جس کا مطلب ہے کہ عرشی صاحب نے اپنے شوق سے انگریزی زبان اور ادب پر بہت اچھی قدرت حاصل کر لی تھی۔

عرشی صاحب محقق، نقاد، ادیب اور شاعر تھے۔ وہ عربی، فارسی اور اردو کے زبردست عالم تھے۔ لیکن بنیادی طور پر وہ متنی نقاد تھے۔ انھوں نے اردو میں متنی تنقید کے اعلاترین عملی نمونے پیش کیے ہیں۔

عرشی صاحب کا متنی تنقید کے میدان میں پہلا کارنامہ "مکاتیب غالب" ہے

جو ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں "انتخاب غالب" کا تنقیدی اڈیشن شائع ہوا۔ یہ غالب
کے اردو اور فارسی کلام کا وہ انتخاب تھا جو انھوں نے ۱۸۶۶ء میں رام پور کے نواب کلب علی خاں کی
خدمت میں پیش کیا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں شاہ عالم ثانی کے فارسی، برج بھاشا اور اردو دیوان "نادرات
شاہی" کا تنقیدی اڈیشن تیار کر کے شائع کیا۔

انشاء اللہ خاں انشا نے "سلک گوہر" کے نام سے صنعت مہملہ (غیر منقوط) میں ایک
کہانی لکھی تھی جس کا واحد نسخہ رضا لائبریری میں محفوظ تھا۔ عرشی صاحب نے اس کہانی کا تنقیدی
اڈیشن ۱۹۴۸ء میں شائع کیا۔

۱۹۵۸ء میں دیوان غالب کا معرکۃ الآرا تنقیدی اڈیشن شائع کیا۔ اس کتاب پر
انھیں ساہتیہ اکاڈمی انعام ملا۔

رضا لائبریری میں انشاء اللہ انشا کی لکھی ہوئی کہانی "رانی کیتکی" کے دو مخطوطے محفوظ
ہیں۔ انھی مخطوطات کی بنیاد پر عرشی صاحب نے "کہانی رانی کیتکی کی" کا تنقیدی اڈیشن
تیار کیا جسے انجمن ترقی اردو (ہند) شائع کر رہی تھی۔ ابھی اس کتاب کے چھپنے کی نوبت نہیں
آئی تھی کہ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اور یہ کتاب کچھ عرصے بعد انجمن ترقی اردو پاکستان سے
شائع ہوئی۔ لیکن نہ جانے کس غلط فہمی کی وجہ سے اس پر مرتب کی حیثیت سے مولوی عبد الحق کا
نام تھا۔ یہ واقعہ نذر عرشی میں بیان کیا گیا ہے اور خود مولانا عرشی مرحوم نے یہ واقعہ مجھ سے بیان
کیا تھا۔ عرشی صاحب نے مومن کا اردو دیوان بھی مرتب کیا تھا اور اس کے حواشی وغیرہ
مکمل ہو چکے تھے۔ یہ اڈیشن اب کہاں ہے اور کس حال میں ہے یہ بتانا مشکل ہے۔

یہاں تک میں نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے وہ سب اردو میں ہیں۔ عرشی صاحب نے
فارسی اور عربی کی کتابیں بھی مرتب کی تھیں۔ فارسی میں اردو کے نقطۂ نظر سے
"دستور الفصاحت" بہت اہم ہے۔ جس کا میں تفصیلی ذکر میں بعد کروں گا۔ یہ کتاب ۱۹۴۳
میں شائع ہوئی تھی۔ عرشی صاحب نے ۱۹۶۲ء میں "تاریخ اکبری المعروف بہ تاریخ قندھاری"
مرتب کر کے شائع کی۔ جو ۴۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ عہد اکبری کے ایک درباری کی لکھی ہوئی
تاریخ ہے۔ عرشی صاحب کو اس کے دو نسخے دستیاب ہوئے تھے۔ ایک نسخہ رضا لائبریری

میں اور دوسرا کیمبرج میں۔ عرشی صاحب نے ان دونوں نسخوں کی مدد سے یہ اڈیشن تیار کیا ہے۔
۱۹۶۰ء میں عرشی صاحب نے ۳۲۸ صفحات پر مشتمل مرزا محمد حارثی بدخشی دہلوی کی تاریخ کے
موضوع پر کتاب "تاریخ محمدی" شائع کی۔ حارثی نے ایک ہجری سے ۱۱۶۱ھ تک کے مشاہیر
کی وفیات مرتب کی ہیں۔ عرشی صاحب نے صرف ایک باب کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا ہے۔
عرشی صاحب نے میر علاؤ الدین قزوینی کا "تذکرۂ نفائس المآثر" اور مرزا خان بن فخر الدین
احمد کی کتاب "تحفۃ الہند" کے بھی تنقیدی اڈیشن تیار کیے تھے۔ جو ان کی زندگی میں شائع نہیں
ہوئے تھے۔ اس مقالے میں عرشی صاحب کی صرف دو کتابوں کا قدرے تفصیلی جائزہ لینا چاہتا
ہوں۔ ایک تو "مکاتیب غالب" اور دوسری "دستور الفصاحت"۔

۱۹۸۴ء میں میری مرتبہ غالب کے خطوط کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی۔ اس کے حرف
آغاز میں میں نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا متنی نقاد کی حیثیت سے اعتراف کرتے ہوئے
لکھا تھا:

> " جملۂ معترضہ کے طور پر عرض کر دوں کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا
> مرتبہ مکاتیب غالب، غالب کے خطوط کا غالباً وہ پہلا اڈیشن ہے، جس
> میں انتہائی سائنٹی فک طریقے سے متن کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا گیا ہے۔
> دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مجموعے میں غالب کے بیشتر خطوط سو روپے ماہوار
> کی رسید ہونے کی وجہ سے بالکل غیر اہم ہیں۔ مکاتیب غالب کی اہمیت
> ان کے مکتوب الیہم کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ انھیں غالب نے
> لکھا اور عرشی صاحب جیسے متنی نقاد نے ان کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا۔"

اس وقت یہ بات میں نے غالب کے خطوط کے سیاق و سباق میں کہی تھی اب اگر ہم
اردو میں متنی تنقید کی تاریخ کا جائزہ لیں تو جس طرح فارسی میں سرسید کی بہت بڑی کتاب
"آئین اکبری" ہے اسی طرح اردو میں پہلا تنقیدی اڈیشن جسے سائنٹی فک طریقے پر تیار کیا
گیا ہے۔ عرشی صاحب کی مرتبہ "مکاتیب غالب" ہے۔

مکاتیب غالب کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۷ء میں ۲۲۰ صفحات پر مشتمل تھا اور نسخ ٹائپ

میں بمبئی سے شائع ہوا۔ اور آخری یعنی چھٹا اڈیشن ۱۹۴۹ء میں لیتھو کے ذریعہ رام پور سے چھپا تھا۔ یہ اڈیشن ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان دونوں اڈیشنوں کا موازنہ ضروری ہے۔ کیونکہ چھٹے اڈیشن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرشی صاحب مرحوم نے نئے اڈیشنوں میں خاصی ترمیم اور اضافے کیے ہیں خطوط کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ ان دونوں اڈیشنوں کے مضامین کی فہرست پر ایک نظر ڈالیے، پہلے اڈیشن میں فہرست کے عنوان ہیں۔ تمہید سرگذشت غالب، تصانیف تلامذہ لوازمات امارت، انگریزی تعلقات، بہادر شاہ ظفر سے تعلقات، تعلقات رامپور، انشاءِ غالب، متعلقات انشا، طباعت خطوط اور پھر خطوط کا متن۔ چھٹے اڈیشن میں "تلامذہ" کا عنوان بدل کر "تلامذۂ رام پور" کر دیا گیا ہے۔ "بہادر شاہ ظفر سے تعلقات" کو بدل کر "تعلقات قلعۂ معلیٰ" کر دیا گیا ہے۔ "اصلاح غالب"، "املائے غالب" کے عنوان سے دو نئے ابواب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ دیباچے کی عبارت میں خاصی تبدیلی کی گئی ہے۔

اب آیئے خطوط کے متن کی طرف۔ پہلے اڈیشن میں نواب یوسف علی خاں کے نام ۴۲ خطوط تھے۔ آخری اڈیشن میں یہ تعداد ۴۴ ہوگئی۔ پہلے اڈیشن میں نواب کلب علی خاں کے نام ۶۵ خطوط تھے۔ جب کہ آخری اڈیشن میں یہ تعداد ۳۷ ہوگئی۔ ۱۹۴۹ء کے آخری اڈیشن میں صاحب زادہ سید محمد عباس علی خاں کے نام دو خطوط ہیں جب کہ پہلے اڈیشن میں ان کے نام کوئی خط نہیں ہے۔ پہلے اڈیشن میں منشی سبیل چند کے نام چھ خطوط ہیں۔ آخری اڈیشن میں یہ تعداد ۷ ہوگئی۔ پہلے اڈیشن میں حواشی بالکل نہیں ہیں۔ جب کہ آخری اڈیشن میں بہت مکمل حواشی موجود ہیں۔ پہلے اڈیشن میں اشخاص و قبائل اور مقامات کا مکمل اشاریہ ہے۔ جب کہ آخری اڈیشن میں اشاریہ شامل نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مکاتیب غالب رام پور کے اسکولوں کے نصاب میں شامل ہو گئی تھی۔ اس لیے آخری اڈیشن طالب علموں کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اشاریہ شامل نہیں کیا گیا۔ میں نے ان دونوں اڈیشنوں کا موازنہ یہ دکھانے کے لیے کیا ہے کہ ہمارے بیشتر محقق، نقاد ایک دفعہ کتاب لکھ کر ہمیشہ کے لیے اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ وہ نئے اڈیشن میں کسی بھی طرح کی تبدیلی پر وقت صرف نہیں کرتے۔ لیکن ایک سچے عالم کی طرح عرشی صاحب

اپنی تحریروں پر مسلسل نظر ثانی کرتے رہتے تھے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے مرتبہ مکاتیب غالب کا آخری اڈیشن پہلے اڈیشن کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی ایک اور کتاب "دستور الفصاحت" کے بارے میں چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ سید احمد علی یکتا لکھنوی نے اس کتاب کی تالیف کا کام دریائے لطافت سے پہلے شروع کر دیا تھا۔ اور غالباً دریائے لطافت کی تکمیل سے پہلے مکمل ہو گیا تھا۔ لیکن دریائے لطافت کو شہرت حاصل ہو گئی۔ اور دستور الفصاحت گم نامی کے پردے میں رہی۔ یکتا لکھنوی نے اس کتاب میں بقول عرشی صاحب "اردو زبان کی پیدائش، ترقی اور حلقۂ اثر سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد چند ابواب اور ذیلی فصلیں قائم کر کے صرف، نحو، معانی، بیان، بدیع، عروض اور قافیے کے قواعد و ضوابط بیان کیے ہیں۔ خاتمے میں ۱۲۵ ایسے شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ جن کے شعر کتاب کے اندر سند کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ عرشی صاحب مرحوم نے اس کتاب کے مقدمے اور آخری حصے کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا ہے۔ عرشی صاحب نے ۱۱۷ صفحات پر مشتمل بہت عالمانہ مقدمہ لکھا ہے۔ اگر میں غلط نہیں ہوں تو اس سے پہلے کسی بھی تذکرے کے تنقیدی اڈیشن پر اتنا تفصیلی مقدمہ نہیں لکھا گیا۔ اور نہ ہی متن کے اتنے مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی۔ یہ مقدمہ خود اپنی جگہ پر ایک کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تنقیدی ایڈیشن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عرشی صاحب نے حواشی لکھنے میں ۵۸ تذکروں سے مدد لی ہے۔ دستور الفصاحت میں ۲۵ شاعروں کا ذکر ہے ان ۵۸ تذکروں میں جہاں کہیں ان شاعروں کا ذکر آیا ہے جو دستور الفصاحت میں شامل ہیں۔ عرشی صاحب نے وہ عبارتیں نقل کر دی ہیں۔ کتاب کے آخر میں اشخاص اور کتابوں کا اشاریہ دیا گیا ہے۔

عرشی صاحب نے جس متن کا بھی تنقیدی اڈیشن تیار کیا ہے وہ محمود شیرانی مرحوم اور قاضی عبدالودود کے مرتب کیے ہوئے تنقیدی اڈیشنوں سے بہت بہتر ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ عرشی صاحب پہلے نقاد ہیں جنھوں نے سائنٹی فک طریقے سے تنقیدی مضامین لکھے ہیں۔

غالبؔ کے خطوط (جلد سوئم)

مرتبہ: خلیق انجم

○

صفحات : ــــ ۴۸۲
قیمت : پچھتر روپے
طباعت : ــــ آفسٹ

اُردو کے مشہور و مُمتاز مُحقق ڈاکٹر خلیق انجم نے غالب کے تمام اُردو خطوط کا پہلی بار چار جلدوں میں سائنٹی فک طریقے سے تنقیدی اڈیشن تیار کیا ہے تین جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

ملنے کا پتا

غالب انسٹی ٹیوٹ ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

ڈاکٹر اسلم پرویز

متنی تنقید اور دیوانِ غالب

نسخۂ عرشی

اُردو میں اگرچہ متنی تنقید کے موضوع پر بس گنتی کی ایک دو کتابیں ہی ہیں لیکن پچھلے برسوں میں تدوینِ متن کے بعض بہترین نمونے ضرور سامنے آئے ہیں اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی اور ان سے تھوڑا آگے چل کر رشید حسن خاں اور خلیق انجم وغیرہ کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں۔ تاہم تدوینِ متن کے اعتبار سے ان تمام ناموں میں جو نام بلاشبہ سب سے ممتاز اور افضل ہے وہ مولانا امتیاز علی عرشی کا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عرشی صاحب کو عربی، فارسی اور اُردو پر مکمل عبور حاصل تھا اور وہ دینی علوم سے بھی بھرپور واقفیت رکھتے تھے۔ اور جہاں تک اردو کے کلاسیکی متون کی تدوین کا معاملہ ہے شاید ایسی ہی صلاحیتوں کا اسکالر اس کام کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے لہٰذا اُردو میں تدوینِ متن کے بے نظیر نمونوں کی جو بھی تعداد ہے ان میں نصف سے زیادہ مولانا امتیاز علی عرشی کے کارنامے ہیں۔ اگر ہم اپنی بات کو صرف اُردو کے کلاسیکی متون تک محدود رکھیں تو عرشی صاحب کے تدوین کے کارناموں میں مُکاتیبِ غالب، شعرائے اُردو کا فارسی تذکرہ دستور الفصاحت، اور دیوانِ غالب نسخۂ عرشی نمایاں حثییت کے حامل ہیں۔ عرشی صاحب کی تالیفات کی فہرست پر نظر ڈالیے تو جس ایک موضوع پر انھوں نے سب سے زیادہ کام کیا ہے

وہ ہے غالب۔ انھوں نے غالب میں اپنی دل چسپی کا سب سے پہلا ثبوت ۱۹۳۷ء میں "مکاتیب غالب" کی شکل میں بہم پہنچایا۔ اور غالب میں ان کی اس دلچسپی کا نقطۂ عروج ہے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی جو مکاتیب غالب کی اشاعت کے اکیس برس بعد ۱۹۵۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۸ء کے درمیان عرشی صاحب نے غالب کی سماجی اور ادبی شخصیت کے کن کن گوشوں کی کیسی کیسی سیر کی ہے اس کا اندازہ دیوان غالب نسخۂ عرشی میں شامل ان کے حواشی سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ایک ذمّے دار متنی نقّاد جب کسی کلاسیکی متن کی تدوین کا کام اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو وہ تدوین متن کی تمام ضروریات کو اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے جن میں بنیادی کام مستند متن کی تیاری کا ہے جو ان تمام مخطوطات اور مطبوعہ نسخوں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے جو تدوین متن کے وقت تک دستیاب ہوں۔ مستند یا بنیادی متن کی تیاری کے بعد وضاحت طلب امور کی جانب توجہ کی جاتی ہے یہاں متن کا مرتب اس متن سے متعلق اپنی ترجیحات کو کام میں لاتا ہے۔ تاہم وضاحت طلب امور کا کوئی مقررہ پیمانہ بھی نہیں ہے بلکہ اس بات کا دار و مدار مرتب کی صلاحیت اور اس کی وسعت نظر پر ہے۔ اس کی نظر جتنی گہری ہوگی وضاحتی معاملات بھی اتنے ہی بسیط ہوتے چلے جائیں گے۔ اس کے علاوہ تدوین متن کا ایک سائنٹفک طریقہ یہ بھی ہے کہ زیرِ تدوین متن کے مصنف کی شخصیت کو بھی متن ہی کا ایک ضروری جُز تصور کیا جائے۔ کوئی بھی متن اور اس کا مصنف دو ایسی گتّھیاں ہیں جو اپنے اپنے طور پر تو اُلجھی ہوئی ہیں ہی اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے میں بھی بے طرح گتّھی ہوئی ہوتی ہیں اس لیے جب تک دونوں ہی پوری طرح نہ سلجھ جائیں مسئلہ صحیح معنوں میں حل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ متنی تنقید بھی تحقیق ہی کا ایک شعبہ ہے لیکن تحقیق اور متنی تنقید کا بنیادی فرق یہ ہے کہ تحقیق، تدوین سے ہٹ کر بھی کی جاسکتی ہے لیکن تدوین کے لیے تحقیق لازمی ہے۔ متنی تنقید کے بارے میں یہ بات تو اکثر کہی گئی ہے کہ وہ ادبی تنقید کو مُستند مواد فراہم کرتی ہے لیکن متنی تنقید خود تحقیق کے لیے جو نئے باب کھولتی ہے اس کے ثبوت کے طور پر دیوان غالب نسخۂ عرشی کے حواشی اور تعلیقات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس اعتبار سے متنی تنقید کا فن تحقیق کے مقابلے میں زیادہ

ریاض اور دِقّتِ نظر کا طالب ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو میں اعلا تعلیم کے فروغ کے ساتھ جس تیز رفتاری سے محققین کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اس کے مقابلے میں متنی نقادوں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔

پچھلے دنوں ایک صاحب سے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ صاحب اگرچہ ادب کا اعلا مذاق رکھتے تھے اور عرشی صاحب کی علمیت کے بھی معترف تھے لیکن تحقیق سے شاید انھیں کوئی علاقہ نہیں تھا۔ انھوں نے بظاہر ایک بڑی معقول بات کہی اور وہ یہ کہ اگر کسی تخلیقی فن کار نے بذاتِ خود اپنی تخلیقات کو چھان پھٹک کر ان کا ایک ایسا انتخاب قاری کے سامنے پیش کر دیا ہے جو فن کار کے نزدیک اس کی بہترین نمائندگی کرتا ہے تو پھر کسی محقق کو چاہے وہ کتنے ہی اعلا پائے کا کیوں نہ ہو یہ کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ گڑے مُردے اکھاڑے اور وہ تمام چیزیں جنھیں فن کار نے رطب و یابس سمجھ کر خارج کر دیا تھا انھیں پھر سے اس کی تخلیقات میں شامل کر کے ان کی دھار کند کرے۔ اس بات میں اگرچہ وزن معلوم دیتا ہے تاہم اس کا معقول جواب دیا جاسکتا ہے تخلیقی ادب سے متعلق کسی متن کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک حیثیت اس متن کی ادبی شہ پارے کی ہے جس کا براہِ راست تعلق ادب کے قاری سے ہے۔ اس حیثیت سے یقیناً دیوانِ غالب مرتبہ اسد اللہ خاں غالب ہی اصل دیوانِ غالب ہے۔ متن کی دوسری حیثیت ادبی ماخذ کی ہے یہ متن کی وہ حیثیت ہے جہاں اس کے حدود و اطراف کا کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ یہاں اس متن کے حدود و اطراف میں خود اس متن پر کام کرنے والے محقق یا مرتب کے حدود و اطراف بھی شامل ہیں۔ غالب یا کسی بھی ادیب کی کوئی تحریر اس کی اپنی ادبی اور سماجی شخصیت کا ماخذ تو ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے عہد کے ادبی اور سماجی رویّوں کا بھی اہم ماخذ ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ان حدود و امکانات کی بازیافت کا کسی محقق یا متنی نقاد کے پاس کتنا سامان موجود ہے۔ ادب کے قاری کے لیے غالب یا کسی بھی شاعر کا کلام ایک شعری مجموعے یا دیوان کی حیثیت رکھتا ہے جو ہمارے ذوق کی تسکین کا سامان ہونے کے ساتھ ساتھ اس وقت تک نقدِ ادب کا بھی موضوع رہتا ہے جب تک کوئی محقق نقاد اس کے گم شدہ یا نئے سیاق سباق کو سامنے نہ لے آئے۔ اس اعتبار

سے ایک سنجیدہ متنی نقاد کا کام رگِ سنگ سے لہو ٹپکانا ہے۔ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی اسی رگِ سنگ سے لہو ٹپکانے کا دوسرا نام ہے۔

اس نہج کی تدوین سے جہاں غالب کے کم و بیش تمام اشعار زمانی ترتیب سے یکجا کر دیے گئے ہیں بہت سے نئے نکات بھی سامنے آتے ہیں مثلاً جن اشعار کو غالب نے رد کیا یا جنھیں اپنے دیوان میں برقرار رکھا ان کے غائر مطالعے سے اس بات کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ غالب کے ہاں ردّ و قبول کا کیا معیار تھا اس ردّ و قبول کے ضمن میں الفاظ کے املا اور تلفظ سے لے کر شعری موضوعات اور طریقۂ اظہار تک کے مسائل زیرِ بحث آ سکتے ہیں۔

دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کے تمام ہی حواشی غالب کی شخصیت اور شاعری پر غور و فکر کرنے کے نقطۂ نظر سے انتہائی اہم ہیں تاہم یہاں مختصر سا تذکرہ اس مضمون کا کیا جا سکتا ہے جو نسخۂ عرشی کے تعلیقات میں 'شرحِ غالب' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس گفتگو میں 'شرحِ غالب' ہی کو خاص طور پر معرضِ بحث میں لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ 'شرحِ غالب' تحقیق و تدوین ہی نہیں مطالعہ شاعری کے نقطۂ نظر سے بھی کافی اہم ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کی تکمیل کے آٹھ سال بعد ۱۹۶۶ء میں پرتھوی چند نے 'مرقعِ غالب' شائع کی تھی 'مرقعِ غالب' کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تحریک کو شاید نسخۂ عرشی کے اسی مضمون سے ہوئی ہے جس کا عنوان 'شرحِ غالب' ہے۔ تاہم میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ 'مرقعِ غالب' کا دائرہ، باوجود اس کے کہ وہ شرحِ غالب کے بعد کی تالیف ہے 'شرحِ غالب' کے مقابلے میں تنگ ہے۔

'شرحِ غالب' سے تنقیدی سطح پر تحریک حاصل کرنے والوں میں شاید سب سے پہلا نام ڈاکٹر سید عبداللہ کا ہے۔ نذرِ عرشی مرتبہ مالک رام و مختار الدین احمد میں 'غالب ـــــ دو زبان شاعر' کے عنوان سے ڈاکٹر سید عبداللہ کا جو مضمون شامل ہے اس میں غالب کی فارسی دانی سے متعلق دل چسپ انکشافات ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ غالب کو اپنی فارسی دانی پر بے پناہ ناز تھا یہاں تک کہ وہ اپنے ریختے کو بھی اپنے فارسی کلام سے کم تر درجے کا سمجھتے تھے یہ اور بات ہے ان کا یہی ریختہ ان کی فارسی کو چھوڑ کر بقیہ فارسی کے لیے رشکِ فارسی تھا۔ غالب اپنی فارسی دانی کا کتنا ہی دعوا کیوں نہ

کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ فارسی ان کی اکتسابی اور اردو مادری زبان تھی۔ فارسی کی مثال غالب کے ہاں برسات کی ان بوندوں کی سی ہے جن میں وہ شرابور رہیں لیکن برسات کی وہ قاتل ہوا جو تیر سی سینے کے پار گزر رہے ہے وہ تو اردو ہی ہو سکتی ہے دراصل مدنیت کا طرۂ امتیاز وہ مہذب ریاکاری بھی ہے جسے کلاہِ پاپاخ کی طرح لوگ امتیازی شان کے ساتھ سر پر اٹھائے پھرتے ہیں۔ اسی پر سٹیج سمبل کا شکار اپنے زمانے میں غالب بھی تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے 'شرحِ غالب' کے مطالعے کی روشنی میں فارسی دانی سے متعلق غالب کی اسی سائیکی کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ انھوں نے غالب کے بارے میں یہ بات بالکل صحیح کہی ہے کہ 'فارسی غالب کے لیے اکتساب اور اظہارِ حقیقت کی اور اردو جذبوں کی زبان تھی'۔ 'شرحِ غالب' میں عرشی صاحب نے غالب کے بعض اردو اشعار کے مقابلے میں لگ بھگ اسی مضمون کے غالب کے فارسی شعر بھی دیے ہیں۔ ایک اردو شعر اور اس سے ملتا جلتا فارسی شعر اس طرح ہیں :

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا (اُردو)

لالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پسِ مرگ
تا چہا در دلِ غالب ہوسِ روے تو بود (فارسی)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان دونوں اشعار سے بحث کرتے ہوئے فارسی شعر پر اردو شعر کی فضیلت ثابت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"دونوں شعروں کا مضمون تقریباً یکساں ہے لیکن لفظوں کا انتخاب، اظہار کا پیرایہ، اور فضا مختلف ہیں۔ فارسی شعر میں محض اظہار ہے۔ اس کے مقابلے میں اُردو شعر میں اظہار مؤثر اور بلیغ بھی ہے مضمون کا مرکزی لفظ فارسی شعر میں لالہ و گل ہے اور اُردو میں حنا۔ "لالہ و گل" بھی خوب ہے، مگر اس میں عمومیت ہے "حنا" سے ایک خاص اور معیّن تصوّر وابستہ ہے۔ لالہ و گل سے صرف یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ چہرہ خوبصورت ہوگا، مگر حنا سے پاؤں پر لگی ہوئی حنا کی تصویر واضح اور معیّن ہو جاتی ہے اور یہ تخیّل کو واضح راستوں

پر چلنے کی تحریک کرتی ہے، اس کے بالعکس گل و لالہ مبہم تصور پیدا کرتے ہیں۔

اس کے بعد "طرفِ مزار" اور "مشہدِ عاشق" کا فرق آتا ہے "مزار" میں محض مرنے کا تخیل ہے "مشہد" میں کسی کے ہاتھ سے شہید ہونے کا تصور اور اس کے جملہ متعلقات (خون، شمشیر اور طشت و تیغ وغیرہ) سامنے آتے ہیں اور تخیل کو بڑے جذباتی راستوں کی طرف راجع کر دیتے ہیں "مشہد سے کوسوں تک" کے مقابلے میں "طرفِ مزار" میں تنگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مزار کہنے کے بعد پسِ مرگ کی ضرورت نہ تھی شعری مجبوری نے یہ اضافہ کرایا ہے۔

دوسرے مصرعے میں ہوسِ روے تو، کے مقابلے میں ہلاکِ حسرتِ پابوس کی ترکیب کتنی شدید تمنا اور گہرے جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ ہوس اور حسرت کا فرق ظاہر ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ، مجھے "تیرے چہرے کی ہوس" تھی۔ ایک بے کیف طریقۂ اظہار ہے۔ اس کے مقابلے میں "ہلاکِ حسرتِ پابوس" (پابوسی کی حسرت میں مرتا ہوں) مؤثر تر پیرایۂ بیان ہے۔

اُردو شعر یہ بھی سمجھاتا ہے کہ عاشق کی شہادت کا خون جہاں جہاں بہہ کر گیا، وہاں ہر طرف دور دُور تک حسرتِ پابوس جاگ اٹھی، اس حسرتِ پابوس نے حنا کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ عاشق کی شہادت گاہ سے کوسوں دور تک حنا اُگ آئی ہے۔ اس سے عاشق کی حسرتِ دل ظاہر ہوتی ہے اور یہ بھی کہ محبوب کے حنائی پاؤں کا نقش عاشق کے دل میں کس طرح گُھبا ہوا تھا کہ مرنے پر بھی اس کے آثار نہ صرف اُبھر آئے بلکہ دُور دُور تک پھیل گئے۔

پابوس کی جسارت کے ساتھ مشہد کا لفظ بے حد مناسب ہے۔ بیان کے انداز نے بھی تاثیر پیدا کی ہے، "کس قدر" کے بعد "یارب" کا کلمۂ دعائیہ (جو یہاں کلمۂ استعجاب و حیرت ہے) فراوانی، وسعت، شدت کا اظہار کر رہا ہے۔ "یارب" کے استعمال سے بلاغت پیدا ہو گئی ہے (جو فارسی کے "دچھا" میں نہیں اگرچہ اپنی جگہ وہ بھی خوب ہے)۔

یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ فارسی کا شعر، شاعرانہ مفروضے کی کمزور سی صورت ہے۔ اس میں واقعے یا معاملے کا موضوع خود غالب ہے، جس نے اپنی زبان سے اپنے مزار کا ذکر کر کے اس پر لالہ و گل اُگائے ہیں۔ یہ فرضی صورت کوشش کے باوجود، باور نہیں کی جا سکتی۔ یہ محض خواب ہے یا آئندہ کا تصور کہ شاعر جیتے جی اپنی قبر کو خود دیکھ رہا ہے۔ اس سے ہمارے واقعاتی اعتماد کو ذرا سا دھکا لگتا ہے

بخلاف اس کے اُردو شعر میں، کسی شہید عاشق کا واقعہ بیان ہوا ہے اور اس کے مشہد کے چاروں طرف حنا کی موجودگی، ایک چشم دید صورتِ حال کا بیان ہے، جسے ایک راوی بیان کر رہا ہے۔ اس سے ہمارے اعتماد کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا۔ فارسی شعر میں صیغۂ متکلم نے شعر کی فضا بگاڑ دی ہے، اُردو شعر میں راوی کے بیان نے یقین پیدا کر دیا ہے۔"

گویا یہاں جذبے کے اظہار میں غالب کا اردو شعر غالب کے فارسی شعر پر سبقت لے گیا۔ "شرحِ غالب" کے مطالعے سے ایک دوسری صورت یہ بھی دیکھنے کو ملتی ہے کہ اساتذۂ فارسی کے خیال کو غالب نے جہاں اُردو کا جامہ پہنانے کی کوشش ہے وہاں اُردو میں باوجود خوب صورت شعر کہہ لینے کے وہ اس کے ہم پلّہ فارسی شعر کی بلندیوں کو چھو لینے سے اکثر قاصر رہے ہیں۔ غالب کا شعر ہے :

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حافظ کا شعر ہے :

آفریں بر دلِ نرمِ تو کہ از بہرِ ثواب
کُشتۂ غمزۂ خود را بنماز آمدۂ

اُردو شعر میں "زود پشیماں کا پشیماں ہونا" یقیناً غالب ہی کا حصہ ہے جسے حافظ کے "کُشتۂ غمزۂ خود را بنماز آمدۂ" کے عین مساوی قرار دیا جا سکتا ہے لیکن حافظ کے پہلے مصرعے کے "آفریں بر دلِ نرمِ تو" کے مقابلے میں غالب کا "کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ" سبک رہ جاتا ہے۔ غالب کا ایک اور شعر ہے :

مَرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و خنجرِ قاتل نہیں رہا

غالب کے اس شعر میں نظیری کے اِس فارسی شعر کا عکس دکھائی دیتا ہے :

آں شکارم من کہ لائق ہم بکُشتن نیستم
شرم می آید مرازاں کس کہ صیادِ منست

سوال پھر وہی ہے کہ کیا غالب کا اُردو شعر نظیری کے فارسی شعر کی بلندیوں کو چھو سکا ہے ـــــ ڈرتے ڈرتے کہنا پڑتا ہے شاید نہیں۔ غالب کے شعر میں سارا زور صرف مرنے پر ہے دستِ قاتل سے نہ سہی کسی اور طرح سہی۔ فارسی شعر میں اصل المیہ یہ ہے کہ عاشق یا شاعر مرنے کے لائق ہی نہیں رہا اور اس کے ہاں قاتل کی جانب غالب کی سی لاتعلقی بھی نہیں بلکہ وہ اپنے صیاد سے شرمندہ ہے کہ وہ اس کے ہاتھوں مارے جانے کا اہل نہیں رہا۔ اسی کے ساتھ کہیں کہیں ایسی مثالیں بھی جہاں غالب کا ریختہ رشک فارسی دکھائی دیتا ہے۔ عرفی کا فارسی شعر ہے :

از من بگیر عبرت و کسبِ ہنر مکن
با بختِ خود عداوتِ ہفت آسماں مخواہ

عرفی کے اس شعر کا عکس غالب کے جس اُردو شعر میں نظر آتا ہے وہ عرفی کے شعر سے روشن تر ہے۔ غالب کا شعر ہے :

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہُنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دُشمن آسماں اپنا

عرفی کے دونوں مصرعے سپاٹ ہیں جن میں تہ داری یا گہرائی نہیں جب کہ غالب کا پہلا مصرع ہی آسمان کی بلندیوں کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اسی طرح عرفی کے دوسرے مصرعے میں آسماں کی دشمنی کا خدشہ ہی ظاہر کیا گیا ہے جب کہ غالب کے ہاں آسمان دُشمن ہو بھی چکا۔

غرض اس گفتگو کو یہ کہہ کر ختم کیا جا سکتا ہے کہ ضروری نہیں کہ اعلا پایے کی تدوین آپ کے سامنے صرف خشک اور بے مزہ موضوعات کا انبار ہی لگاتی ہو۔ وہ مذاقِ ادب کے نئے دبستان بھی کھولتی ہے۔

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

غالبیات کو امتیاز علی خاں عرشی کی دین

دیوانِ غالب اردو نسخۂ عرشی

دیوانِ غالب اُردو، نسخۂ عرشی، جو انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ نے ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا، امتیاز علی خاں عرشی کا وہ کارنامہ ہے، جس کی وجہ سے اُن کا نام ہمیشہ ادب اور احترام سے لیا جائے گا۔

غالب کا متداول اور غیر متداول کلام مفتی محمد انوار الحق نے اس صدی کے تیسرے دہے کے ابتدائی برسوں میں مرتب کیا۔ نسخۂ حمیدیہ میں متداول کلام کے علاوہ نسخۂ بھوپال کا سارا کلام بھی ہے، دوسرے ماخذوں میں فراہم اشعار بھی انھوں نے شامل کیے۔ مثال کے طور پر حسرت موہانی نے دیوانِ غالب میں جن اشعار کا اضافہ کیا، یا مطبع نظامی بدایونی کی طبع ثانی میں جو اشعار ہیں، وہ بھی نسخۂ حمیدیہ میں شامل کیے گئے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ڈاکٹر عبداللطیف نے تاریخی ترتیب سے کلامِ غالب شائع کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام ادھورا ہی رہا۔ محمد اکرام نے غالب نامہ اور ارمغانِ غالب میں ایسا کرنا چاہا، لیکن یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ مفتی محمد انوار الحق کا کام بنیادی ہے۔ اُس وقت غیر متداول کلام میں نسخۂ بھوپال

ہی مہیا تھا۔

امتیاز علی خاں عرشی نے نہ صرف نسخۂ بھوپال دیکھا تھا، بلکہ انھیں نسخۂ شیرانی کے بھی کچھ عکس فراہم تھے۔ پھر دوسرے مآخذ، جن میں خطوط، تذکرے، کتابیں اور رسائل ـــــ اور غالب کے انتخابات شامل ہیں، بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ عرشی کی دسترس میں یہ سب تھے۔ تفصیل نسخۂ عرشی کے اشاریے میں ہے۔

تدوینِ متن کے اصولوں کے لحاظ سے نسخۂ عرشی میں کئی محلِ نظر مقامات ہیں۔ مالک رام، عرشی کی طرح اس عہد کے مقتدر غالب شناسوں، اور مرتبینِ کلامِ غالب میں سے ہیں۔ اپنے مضمون "مخطوطات" میں لکھتے ہیں[1]:

"غالب کا دیوان اُن کی زندگی میں پانچ مرتبہ چھپا۔ ۱۸۴۱ء، ۱۸۴۷ء، ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۲ء، ۱۸۶۳ء۔ بادی النظر میں ۱۸۶۳ء[2] کا نسخہ اُن کی زندگی کا آخری متن ہے۔ اور ہمیں مندرجۂ صدر اصول کے مطابق اسی کو اپنے زیرِ ترتیب متن کے لیے اساس بنانا چاہیے لیکن یہ مغالطہ ہے۔ ۱۸۶۳ء کا نسخہ دراصل مبنی ہے ایک قلمی نسخے پر، جو غالب نے خود لکھوا کر، ۱۸۵۷ء میں نواب یوسف علی خاں والیِ رامپور کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ جب اس نسخے کی کتابت مکمل ہوگئی تو نواب ناظم کے پاس بھیجنے سے پہلے انھوں نے اُسے دیکھا، اور کہیں کہیں کچھ لفظی تبدیلی کر دی۔ یہ نسخہ کتاب خانہ رامپور میں محفوظ رہا۔ اور جب غالب ۱۸۶۰ء میں وہاں گئے، تو نواب نیّرِ رخشاں کی فرمائش پر، وہ اُن کے لیے اس کی نقل لیتے آئے۔ یہی نسخہ بعد کو شیونراین آرام نے اپنے مطبع مفید الخلائق آگرہ میں چھاپ کر، ۱۸۶۳ء میں شائع کیا۔ پس اگرچہ اشاعتی ترتیب میں یہ نسخہ غالب کی زندگی میں، سب سے آخر میں چھپا، متنی ترتیب میں یہ ۱۸۵۷ء

---

[1] آزادی کے بعد دہلی میں اُردو تحقیق۔ ص ص ۳۲۔۳۳۔ [2] سہوِ کتابت ۱۸۶۴ء لکھا گیا۔

میں رکھا جائے گا۔

۱۸۵۷ء میں، اس نسخے کی کتابت کے وقت غالب نے متن میں جو تبدیلیاں کی تھیں، اصولاً غالب کو چاہیے تھا، کہ اُنھیں اپنے کلام میں داخل کر لیتے۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں کیا۔ اس کے بعد دیوان مطبعِ احمدی دہلی سے ۱۸۶۱ء میں چھپا۔ انھوں نے اس نسخے کی کاپی خود دیکھی تھی، لیکن انھوں نے ۱۸۵۷ء والی تبدیلیاں اس میں شامل نہیں کیں۔ پھر اسی مطبعِ احمدی والے مطبوعہ نسخے پر، انھوں نے نظرِ ثانی کی، اس کی اغلاط درست کیں، اور اس مسوّدے کو چھپنے کے لیے مطبعِ نظامی کانپور میں بھیج دیا۔ یہ نسخہ ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔ پس غالب کی زندگی کا آخری نسخہ ۱۸۶۲ء کا ہے (نہ کہ آگرے والا، ۱۸۶۳ء کا مطبوعہ یا اُس کی اصل، ۱۸۵۷ء والا خطّی نسخہ)۔ اگر آج ہم غالب کا دیوان مرتب کرنا چاہیں، تو ہمیں اِسی مطبعِ نظامی کانپور والے نسخے کو اساس قرار دینا ہوگا۔

میں نے اس پر نسبتہً تفصیل سے اس لیے بحث کی ہے، کیونکہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اپنے مرتبہ دیوانِ غالب (نسخۂ عرشی) کی اساس ۱۸۵۷ء کے قلمی نسخے کو قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء والے نسخے کی تبدیلیاں (اصلاحیں) اتنی اہم ہیں، کہ ہم اسے بالکل نیا نسخہ قرار دینے میں حق بجانب ہیں"۔

مالک رام کا نقطۂ نظر یہ ہے:

"ہمیں اِن تبدیلیوں کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اِس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ ان اصلاحوں کو، دیوان کے بعد کے نسخوں (مطبع احمدی ۱۸۶۱ء) میں شامل نہ کر کے، غالب نے انھیں عملاً رد کر دیا۔ اگر وہ ان تبدیلیوں کو اپنے کلام کا مستقل جزو سمجھتے، تو انھیں اس خطّی نسخے سے بعد کی اشاعتوں میں شامل کر لیتے۔ یہ انھوں نے نہیں کیا، گویا انھوں نے اپنے عمل سے ثابت

کردیا کہ یہ تبدیلیاں، وقتی طور پر اُن کے خیال میں آئی تھیں — ان کی
کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔"

مالک رام کے اِس خیال سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ نسخۂ رامپور کو آج متداول دیوان کی تدوین کے لیے بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ لیکن اُن کے استدلال سے اتفاق کرنا بھی ممکن نہیں۔ تدوینِ متن کے آئین پر کٹر یا میکانکی طریقے سے عمل کیا جائے تو کچھ اچھے نتائج سامنے نہیں آتے۔ نسخۂ رامپور یا نسخۂ رامپور جدید، دوسرے نسخوں کی طرح، جن میں نسخۂ لاہور اور نسخۂ خواجہ بھی شامل ہیں — درمیان کے نسخے ہیں، اور انھیں اختلافِ نسخ کی نشاندہی کے لیے ہی استعمال کیا جاسکتا ہے، کہ متن کے اِن اختلافات سے غالبؔ کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں بھی مدد مل سکتی ہے — اگر ایسا کوئی مطالعہ کیا جائے۔

جس نسخے کو اساس قرار دیا جاتا ہے، اُسی کی قرأت متن میں درج کی جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس اصول پر، غالبؔ کے مرتبین نے عمل نہیں کیا۔ مثال کے طور پر یہ شعر ؎

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

مطبعِ نظامی کانپور والے دیوان میں پہلے مصرع کا آخری لفظ تھکے ہے۔ مالک رام اور عرشی کے نسخوں میں تھکے کی جگہ تھمے ہے۔ اپنی پسند کے مطابق، آخری قرأت کے برخلاف، کوئی پچھلی قرأت چُن لینا تدوین کے اصول کے منافی ہے۔ یہ طریقہ مصنّف کی اصلاحوں کو کالعدم قرار دیتا ہے۔

شیو نراین آرام نے مطبعِ مفید الخلائق، آگرہ سے جو دیوان چھاپا، اس کی بنیاد نسخۂ رامپور جدید ہے جس کی نقل غالبؔ نے ضیاء الدین خاں نیّر و رخشاں کے لیے کرائی تھی۔ مالک رام نے متنی ترتیب میں اسے ۱۸۵۰ء میں رکھا ہے۔ اسے وسط ۱۸۶۰ء میں رکھنا چاہیے۔ یہ دیوان چھپنے کے لیے جب شیو نراین کو غالبؔ نے بھیجا تو لکھا:

"میں تمھارا گناہ گار ہوں۔ تمھاری کتاب مَیں نے دبا رکھی ہے۔ بڑی

کوشش اور محنت سے، اس کو وہاں[1] نہ چھپنے دیا، اور منگوا لیا۔ آج پیر کے دن، پچیس جون کو پارسل کی ڈاک میں روانہ کیا ہے...![2]"

۳ جولائی ۱۹۶۰ء کے خط میں شیو نراین کو ایک خط کے جواب میں غالبؔ نے لکھا:

"تمھاری باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان جو مَیں نے تم کو بھیجا ہے۔ اتم و اکمل ہے۔ وہ اور کون سی دو چار غزلیں ہیں، جو مرزا یوسف علی خاں عزیزؔ کے پاس ہیں، اور اس دیوان میں نہیں۔ اس طرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں..."

دیوانِ غالبؔ کا تیسرا ایڈیشن جولائی۔ اگست ۱۹۶۱ء میں مطبعِ احمدی کے مالک محمد حسین خاں تحسینؔ نے چھاپا تھا۔ اسے دیکھ کر غالبؔ کو سخت مایوسی ہوئی۔ دو رات دن — جی ہاں، صرف دو رات دن کی محنت میں غالبؔ نے اس کی تصحیح کی، اور پھر یہی اگلے برس مطبعِ نظامی کانپور میں چھپا۔ ۱۹۶۱ء کے ایڈیشن کے مقابلے میں اس میں صرف چھ شعر زیادہ ہیں۔ دو رات دن کی محنت میں، کسو کو (جہاں قافیہ نہ ہو) کسی کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ اسلوبِ کتابت میں ایک اہم تبدیلی ہے۔ اک اور ایک، کے لکھنے میں فرق نہیں کیا جاتا تھا، کیونکہ اعراب بالحروف لکھے جاتے تھے۔ کسرہ کی علامت بھی ےی تھی۔ مطبعِ نظامی کانپور کے ایڈیشن سے یہ واضح ہو گیا کہ غالبؔ نے کہاں اک اور کہاں ایک نظم کیا ہے۔ ان مقامات پر بھی، جہاں اگلے لفظ کے الف موصول کی وجہ سے ایک بھی وزن میں رہتا ہے، غالبؔ نے کہیں کہیں اک رکھا تھا — اِس بات کا لحاظ دیوانِ غالبؔ کے کسی نسخے میں نہیں رکھا گیا ہے[3]۔ یہاں تک کہ نسخۂ عرشی میں ص ۱۷۵ پر ایک مشہور غزل کا مطلع یوں لکھا ہے:

آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

---

[1] یعنی میرٹھ میں۔
[2] غالبؔ کی تحریر میں یہ خط فراہم ہے عکس ص ۸۲۰ اپر غالب کے خطوط (غالب انسٹی ٹیوٹ) جلد سوم میں دیکھا جائے۔
[3] زیادہ تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں۔ "غالب کے کچھ شعروں کا متن" (سہ ماہی اردو ادب، شمارہ ۱ و ۲: ۱۹۹۱ء)۔

نسخۂ رامپور جدید کی کتابت کا زمانہ ۱۸۵۴ء/۱۸۵۵ء ہے۔ اُس وقت اعراب بالحروف کا رواج تھا۔ غالؔب نے اک نظم کیا تھا، جو یائے کسرہ کے ساتھ ایک لکھا گیا۔ امتیاز علی خاں عرؔشی جیسے بلند مرتبہ عالم سے یہ تسامح اسی وجہ سے ہوا کہ انھوں نے یائے کسرہ کو معروف پڑھا، اور اُسی طرح ایک نقل کرادیا۔ اختلافِ نسخ کے باب میں اک بھی کچھ نسخوں میں دکھایا گیا ہے، لیکن اپنے نسخے کے لیے انھوں نے آج کے اسلوب میں ایک رکھا۔

اس نوعیت کی اور غلطیاں بھی اُن سے اور دوسرے مرتّبین سے ہوئی ہیں، جن کی نشاندہی "رموزِ غالب" میں کی گئی ہے۔ اس کا ایک باب جنوری ۱۹۷۳ء میں سرینگر (کشمیر) کے مجلّے "علم و دانش" میں شائع ہوا تھا۔

نسخۂ عرشی کی ساخت میں، جہاں تک متن کا تعلق ہے، کچھ بنیادی خامیاں ہیں، اور اِس وجہ سے نہیں جیسا کہ مالک رام نے نشاندہی کی ہے، انھوں نے مطبعِ نظامی کانپور کے نسخے کو نہیں، نسخۂ رامپور جدید کو اساسی متن کے لیے استعمال کیا ہے۔ اگر انھوں نے اسی کی پابندی، اور سختی سے پابندی کی ہوتی، تو نسخۂ عرشی کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی۔ دوسری بات، جو قاعدے کے مطابق نہیں ہے، انھوں نے ہر جگہ نسخۂ شیرانی کی قرأت کو نسخۂ بھوپال پر ترجیح نہیں دی ہے۔ تدوینِ متن کا اصول یہ نہیں ہوتا کہ کون سا مصرع مرتّبِ نسخہ کو اچھا لگتا ہے۔ اصول یہ ہے کہ شاعر نے کس مصرع کو آخری قرأت قرار دیا ہے۔ اور "آخری قرأت کیا ہے" یہ بات ہر جگہ اس بنیاد پر طے نہیں ہو سکتی، کہ مصنّف کی زندگی میں مرتّب کیے جانے والے آخری نسخے میں کیا ہے۔ آخری قرأت طے کرنے کے لیے غالؔب کے سلسلے میں کچھ اور عناصر کو بھی نظر میں رکھنا پڑے گا۔

متداول نسخوں میں ایک شعر یوں ہے :

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

شیونراین والے دیوان میں شعر یوں ہے :

ہے زلزلہ و صرصر و سیلاب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

امّو جان (مطبعِ احمدی) والے ایڈیشن میں دو رات دن میں غالؔب نے اغلاط درست کی تھیں۔ چھ شعروں کے اضافے کے علاوہ توجہ اسلوبِ املا پر تھی، کلام پر نظرِ ثانی نہیں کی تھی۔ یہ کام غالؔب نے اس نسخے پر کیا تھا جو شیونراین کو بھیجا تھا۔ سب سے اہم مثال اس کی وہ شعر ہے، جس کے بارے میں عرض کیا گیا ہے۔ دوسرا مصرع ان عناصر سے بامعنی ہوتا ہے، جو آتے ہیں، اور آتے ہی چلے جاتے ہیں۔ زلزلہ، صرصر اور سیلاب اچانک آتے ہیں، اور فوراً چلے جاتے ہیں۔ یہ بات صاعقہ، شعلہ اور سیماب کے بارے میں درست نہیں۔ سیماب تو خاص طور سے برائے وزنِ شعر ہے۔ مالک رام کا نظریہ درست ہے کہ اساسی متن مطبعِ نظامی کانپور کے ایڈیشن ہی کا ہوگا۔ اس سے اسلوبِ املا بھی معیّن ہوتا ہے۔ لیکن جس شعر کے بارے میں عرض کیا گیا ہے، وہ متن میں شیونرائن والے ایڈیشن کے مطابق مرجّح قرأت ہے۔

نسخۂ عرشی کی چند خامیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس سے امتیاز علی خاں عرؔشی کے وقیع کام کی اہمیت پر حرف نہیں آتا۔ اُن کا بڑا کارنامہ غالؔب کے بارے میں اُن تمام اہم معلومات کو جمع کر دینا ہے، جو بکھری ہوئی تھیں۔ یہ ساری معلومات، مرتّب طریقے سے دیباچہ، شرحِ غالب، اختلافِ نسخ اور اشاریے میں موجود ہیں۔ ان میں اضافہ تو ہو سکتا ہے، لیکن زیادہ نہیں۔ اس نوعیت کا مربوط کام اور نہیں کیا گیا۔ اور یہ ایسا کارنامہ ہے جسے حالؔی کی کتاب "یادگارِ غالب" کی طرح حوالے اور ماخذ کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

مجھے بڑی خوشی ہوتی اگر امتیاز علی خاں عرؔشی کے تبحّرِ علمی کو خراجِ تحسین اور اُن کی ذاتِ بابرکات سے اپنی پُرخلوص عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے یہاں پر خاتمۂ کلام ہوتا۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ بات یہاں سے شروع ہوتی ہے، وہ بات، جو محسوس تو اور بھی کرتے ہیں، لیکن اِس کے اظہار سے احتراز کرتے ہیں، اس خیال سے کہ مبادا اس سے عرؔشی کے سے بلند پایہ محقق اور عالم کی فضیلت پر آنچ آئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ اندیشہ بلاوجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی ادبی دیانت پر جو گہن لگ گیا ہے، وہ چھٹ جائے گا، اور جو نادرست انتسابات اُن سے ہوئے ہیں، اُن کو منسوخ سمجھا جائے گا۔

غالؔب کا انتقال ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو ہوا تھا۔ سویں برسی بہت بڑے پیمانے پر منائی

کا اہتمام کیا گیا۔ یہ بات حسنِ اتفاق سے کچھ زیادہ ہے کہ امروہہ کے پرانی کتابوں کے ایک تاجر نے دیوانِ غالب بخطِ غالب کا ایک مخطوطہ گیارہ روپے میں بھوپال کے ایک کتاب فروش سے خریدا، جس نے بقیدِ ہوش و حواس غالبؔ کا خود نوشت دیوان، خود نوشت دیوان کہہ کر ہی گیارہ روپے میں بیچا۔

مالک رام نے "گفتارِ غالبؔ" میں جو کہانی ص ۱۴۰ اور اگلے صفحات پر بیان کی ہے، وہ وہی ہے۔ جو انھیں بتائی گئی، انھوں نے اپنے طور پر پروفیسر عبدالقوی دسنوی، صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج بھوپال سے بھی دریافت کیا، اور نسخے کا سراغ غالبؔ کے ایک شاگرد یار محمد خاں شوکتؔ بھوپالی تک پہنچا۔ اُن کے ایک وارث کی کنیز نے ردّی کاغذات کے ساتھ اسے بھی کباڑی کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس مخطوطے کا ذکر اُس خاندان کی کسی دستاویز میں نہیں، اور نہ کبھی کسی نے یہ بیاض اس گھرانے میں دیکھی۔ نسخۂ بھوپال کے کلام میں مروّجہ دیوان کا کلام ملا کر مفتی محمد انوار الحق نے نسخۂ حمیدیہ مرتب کیا۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے متداول کلام پر جو مقالہ لکھا تھا، وہ نسخۂ حمیدیہ میں شامل کیا گیا، اور بعد میں "محاسنِ کلامِ غالبؔ" کے نام سے شائع کیا گیا، جس کی بڑی دھوم ہوئی۔ تب بھی اس بیاض کے مالکوں کو خیال نہیں آیا کہ اُن کے خزانے میں ایک دُرِّ نایاب ہے۔ اور یہ یار محمد خاں شوکتؔ تھے کون؟ فوجدار محمد خاں کے بیٹے۔ وہ فوجدار محمد خان جن کے کتاب خانے کا قلمی نسخہ نسخۂ بھوپال کہلایا۔ اگر ۱۲۳۱ ہجری کا بتایا جانے والا نسخہ شوکتؔ کی ملکیت ہوتا تو فوجدار محمد خاں کے کتاب خانے میں اس کا بھی الحاق کیا جاتا، اور نسخۂ بھوپال کے ساتھ رکھا جاتا۔

خود میں کئی بار بھوپال گیا، اور معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ ایک شہادت بھی — ایک شہادت بھی ایسی نہیں کہ جس سے ثابت ہو کہ یہی بیاض یار محمد خاں شوکتؔ بھوپالی کے گھنے میں تھی۔ امروہہ کے کتاب فروش نے یہی بیاض PLANT کرا کے "خریدی"۔ یا کچھ اور خریدا، اور بتایا کہ یہ بیاض خریدی گئی —— اس کے بارے میں بھوپال کے ثقہ محقق کوئی بات عین الیقین کے صیغے میں کہنے سے قاصر ہیں۔

مالک رام کے الفاظ میں:

"مول تول کے بعد... نے یہ گنج گرانمایہ اُن سے گیارہ روپے میں ہتیالیا،

اور اُسے لے کر دلّی روانہ ہو گئے۔ اگلے ہی دن انھوں نے یہاں کے روزنامہ الجمعیتہ کے ۷ اپریل ۱۹۶۹ء کے شمارے میں اشتہار دے دیا کہ میرے پاس خود غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قلمی دیوان موجود ہے، جس کی قیمت چھ ہزار روپے ہے؛ ہے کوئی خریدار؟"

جیسا کہ عرض کیا گیا، مالک رام نے اپنے الفاظ میں وہ کہانی بیان کی ہے، جو انھیں بتائی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۵ فروری ۱۹۶۹ء سے پہلے یہ بیاض، امروہہ کے کتاب فروش، فروخت کرنے کے لیے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لائبریرین، سید بشیر الدین کے پاس لے جا چکے تھے۔ سیّد بشیر الدین کو اس کے کھرے مال ہونے پر شک تھا۔ میں فروری کے شروع میں علی گڑھ گیا، تو اُن کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ اور باتوں کے علاوہ انھوں نے یہ قصہ بھی سنایا۔ بعد میں جب "بیاضِ غالب: تحقیقی جائزہ" شائع ہوئی۔ اس کے بارے میں انھوں نے اپنے تاثرات لکھ کر بھیجے۔ تو اس کے بارے میں بھی لکھا۔

It was way back in 1961 that I met Mr.Kamal Ahmad Siddiqi when he visited the Muslim University Libray. He was alrmady known as a poet then but a poet with a difference -a progressive, modernist and traditionalist poet all rolled into one. While believing in the continuity of the cultural processes he stood against values which hindered social progress.

After the publication of his collection of poems called Badban he joined the group of writers who gave direction to the progressive movement in Urdu. He was in Kashmir from early 1950 to 1972.

Mr.Siddiqi visited Aligarh for the second time in 1969 during the Ghalib Centenary ~~year~~ celebrations in order to consult our collection of Ghalib manuscripts in connection with the publication by him of a Diwan of his poems. We had an opportunity on this occasion to discuss and exchange views on ~~the~~ various kindred problems. In the meanwhile a bayaz supposed to be in Ghalib's own hand appeared on the horizon and brought to me for sale. On examining a few of its bibliigraphical details such as paper, ink and the style of writing I doubted the genuineness of the claim of its being handwritten by Ghalib. I ,therefore ,suggested to the man who brought it that he shoul. take the manucript to the Archives in Delhi and obtain a certificate of authenticy of his claim. The last I knew about it was a spate of opinions by experts supporting the claim of the dealer.

Later on, when I joined the University of Kashmir ,

I came into closer contact with Mr.Siddiqi who was then Producer for the University and incharge of programmes for youth at the Radio Kashmir in Srinagar, a position which gave him the opportunity of playing a significant role in academic life and the youth movement in the valley. During our frequent visits to his house-the late Professor Abdul Kadir Sarwari, Prof. M.Hasan[1] and myself found Mr.Kamal working seated on the floor surrounded by piles of books and magnifying glasses, on photostat copy of the very same Ghalib's manuscript whose genuineness doubt regarded it a hoax. As he proceeded with his research he disproved anomalies in the photostat copy which he pointed out to Prof. Sarwari convicing him of his contention that it was fake. Unfortunately, how ever, Mr.Siddiqi did not have material to help him in his work and it is here that I cam to his rescue by supplying him with what he needed. I have seen few researchers in my long experience of academic life who possessed the determination, the tenacity and the capacity for dedicated hard work as I found in young Kamal. The undertaking was love's labour which he accomplished with a degree of intellectual integrity rarely come across these days of commercialised research. The publication is a significant contribution to Ghalibiana if I am allowed to coin such a term. It invites the specialists in the field to assess its value and give their verdict thus adding to the existing store of knowledte on that great genius in Urdu literature. I would like to see more such contribution by him to the extension of our knowledge in this field.

S.Bashiruddin
(S.Bashiruddin)
Ex-Librarian,
Aligarh Muslim University
Rajasthan University
Delhi University
Kashmir University and
Prof of Library Science
28 [illegible]

Mr.Kamal Ahmad Siddiqi
Dy.Chief Producer
129, Akashvani Bhawan, Parliament St.
NEW DELHI

جس زمانے میں "بیاضِ غالب: تحقیقی جائزہ" لکھی گئی، ایس اے ترمذی کشمیر گزیٹیر کے ڈائرکٹر اور چیف ایڈیٹر تھے۔ نیشنل آرکائوز سے اُن کی خدمات حکومتِ کشمیر نے مستعار لی تھیں، اور واپس آکر وہ نیشنل آرکائوز کے ڈائرکٹر ہوئے اور اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ ترمذی نے بتایا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری، فخرالدین علی احمد، یہ بیاض "ایوانِ غالب" کے لیے خریدنا چاہتے تھے، اگر اس کے بخطِ غالب ہونے کی تصدیق نیشنل آرکائوز کر دے۔ فخرالدین علی احمد مرکزی وزیر تھے۔ انھوں نے تو ترمذی پر دباؤ نہیں ڈالا، لیکن اُن کے قریب کے جو حلقے تھے انھوں نے چاہا کہ آرکائوز

۱۔ پروفیسر محب الحسن (صدر شعبۂ تاریخ، کشمیر یونیورسٹی)

اس کے بخطِ غالب اور عہدِ غالب کے ہونے کی تصدیق کر دیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ "بیاض" باقاعدہ فارم بھر کر نیشنل آرکائوز میں بھیج دی جائے، تاکہ اُس کے مستند ہونے نہ ہونے کے بارے میں فیصلہ کیا جا سکے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ نیشنل آرکائوز سے رجوع نہیں کیا گیا۔ سیّد بشیرالدین اور ترمذی کے مشوروں کے باوجود۔ اس سے مناسب نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

پروفیسر آصف فیضی (جن کے نام نسخۂ عرشی معنون کیا گیا)، پروفیسر نورالحسن ہاشمی، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر انور سدید، محمد علی صدیقی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر سیّد بشیرالدین نے بیاضِ غالب: تحقیقی جائزہ پڑھنے کے بعد یہ قولِ فیصل دیا کہ جو بیاض "بخطِ غالب" بتائی جاتی ہے، وہ کھرا مال نہیں ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ اور کچھ دوسرے ذی علم محققوں نے بھی آزادانہ طور پر یہی رائے قائم کی۔ نجی خطوں میں پروفیسر سید محمد عقیل، پروفیسر ہاشم علی نے بھی ایسی ہی بات لکھی ہے۔

اس عہد کے دو مقتدر غالب شناسوں، یعنی مالک رام اور پروفیسر گیان چند نے اس دستاویز کو بخطِ غالب مانا ہے۔ جن غالب شناسوں نے خاموشی اختیار کی، اُن میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر مختار الدین احمد آرزو شامل ہیں۔ قاضی عبدالودود ۱۹۷۳ء کے شروع میں دلّی آئے، اور ولنگڈن کریسنٹ میں فخرالدین علی احمد کے یہاں قیام پذیر تھے۔ مجھے بلوایا گیا۔ تحقیقی جائزہ اُن کی خدمت میں پیش کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ "میں اس قضیے پر فیصلہ ضرور دوں گا، چاہے جس کے حق میں ہو چاہے جس کے خلاف ہو۔"

ڈیڑھ دو مہینے کے بعد پھر آئے، اور کہلوایا کہ کتاب کہیں گم ہو گئی ہے۔ ایک جلد اور بھجوا دو۔ ایک جلد اور پیش کی گئی ___ اور پھر انھوں نے اس قضیے پر فیصلہ دینے کی بات کہی۔ لیکن اس قضیے پر انھوں نے فیصلہ نہیں دیا۔

امتیاز علی خاں عرشی اس بیاض کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے، اس کے بارے میں کوئی بات وثوق سے کہنا مشکل ہے۔ عرشی کے مضامین جو اس موضوع پر

شائع ہوئے، کیا واقعی وہ عرشی نے لکھے یا لکھوائے تھے؟ یہ بات شبہے سے بالاتر نہیں ہے۔ ۱۹۷۰ء میں، جب تحقیقی جائزہ پر کام ہو رہا تھا، عرشی کی ایک عزیز نے، اِس کے بارے میں ایک ایسی بات کہی، جو دھیان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

کئی برس ہوئے "گفتارِ غالب" پڑھنے کے بعد میں نے ایک خط مالک رام کو لکھا تھا۔ یہ خط ایک اہم دستاویز ہے، کیونکہ اس کے حاشیے پر مکتوب الیہ نے کہیں کہیں یادداشتیں لکھیں اور دستخط کیے۔ اس خط کے پہلے مسودے پر رامپور کے ذکی اللہ خاں نے ایک ایسی بات کی تصدیق کی ہے، جو اُن کی اہلیہ نے اپنے عزیز اور بزرگ امتیاز علی خاں عرشی کے بارے میں ۱۹۷۰ء میں بتائی تھی۔

چند برس ہوئے، انجمن ترقی اُردو (ہند) نے ایک کتاب لکھنے کی خدمت میرے سپرد کی۔ "غالب کے نقاد: عہدِ غالب سے عصرِ حاضر تک" اس میں ایک باب غالب کے مرتبین پر بھی لکھنا تھا۔ دل میں یہ کانٹا بہت دنوں سے کھٹک رہا تھا کہ وہ نسخہ، جس میں آسد میر امانی کی ایک غزل، غالب کے کلام کے طور پر شامل ہے۔ وہ نسخہ جس کے ترقیمے میں سنہ کی علامت لکھنے کے باوجود سنہ نہیں لکھا گیا۔ وہ نسخہ جس میں ترکہ نادرست درج ہے، حالانکہ یہ غلطی پچھلی صدی کی پہلی اور دوسری دہائی میں کسی کاتب یا شاعر سے نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ نسخہ جس میں ترکہ صرف چند اوراق پر ہے۔ وہ نسخہ جس کا سنہِ کتابت ۱۲۳۱ ہجری طے کر دیا گیا، لیکن جس میں تقریباً سو مصرعے ایسے ہیں، جن کی قرأت، ۱۲۳۷ ہجری کے نسخہ بھوپال کی نہیں، بلکہ اِس نسخے کی وہ اصلاحی قرأت جو ۱۲۴۲ ہجری کے نسخے (نسخۂ شیرانی) میں لکھی گئی۔ وہ نسخہ جس میں بیدل کے مصرع "عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ" کو غالب کا مصرع سمجھ کر مخطوطہ نویسوں / نویس نے اس کی ابتدائی قرأت میں دارد کی جگہ باشد لکھ دیا۔ وہ نسخہ، جس میں غالب کے خط میں دکانی کو دوکانی لکھوایا گیا، ایک زائد واو کے ساتھ! وہ نسخہ جس میں کثرت کے بجائے کسرت ہے! وہ نسخہ جس میں ہر جگہ دو ملا کر ہ اور ذو ملا کر ہ لکھا گیا۔ حالانکہ غالب ایک ہی خط میں دو الگ الگ اور ملا کر دو، ذ دونوں طرح لکھتے تھے۔ وہ نسخہ، جس میں نو دریافت کلام تو بڑی مقدار میں ہے، لیکن اُن زمینوں میں کلام نہیں، جن میں اشعار

تذکروں کے ترجموں میں ہیں۔ وہ نسخہ جس میں دو شعر ایسے ہیں جن کے مصرعوں کا خلط ہو گیا، اور جو مختلف قطعوں کے قلموں سے تصحیح اور اصلاحوں کے باوجود ٹھیک نہیں کیے گئے۔ ترکے کی غلطی بھی درست نہیں کی گئی ——— اُس نسخے کا کلام امتیاز علی خاں عرشی نے نسخۂ عرشی کے دوسرے ایڈیشن کے متن میں شامل کر کے، اس کو کھرا مال تسلیم کر لیا۔

انجمن کے لیے کتاب لکھتے وقت نسخۂ عرشی کے نقشِ ثانی کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ نقشِ اوّل کے مقابلے میں، اس میں بنیادی تبدیلی کر دی گئی تھی۔ پہلے ایڈیشن میں بھی "یادگارِ نالہ" کے تحت، وہ سارا کلام رکھ دیا گیا تھا، جو کسی بھی ماخذ میں غالب سے منسوب تھا۔ چنانچہ وہ کلام جو عبدالباری آسی الدنی نے نام نہاد بیدلی رنگ میں تصنیف کیا تھا، اور ایک صاحب ڈاکٹر عظمت الٰہی کی ناپید بیاض سے برآمد کیا تھا، "یادگارِ نالہ" کے باب میں رکھ دیا گیا۔ حالانکہ اسی حصے میں "یادگارِ غالب" سے مثنوی "ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی..." اور "اُردوئے معلّیٰ" سے قطعہ "بسکہ فعّال ما یرید ہے آج" بھی ہیں۔ وہ سہرا بھی ہے، جو لال قلعہ میں ذوق سے چشمک کا باعث بنا۔ بیاضِ علائی، اور تذکروں میں غالب کے ترجموں میں درج وہ اشعار بھی ہیں، جو دیوان میں نہیں۔ اس حصے میں وہ غزل بھی ہے جو اپریل فول کا تحفہ ہے، اور مقطعے میں غالب کے مزید دو دن بھوپال میں قیام کا ذکر ہے! اسی حصے میں ص ۳۱۰ پر یہ شعر ہے:

دل آپ کا، کہ دل میں ہے جو کچھ، سب آپ کا
دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکال کے!

نسخۂ عرشی کی اشاعت کے آٹھ برس بعد عرشی نے اس شعر کو کلام غالب کی حیثیت سے رد کرنے کے بارے میں لکھا، اور بتایا کہ یہ شعر آمیر مینائی کا ہے۔ "بھوپال میں مزید دو دن قیام" والی غزل کو نکال دینے کی ہدایت غلط نامے ہی میں ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مضمون "بنیادی نسخہ"[۱] میں الحاقی متون کے سلسلے میں ایک مثال دی ہے:

---

[۱] آزادی کے بعد دہلی میں اُردو تحقیق (اُردو اکادمی، دہلی)، ص ۸۷

"..... کبھی کاتب جان بوجھ کر بعض مصلحتوں سے کچھ اضافے کرتا ہے۔
سراج الدین خان آرزو کے تذکرے مجمع النفائس کے کسی نسخے میں میر تقی میر
کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ رضا لائبریری رامپور میں مجمع النفائس کا جو نسخہ ہے،
اُس میں میر کا ترجمہ شامل ہے۔ اس میں عبارت یہ ہے :

• میر تقی المتخلص بہ میر، مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد است ..... در ابتدائے
مشق شعر، رتبۂ سخن را بہ پایۂ اشتہار سانیدہ [1] •

میں نے جب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی سے اس عبارت کا ذکر
کیا، تو انھوں نے نسخہ اور یہ عبارت ملاحظہ فرما کر مجھے بتایا کہ میر نے کسی راجہ
کو پیش کرنے کے لیے یہ نسخہ تیار کرایا تھا۔ قرائن اس حق میں ہیں کہ انھوں
نے اس عبارت کا خود اضافہ کیا ہے۔"

نسخۂ عرشی کا دوسرا ایڈیشن دیکھ کر ذہن پھر اس طرف گیا، جب میں بیاضِ غالب: تحقیقی
جائزہ پر کام کر رہا تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر سید بشیر الدین ملنے آئے تھے۔
ریجنل انجینئرنگ کالج سرینگر میں ڈین آف اسٹوڈنٹس، ذکی اللہ خاں اور بیگم ذکی بھی آ گئے۔
دونوں کا وطن رامپور ہے۔ مالک رام کے نام جو خط لکھا تھا، اس کے مسودے کے حاشیے
پر ذکی اللہ خاں نے تصدیق کی ہے :

(ن)
میرے لیے بڑی مشکل تھی۔ عرشی صاحب کے لیے اور آپ کے لیے میرے
دل میں بڑا احترام تھا، اور ہے، حالانکہ میری ناقص رائے میں آپ دونوں
حضرات نے غالب کا کلام [illegible] میں [illegible] عرشی صاحب سے
ملاقات تو نہیں تھی لیکن ان کی ایک عزیزہ بھتیجی زہرہ بیگم اور ان کے شوہر
ذکی اللہ خاں ہمارے ان احباب کے زمرے میں ہیں، جو رشتہ داروں
سے بڑھ کر ہوتے ہیں۔ اس رشتے اور قرابت کے بارے میں مجھے اتفاق

[illegible]

[1] بحوالہ قیام الدین احمد، دیوانِ ضاحک، معاصر پٹنہ، جولائی ۱۹۶۲ء ص ۱۰۶

سے پہنچا ہو۔ سید بشیر الدین اور عبدالقادر سروری صاحب آئے ہوئے تھے،
اور "تحقیقی جائزہ" کا کام کتنا ہوا، اس کے بارے میں گفتگو
ہو رہی تھی۔ دونوں میرے بڑے کرم فرما تھے، اور [illegible]

بات پہنچ سے [illegible] ذکی اللہ خاں [illegible]

بشیر صاحب ہر وہ کتاب فراہم کر دیتے تھے، جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی۔ اتنے میں
ذکی اللہ خاں، ان کی بیگم اور بچے آ گئے۔ [illegible] کہا: "کمال ہے!
یہ تو سب جانتے ہیں کہ آپ پڑھتے بہت ہیں، لیکن یہ اتنی ڈھیر سی کتابیں؟
اور یہ نسخۂ عرشی زادہ؟" میں نے کہا: "غالب [illegible]
تبصرہ لکھ رہا ہوں۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ عرشی صاحب جیسے
عالم نے ایک [illegible] کھوٹے مخطوطے کو کھرا سمجھ کر سند دی ہے۔"
خاں صاحب مسکرانے لگے، اور اپنی پیالی [illegible] "بیٹا، باپ ...
[illegible] رہا ہے۔" ان کی بیگم (زہرہ) نے کہا: "عرشی صاحب
میرے قریبی رشتے کے چچا ہیں۔ ان کو خبر بھی نہیں کہ ان کے نام سے
کیا کیا چھپ رہا ہے۔ وہ تو ستر برس کے ہو رہے ہیں۔" میں نے کہا
"اچھا! یہ تو بڑی مشکل ہو گئی۔ آپ کی عزیزداری نکل آئی۔ اب میں
کیسے لکھوں؟" ذکی اللہ نے کہا: [illegible]
آپ لکھیے۔ [illegible] اپنا کام کر دیں۔"

ذکی اللہ [illegible]

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری نے جب کئی بار یاد دہانی کرائی، کہ کتاب
"غالب کے ناقدین" کا مسودہ طباعت کے لیے پیش کروں، تو میں نے انھیں لکھا کہ امتیاز علی خاں
عرشی اس عہد کے اہم ترین مرتبینِ کلامِ غالب میں سے ہیں۔ دوسرے ایڈیشن کا مسودہ دیکھے بغیر
میں اُن کے بارے نہ لکھ سکوں گا۔ اس لیے مسودہ مجھے دکھایا جائے۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی

[illegible] ذکی اللہ [illegible]

ہے کہ جنوری ۱۹۷۹ء میں جب میں اورنگ آباد گیا تھا، تو سکندر علی وجد نے خاص طور سے دوسرے ایڈیشن کے بارے میں بتایا کہ وہ اس بات سے خوش نہیں ہیں کہ ایک جعلی بیاض میں موجود کلام غالب سے منسوب کیا گیا ہے۔ تحقیقی جائزہ میں پیش کیے گئے استدلال سے وہ متفق تھے۔ انھوں نے کہا کہ ایک شاعر کی حیثیت سے ہی نہیں، ایک ایسے شخص کی حیثیت سے بھی، جو جج رہ چکا ہے، وہ اُن شہادتوں کو دُرست مانتے ہیں، جو اس بیاض کو جعلی ثابت کرنے کے لیے پیش کی گئی ہیں۔ وجد اس بات پر بھی ناخوش تھے کہ انجمن نے امتیاز علی خاں عرشی کو اس بات کی اجازت دی کہ جعلی کلام غالب سے منسوب کریں۔ وجد نے یہ بتایا کہ انجمن کی مجلس کے جلسے میں انھوں نے واضح الفاظ میں اپنا موقف بیان کر دیا تھا۔

انجمن کے جنرل سکریٹری نے اس بات کی نہ تردید کی اور نہ تائید، جو سکندر علی وجد نے بتائی تھی۔ البتہ ۱۹ مئی ۱۹۸۸ء کو انھوں نے دوسرے ایڈیشن کے مسوّدے کے سلسلے میں ایک خط لکھا۔ کسی تبصرے کے بغیر خط کا عکس پیش ہے:

مکرمی

نسخۂ امروہہ کے سلسلے میں آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا۔

صورتِ حال یہ ہے کہ دیوانِ غالب نسخۂ عرشی کے پہلے اور دوسرے ایڈیشنوں کی طباعت رام پور میں ہوئی تھی۔ رام پور میں طباعت کی وجہ یہ تھی کہ وہاں علی گڑھ کے ایک پریس پبلک پرنٹنگ پریس نے نسخۂ عرشی کی طباعت کے لیے خصوصی ٹائپ کا انتظام کیا تھا۔ دوسرے ایڈیشن کی

طباعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی۔ میں نے عرشی صاحب کو بے شمار خطوط لکھے لیکن کسی خط کا جواب نہیں ملا۔ ایک دفعہ وہ طبی مشورے کے لیے دلّی آئے ہوئے تھے: میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب عرشی صاحب قبلہ نے شکایت کی کہ میں نے انھیں کوئی خط نہیں لکھا۔

میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ عرشی صاحب کی در اصل کوئی بات نہیں پہنچتی تھی اس لیے مجھے [illegible] رضا لائبریری کے اسٹاف میں سے کوئی شخص ان کی ڈاک کو روکتا تھا۔

نسخۂ عرشی میں، نسخۂ عرشی زادہ کے نام سے امروہہ کے نسخے کا بار بار ذکر آیا ہے۔ پہلی بار دیوان کا ذکر صفحہ ۱۵۱ پر اور دوسری بار صفحہ ۱۶۰ پر [illegible] صفحہ ۵۰۹ پر استدراک کیا ہے۔ جس کے

Thakurdwara
Rampur 244901
۱۴ دسمبر ۸۹ء

مکرمی تسلیم
نسخۂ عرشی نقشِ ثانی کے دو صحے ہیں اور دونوں حصوں پر الگ الگ
مرتب کرنے والوں کے نام موجود ہیں۔ ابا مرحوم اصل کتاب کے ذمہ دار ہیں
اور میں استدراک کا۔

یہ مسودہ محفوظ رہا نہ گیا۔ عام سے مصنفین اور ساری کتابوں کے
مسودے محفوظ رہ جاتے ہیں۔ کیا اقبال، حسرت، جوش، یکانہ
گرشن چندر، عصمت چغتائی کے مسودے محفوظ ہیں۔ بالعموم
محفوظ نہیں رکھے جاتے اور اگر محفوظ رکھنے کی مثالیں ہوں تو خال
خال۔
مزید کچھ جواب طلب ہو تو تحریر فرمائیے۔ والسلام مخلص
اکبر علی خاں عرشی زادہ

یہ خط ملنے کے بعد ۲۴ر دسمبر کو ایک خط اکبر علی خاں عرشی زادہ کو لکھا گیا :

مکرمی، تسلیمات
نئے سال کی تہنیت قبول فرمائیں
۱۴ دسمبر کے خط کا بہت شکریہ

میں دلّی سے باہر تھا، اس لیے دیر سے خط لکھ رہا ہوں۔

کوئی اور مسودہ محفوظ نہ رکھے گئے ہیں یہ استدلال استفہامیہ انداز میں پیش کرتا، تو سمجھ میں آنے والی بات ہوتی۔ آپ تو تحریروں کی تاریخی اہمیت جانتے ہیں، اُن کی قدر و قیمت سے واقف ہیں۔ نقشِ ثانی کے پہلا پروف پڑھ گئے ہوں گے۔ پھر دوسرے پروف، اغلاط درست ہونے کے بعد دیکھے گئے ہوں گے، پھر آخر میں، نقشِ ثانی کی طباعت کے بعد، آپ نے صحت نامہ مرتب کیا۔ ظاہر ہے اصل مسودے سے تقابل کے بغیر یہ سب کچھ نہ ہوا ہوگا۔ اور اصل مسودہ اُس وقت آپ کے پاس تھا۔ اگر اصل مسودہ آپ نے انجمن ترقی اردو کو نہیں بھیجا، تو وہ آپ کے پاس ہونا چاہیے، کیونکہ آپ عرشی صاحب کی تحریر کو تلف یقیناً نہیں کرتے۔ ان کی وفات کے بعد مسودے باقی رہتے ہیں۔ میرے پاس اپنی کتابوں کے، اور دوسروں کے مضامین کے ہیں۔

ایک بات آپ سے اور دریافت کرنا ہے۔ "نیاز غالب: تحقیقی جائزہ" شائع ہونے سے پہلے ہی رامپور کے ایک اخبار میں، جہازی سائز کے صفحے پر مضمون میں مجھ پر کیچڑ اچھالی گئی تھی۔ میں نے تحقیقی جائزہ میں بعد میں اپنے قلم سے اضافہ کیا، اور نسخۂ عرشی میں، مجبور آباد والے دیوان میں غالب کی تحریر میں، الحاقی الفاظ جو لکھے گئے تھے، اُن کی نشاندہی کی، اور "علم و دانش" کے پہلے شمارے میں نسخۂ عرشی میں کلامِ غالب کے متن میں کچھ اغلاط دکھائی تھیں۔ نقشِ ثانی میں یہ اغلاط درست کر دی گئی ہیں۔ تحقیق و تدوین کا اصول ہے کہ ایسی صورت میں حوالہ ضرور دیتے ہیں۔ کوئی حوالہ نقشِ ثانی میں نہیں ہے۔ کیوں؟ اس پر آپ روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے؟

اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا !

قطعہ تاریخ انطباع

[illegible]

نسخۂ عرشی کے نقشِ ثانی میں جو کچھ نقشِ اول سے مختلف ہے، اس کی نوعیت ان تین میں سے ایک ہے :

ا۔ تیسرے (۱۸۶۱ء کے) اموجان، یعنی مطبع احمدی والے ایڈیشن سے غالب بددل ہو گئے تھے۔ "دو دن رات" کی محنت سے انھوں نے تصحیح کی، اور مالکِ مطبع کو ایک خط حاشیے پر لکھا (اوپر ملاحظہ فرمائیں) اس خط کا عکس تحقیقی جائزہ میں شامل کیا گیا اور نسخۂ عرشی میں الحاق الفاظ کی نشاندہی کی گئی نقشِ ثانی میں اسی سے تصحیح کی گئی۔ اگر نقشِ ثانی میں امتیاز علی خاں نے تصحیح کی

ہوتی تو وہ تحقیق کے آئین کی پابندی کرتے، اور حوالہ دیتے۔

۲۔ "رموزِ غالب کا ایک باب" میں نسخۂ عرشی میں اشعار کے جن نادرست متون کی نشاندہی کی گئی تھی، نقشِ ثانی میں اُن کو درست کر دیا گیا۔ امتیاز علی خاں عرشی تحقیق میں دیانت دار تھے۔ نقشِ ثانی کی کایا پلٹ اور تصحیح میں اُن کا ہاتھ ہوتا، تو "علم و دانش" میں چھپے اس باب کا حوالہ ضرور دیتے۔ یہ بات کہ تصحیح اِسی باب سے کی گئی، ثابت اس سے ہے کہ اور اغلاط، جو بعد کے ابواب میں ہیں، اور جو شائع نہیں ہوئے، نہیں بنائی گئیں۔

۳۔ نو دریافت کلام اگر امتیاز علی خاں عرشی نقش ثانی میں رکھتے، تو تحقیقی جائزہ کے استدلال کو رد کرتے۔

اکبر علی خاں عرشی زادہ نے ۴ دسمبر ۸۸ء کے خط میں لکھا ہے:

"نسخۂ عرشی، نقشِ ثانی کے دو حصے ہیں، اور دونوں حصّوں پر الگ اُن کے مرتّب کرنے والوں کے نام موجود ہیں۔ ابا مرحوم اصل کتاب کے ذمہ دار ہیں، اور میں استدراک کا۔"

نسخۂ عرشی، نقشِ ثانی کے بارے میں انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے ۱۹ مئی ۸۸ء کے خط میں حقیقت یوں بیان کی ہے:

"جب تمام فرمے چھپ کر آ گئے، تو معلوم ہوا کہ سرِورق پر عرشی صاحب کے ساتھ، اکبر علی خاں عرشی زادے کا بھی نام ہے۔ میں نے یہ معاملہ انجمن کی مجلس عاملہ میں پیش کیا۔ عاملہ کے کچھ اراکین کی رائے تھی کہ ہم نے مولانا عرشی مرحوم سے درخواست کی تھی۔ اب اگر اس کام میں کوئی اور شریک ہو گیا ہے، تو انجمن کو اس کتاب کی اشاعت نہیں کرنی چاہیئے۔ بعض اراکین کا خیال تھا کہ نسخۂ امروہہ جعلی ہے، اس لیے نسخۂ عرشی میں جہاں جہاں نسخۂ امروہہ کا ذکر آیا ہے، اُسے نکال دینا چاہیئے۔"

نسخۂ عرشی، نقشِ اوّل ایک ادبی کارنامہ ہے، کچھ خامیوں کے باوجود۔ اگر عرشی صاحب خود ان خامیوں کو دُور کرتے اور نقشِ ثانی میں کچھ تبدیلیاں کرتے تو اس کی بھی ایک تاریخی حیثیت ہوتی۔ موجودہ صورت میں نقشِ ثانی کو امتیاز علی خاں عرشی جیسے جیّد عالم سے منسوب

کرنا، ان کے وقار کو دھکّا پہنچانا ہے۔

آخر میں ایک گزارش نقشِ ثانی کے بارے میں۔ استدراک کے مرتّب عرشی زادہ ہیں اور اس بات کا اقبال خود انھوں نے اپنے خط میں کیا ہے، جو پیش کیا جا چکا ہے۔ ص ۴۶۱ سے ص ۴۷۶ تک گزارش ہے، جس کے آخر میں عرشی زادہ کے دستخط ہیں۔ گویا یہ سطور خود موصوف نے رقم کی ہیں، ان کے والدِ بزرگوار نے نہیں۔ اس بات کو دھیان میں رکھتے ہوئے عرشی زادہ کی گزارش سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ (ص ۴۶۱):

"نسخۂ عرشی زادہ نے پہلی بار غالب کی پچیس غیر معروف غزلوں اور دو رباعیوں کا تحفہ دیا ہے۔ ان میں سے ایک غزل کئی سال ہوئے، ضمیمۂ نسخۂ عرشی میں شامل کی جا چکی تھی۔ مگر بعد ازاں تذکرۂ ہمیشہ بہار میں میر امانی اسد کے نام سے ملی، تو میں نے نسخۂ عرشی حصہ سوم یادگارِ نالہ میں اسے شامل نہ ہونے دیا۔ لیکن اب یہ غزل متنِ نسخۂ عرشی زادہ میں بخطِ غالب لکھی ملی، تو اس کے کلامِ غالب ہونے میں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہ رہی۔۔۔۔۔۔"

یہ عبارت اگر عرشی زادہ کے قلم سے مانی جائے، تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نسخۂ عرشی کے نقشِ اوّل میں ..... دم .. والی اسد میر امانی کی غزل موصوف نے یادگارِ نالہ کے تحت شامل ہونے سے روک دی۔ گویا نقشِ اوّل بھی عرشی اور اکبر علی خاں نے مل کر مرتّب کیا تھا! اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عرشی، نصر اللہ خاں خویشگی کے تذکرے (گلشنِ ہمیشہ بہار) کے وجود سے بے خبر تھے۔ ان کے بیٹے نے وٹو کا استعمال کیا، اور یہ غزل یادگارِ نالہ سے نکلوا دی۔ شبہے، واو عطف کے ساتھ شک و شبہے لکھا ہے۔ اس سے ثابت تو یہی ہوتا ہے کہ یہ عرشی زادہ کی تحریر ہے۔ عرشی لکھتے تو بلا شبہ شک و شبہہ لکھتے۔ اب اگر یہ تحریر عرشی زادہ کی ہے تو یہ بات بھی ثابت ہے کہ نقشِ ثانی میں عرشی زادہ نے تحریفیں کی ہیں، اور یہ نسخۂ عرشی ہے ہی نہیں۔ اور اگر اسے نسخۂ عرشی کہنے پر اصرار ہے تو یہ جعلی نسخہ ہے، نسخۂ عرشی زادہ / نسخۂ بھوپالِ ثانی / نسخۂ امروہہ کی طرح۔

مضمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کم و بیش چالیس برس پہلے نسخۂ عرشی کا مبیضہ تیار ہوا

ہوگا، یا اس پر عرشی نے کام کرنا شروع کیا ہوگا۔ اس وقت عرشی زادہ کی عمر کیا تھی؟ وہ اس لائق تھے کہ ترتیب اور انتخاب میں اپنے والد کی رہنمائی کرتے؟ یہ سطور اعلیٰ ترین اخلاق، آداب اور شائستگی کا بہت اعلیٰ نمونہ نہیں۔

عرشی سے یہ تحریر منسوب نہیں کی جا سکتی، کیونکہ انھوں نے یادگارِ نالہ کا حصّہ رکھا ہی تھا اس کلام کے لیے جو مشکوک تھا۔ اگر یہ سطور وہ لکھتے تو یہ بھی بتاتے کہ یہ غزل انھیں کس ماخذ سے ملی تھی۔ میاں ہدایت جی کا خمسہ یقیناً ان کا ماخذ نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ ہدایت کے انتقال کے وقت غالب کی معروف عمر بہت کم تھی۔ اور کون سا ماخذ تھا یا ہو سکتا تھا — اور اسے صیغۂ راز میں رکھنے کی وجہ؟ یہ سطور یقیناً عرشی کے قلم سے نہیں ہیں۔

ایسی دستاویزوں کا جعل جلد، یا بدیر کھُلتا ضرور ہے۔ میں پروفیسر نذیر احمد کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے امتیاز علی خاں عرشی پر سیمنار کا اہتمام کیا۔ میں اِس کرم کے لیے بھی شکر گزار ہوں کہ مجھے مقالہ لکھنے اور پڑھنے کے لیے طلب کیا۔

ڈاکٹر صابر سنبھلی

مقالاتِ عرشی ایک جائزہ

ہمارے دور میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی شخصیت بلاشبہ کئی لحاظ سے بے مثل تھی۔ اُن کے نتیجۂ علمی کی وجہ سے اگر ان کو علّامہ دوراں، 'محقق اعظم' اور امام تحقیق کے نام سے یاد کیا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ مگر ایسا نہیں کیا جاتا۔ اُن کی شان میں آج جو سب سے زیادہ باعزت لفظ استعمال کیا جاتا ہے وہ "مولانا" ہی ہے۔ جن حضرات نے ان کی نگارشات کا مطالعہ کیا ہے ان پر یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ وہ علم کے بحرِ زخار میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے تھے۔ جس کا کام کیا گمراہوں کو اور کیا راہ بروں کو، منزلِ مقصود کی نشان دہی کرنا ہوتا ہے۔ یہی نہیں کہ وہ کئی زبانوں کا عرفان رکھتے ہوں، بلکہ تین مشرقی زبانوں (عربی، فارسی اور اردو) کے وہ مایۂ ناز فاضل تھے۔ ان زبانوں میں اُن کے تحقیقی کارنامے صفحۂ ہستی پر تادیر قائم رہیں گے۔ ان زبانوں میں کام کرنے والے انھیں اُس وقت تک فراموش نہ کر سکیں گے جب تک یہ زبانیں صفحۂ ہستی پر باقی ہیں۔

تحقیق کے میدان میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ تحقیق میں سب سے اہم کام دریافت ہوتا ہے۔ یہ کام بھی ان سے اچھوتا نہ رہا۔ "مکاتیبِ غالب" میں شائع شدہ خطوط اور امام سفیان ثوری کی "تفسیر قرآن" ان کی وقیع دریافتیں ہیں۔ تدوین کے وہ مردِ میدان کہے جاتے ہیں۔ تحشیہ نگاری نے اُن کی تدوین میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ حاشیہ نگاری میں اُن کی قابلیت اور مہارت کا یہ عالم تھا کہ زیرِ تدوین کتابوں کو تحشیہ نگاری تو خیر جانے دیجیے، مضامین اور مقالات بھی حاشیوں سے خال خال ہی خالی رہتے تھے۔ تحقیقی مضامین اور

مقالات کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ جس نے اہلِ علم سے اُن کی خداداد اہلیت کا لوہا منوالیا ہے۔

معلوم نہیں ہوسکا کہ مجلس ترقی ادب لاہور کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے ۱۹۷۰ء میں عرشی صاحب کے چودہ مقالات کا مجموعہ "مقالات عرشی" کے نام سے شایع کیا تھا۔ اس میں نہ کوئی دیباچہ ہے نہ پیش لفظ۔ اس لیے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس ادارے نے مضامین عرشی کی اشاعت کا کوئی باقاعدہ سلسلہ شروع کیا تھا یا اس کا مقصد چند پسندیدہ اور وقیع مضامین کو یکجا کرکے کتابی شکل دینا تھا۔ پیش لفظ یا دیباچہ نہ ہونے کے سبب اس بابت کچھ علم نہیں ہوتا۔ ساتھ ہی اکیس سال کی مدّت گزر جانے کے باوجود پاکستان جیسے ملک میں (جہاں اردو کے نشر و اشاعت کی کمی نہیں ہے) عرشی صاحب جیسے بسیار نویس کے مضامین (جو بڑی تعداد میں کتابی قالب اختیار کرنے کے لیے کسی علم دوست ناشر کے منتظر ہیں) کی دوسری جلد نہ شائع ہونا اس بات کا غمّاز ہے کہ مجلس ترقی ادب نے صرف اہم مقالات کو بہت سے مقالات میں سے کتابی شکل دینے کے لیے پہلے ہی منتخب کرلیا تھا۔ ورنہ دو دہائی سے زیادہ کی مدّت کم از کم ایک مزید جلد شائع کرنے کے لیے کم نہ تھی۔ میرے اس قیاس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اس کتاب (مقالات عرشی) پر اس کو پہلا حصّہ یا پہلی جلد نہیں لکھا گیا ہے۔ اس لیے اب دوسرے حصّوں یا دوسری جلدوں کا انتظار فضول سی بات ہے۔

جیسا کہ مذکور ہوا "مقالات عرشی" میں چودہ مقالے ہیں۔ اُن کی زبان اردو اور موضوعات عربی و فارسی ہیں۔ ان میں سے ایک مقالہ بھی ایسا نہیں ہے جس کا موضوع اردو زبان یا ادب ہو۔ اِس لیے ہم اس مجموعے کو تحقیقِ عربی و فارسی بہ زبان اردو کہہ سکتے ہیں۔

ان سوالات کے موضوعات اور ان کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امام سفیان ثوری کی سوانح حیات اور ان کی تصنیفات:

اس مقالے کا موضوع عربی تحقیق ہے۔ خیال ہے کہ امام سفیان ثوری کی تفسیر قرآن کی دریافت کے بعد تفسیر اور مفسّر کے تعارف کے لیے اس مضمون کے لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی۔

ساتھ ہی تفسیر کی تدوین اور اس پر تحشیہ نگاری کے سلسلے میں انھیں جن سیکڑوں کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا اُن میں جا بہ جا اس مضمون کے لیے مواد ملتے رہنے سے بھی آسانی ہوگئی ہوگی۔

یہ مقالہ معارف اگست، ستمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا تھا۔ تفسیر کی اشاعت میں اس کا سدھرا اور نکھرا ہوا روپ سامنے آچکا ہے۔ یہ اس لیے بھی کہ عرشی صاحب کو اس کے لیے تیئیس سال کا مزید وقت مل گیا تھا۔

جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس مقالے میں پہلے امام سفیان ثوری کا تعارف، سوانحی حالات اور تصنیفات کی تفصیل ہے۔ لیکن مولانا کے سامنے دشواری یہ تھی کہ امام صاحب کے حالات اور تصنیفات پردۂ خفا میں تھے۔ بڑی تلاش اور کاوش سے مولانا نے کچھ مستند حالات اور تصنیفات سے پردہ اٹھایا ہے۔ امام صاحب کے کچھ حکیمانہ اقوال بھی مقالے میں شامل کیے گئے ہیں۔ اُن کے عقائد اور مجتہدانہ حیثیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مقالے میں اہلِ علم کے لیے یہ اطلاع بھی بڑی معلومات افزا ہے کہ اب سے چند سو برس پہلے تک اہلسنّت میں ائمہ مجتہدین کی تعداد پانچ تھی۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد بن حنبل، امام شافعی اور امام سفیان ثوری۔ نیز شیخ الطائفہ حضرت جنید انھیں کے مقلد تھے۔

۲۔ صحیح مسلم کا ایک قدیم نسخہ ہندوستان میں۔

یہ مقالہ بھی پہلے معارف اعظم گڑھ میں اگست ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا۔ (بحوالہ نگارشات عرشی از اکبر علی خاں عرشی زادہ مشمولہ نذر عرشی) کتاب میں پہلی اشاعت کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔

اس کی تسوید کی وجہ یہ ہوئی کہ معارف میں ہی فروری ۱۹۲۹ء میں نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا ایک مضمون اُن کے ذاتی کتاب خانے کے صحیح مسلم کے ایک نسخے کے تعارف کے طور پر شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے پہلے مولانا سیّد سلیمان ندوی کا ایک نوٹ شائع ہوا تھا۔ جس کا ماحصل یہ تھا کہ صحاح کے نسخے کم از کم مشکوٰۃ، مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم سب سے پہلے ہندوستان میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی عرب سے لائے۔ اس سے پہلے ہندوستان میں مشارق الانوار اور شمائل کا ہی سراغ ملتا ہے۔ یا خواجگی شیروانی نے علاء الدین شاہ حسین (بنگالہ) کو صحیح بخاری کا ایک نسخہ دسویں صدی ہجری کے پہلے

ربیع میں یا اُس کے قریب پیش کیا تھا۔ عرشی صاحب نے اس مقالے میں انھیں مفروضات کی تردید بہ دلائل قاہرہ کی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے رضا لائبریری رام پور میں محفوظ صحیح مسلم کے ایک مخطوطے کا تعارف بالتفصیل پیش کیا ہے۔ اُس پر ثبت مہروں سے یہ نتائج اخذ کیے ہیں کہ یہ کب کب کس کس کی ملکیت رہا۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ نسخہ زیر بحث ۸۷۰ھ قلعہ دارالامان احمد آباد یا اس کے حوالی میں مکتوب ہوا تھا۔

اگرچہ ہندوستان میں صحیح مسلم کے کسی نسخے کا آٹھویں صدی ہجری میں موجود ہونا ہی مولانا ندوی کے نوٹ کی تردید کے لیے کافی تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے خیال کی تائید میں چوتھی، چھٹی، ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں صدی ہجری کے ہندی محدثین و حدیث کے علماء، راویوں، اور مبلغوں کی ایک طویل فہرست مع تعارف پیش کردی ہے۔ جن میں وزراء اور سلاطین بھی شامل ہیں۔ ان کی تعداد ۹۸ رہے۔ ساتھ ہی انھوں نے گیارہویں صدی ہجری کے تین ایسے علمائے حدیث کا بھی تعارف پیش کیا ہے۔ جو اگرچہ مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے ہم عصر تھے مگر علم و حدیث میں اُن کو محدث دہلوی سے کوئی علاقہ نہیں تھا۔ اس طرح یہ تعداد سَو سے تجاوز کرجاتی ہے اور یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ احادیث کی دوسری کتابیں بھی محدث دہلوی کی مراجعت ہند سے قبل اس ملک میں موجود تھیں۔ یہ مقالہ بھی مولانا کی وسعت علمی اور مطالعہ کتب پر دال ہے۔

جیسا کہ اس جائزے سے معلوم ہوا اس کا موضوع بھی عربی تحقیق ہے۔

یہ مقالہ کافی طویل ہے۔ ۶"×۴½" جگہ میں باریک ٹائپ کی چھپائی کے باوجود ۱۰۴ صفحات پر محیط ہے۔ محترم اکبر علی خاں عرشی زادہ کی تحریر (نمونۂ نذر عرشی) کے مطابق یہ پہلے "فاران" کراچی میں شائع ہوا تھا۔ ماہ اشاعت مئی ۱۹۵۴ء تھا۔ لیکن اتنے طویل مقالے کا کسی جریدے کی ایک اشاعت میں مکمل شائع ہوجانا قیاس سے مستبعد ہے۔ ہوسکتا ہے کہ شروع میں یہ مقالہ مختصر رہا ہو یا پھر "فاران" نے اس کی اشاعت کے لیے کوئی خاص شمارہ اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہو۔ بہرکیف بعد کو اس مقالے کو احباب پبلشرز، گولہ گنج لکھنو نے کتابی شکل میں شائع کردیا۔ جیسا کہ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے اس کا

موضوع بھی عربی تحقیق ہے۔

تفہیم میں آسانی کی غرض سے ہم اس مقالے کو دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلے حصے میں "نہج البلاغہ" کے مؤلف کا یقین کیا گیا ہے۔

آج بھی اور ہمیشہ سے اس کا مؤلف عام طور پر سیّد شریف رضی کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ مگر بعض علماء نے اس کا مولف سیّد شریف رضی کے بڑے بھائی سیّد شریف مرتضیٰ کو بتایا ہے۔ ان میں سب سے پہلی تحریر ابن خلکان کی "وفیات الاعیان" میں ملتی ہے جس میں انھوں نے عوام کے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے کہ اس کے مولف سیّد شریف رضی ہیں یا سیّد شریف مرتضیٰ۔ وہ تو اس بارے میں شک کی منزل سے آگے نہیں بڑھے۔ لیکن ابن اثیر، صلاح الدّین صفدی، یافعی اور ابن عماد نے ابن خلکان کے شک کو دوہرا کر یہ غلط فہمی دور کردی کہ اس کے مولف واقعی سیّد شریف مرتضیٰ ہیں۔ اس لیے مولانا عرشی کو اس کتاب کے مؤلف کے تعین کی ضرورت پیش آئی۔ انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس کے مؤلف حقیقتاً سیّد شریف رضی ہی ہیں چھ دلائل قائم کیے۔ پہلی دلیل "کتاب الرجال" مصنفہ علّامہ نجاشی سے دی گئی ہے۔ جس میں انھوں نے سیّد شریف رضی کو "نہج البلاغہ" کا مؤلف قرار دیا ہے۔ مگر صرف اس پر اکتفا نہ کرکے چار دلیلیں خارجی شواہد پر اور ایک داخلی شواہد پر قائم کی ہے۔ داخلی ثبوت "نہج البلاغہ" کے اس نسخے سے دیا گیا ہے۔ جو محی الدّین عبدالحمید نے دو قلمی نسخوں سے مرتّب کرکے قاہرہ سے شائع کرایا تھا۔ اس نسخے میں جگہ "قال الرّضیؒ" یا "قال الرّضی ابوالحسنؒ" آیا ہے۔ جو اس امر کی دلیل قطعی ہے کہ یہ تالیف سیّد شریف رضی کی ہے۔ خارجی شواہد پر قائم پہلی دلیل سیّد شریف رضی کی ایک کتاب "خصائص الائمہؑ" کی بنیاد پر دی گئی ہے۔ اس کتاب کا سیّد شریف رضی کی تالیف ہونا مسلّم ہے اور نہج کے بیسیوں خطبے میں اس کتاب کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے جس طرح کوئی مصنّف یا مؤلف اپنی سابقہ تصنیف یا تالیف کا ذکر بعد کی کتاب میں کرتا ہے۔ اس بیان سے مولانا کے دعوے کی مکمّل تائید ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے خصائص کو سیّد شریف رضی کی تالیف ثابت کرنے کے لیے ناقابلِ تردید شہادتیں پیش کی ہیں۔ دوسری دلیل میں سیّد شریف رضی کی ہی تفسیرِ قرآن

"حقائق التنزیل" سے مدلل ہے۔ اس میں موصوف نے سابقہ تالیف کی طرح "نہج البلاغہ" کا نام اور تعارف دیا ہے۔ تیسری دلیل میں سیّد رضی کی ہی ایک اور تصنیف "مجازات الآثار النبویہ" سے مدلل گئی ہے۔ اس میں "نہج" کا ذکر اسی طرح ہے جس طرح تفسیر میں۔ پانچویں دلیل میں "نہج" کی کچھ شرحوں کا ذکر ہے۔ ان شرحوں میں سے چار کے مطالعے کے بعد اُن میں سیّد شریف کا مؤلف نہج البلاغہ ہونا پایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تین ایسی شرحوں کے حوالے دیے گئے ہیں جو اگرچہ مولانا کے مطالعے میں تو نہ آسکیں مگر اُن کا ظن غالب یہی ہے کہ اُن سے بھی سیّد شریف رضی کا مؤلف نہج البلاغہ ہونا ثابت ہوتا ہوگا۔

الغرض یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ "نہج البلاغہ" کے مؤلف سیّد شریف رضی ہیں، سیّد شریف مرتضیٰ نہیں۔

مقالے کے دوسرے حصے میں "نہج البلاغہ" کے اندراجات کی جانچ کی گئی ہے۔ اس کے لیے "نہج" کے ۲۶۸ر اندراجات کو نقل کیا گیا ہے۔ جن میں سے ۱۱۱ر خطبات سے ۳۸ر خطوط سے اور ۱۱۹ر حکیمانہ اقوال سے اخذ کیے گئے ہیں اور ان سب کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان عبارات کے بعینہٖ ہی ٹکڑے یا تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دیگر کتابوں میں بھی مندرج ہیں۔ اس حصے کی بہت سی عبارات کا تو دیگر کئی کئی کتابوں میں موجود ہونا دکھایا گیا ہے۔ لیکن کتابوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ بار بار کچھ خاص کتابوں کے نام سامنے آتے ہیں۔ پھر بھی یہ مصنّف کے وسیع مطالعے اور قوی یادداشت پر دلالت کرتے ہیں۔

مقالے کے آخر میں ۷۶ر ایسی کتابوں کی مع اُن کے مصنّفین یا مؤلفین کے فہرست دی گئی ہے جن میں سے اکثر اب ناپید ہیں اور جن میں "نہج البلاغہ" کے مضامین کا موجود ہونا ظن غالب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان ۷۶ر کتابوں میں سے بعض کا ذکر تو پہلے آچکا ہے، بعض کے نام مکرّر آئے ہیں اور بعض کے بارے میں کہنا مشکل ہے کہ اُن کے ناموں کی تکرار ہوئی ہے یا ایک ہی نام کی ایک سے زائد کتابیں ہیں۔

طویل مقالہ ہوتے ہوئے بھی مولانا اس میں کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں کرسکے ہیں۔

اس بات کا انھوں نے خود بھی اعتراف کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے کہ یہ باتیں امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی کہی ہوئی یا لکھی ہوئی ہو سکتی ہیں یا نہیں انھوں نے مقالے کا دوسرا حصّہ سپردِ قلم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ مگر افسوس کہ فرشتۂ اجل نے اُن کو اس کی مہلت نہ دی۔ البتّہ اُن کے دولت خانے پر "نہج البلاغہ" کی ایک جلد میں متفرق کاغذات پر اس سلسلے کے کچھ نوٹس اور یادداشتیں لکھی ہوئی ملی ہیں جو یقیناً مقالے کے نتیجہ خیز حصّے کی تیاری کا پتا دیتی ہیں۔ ان کو محترم عرشی زادہ نے "جائزہ مضامین نہج البلاغہ" نام دے کر رضا لائبریری میں داخل کردیا ہے۔ مگر افسوس کہ اب صفحۂ ہستی پر ایسے فاضل نظر نہیں آتے جو اس ادھورے کام کو دیانت داری اور وسیع علمی مطالعے و تحقیق کے ساتھ تکمیل تک پہنچا سکیں۔[۱]

"مقالات" میں مولانا نے علم الانساب کی دوؔ کتابوں پر دادِ تحقیق دی ہے پہلی امام ابو محمد ابن حزم ظاہری کی "جمہرۃ النسب" ہے اور دوسری تاج الاسلام ابوسعّید عبدالکریم بن محمد سمعانی کی کتاب الانساب۔ زیرِ نظر مقالے میں اوّل الذکر کی تحقیق کی گئی ہے۔ اس کا موضوع بھی عربی سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ مقالہ ادارہ معارفِ اسلامیہ لاہور کی ۱۹۳۸ء کی روئداد کے لیے قلمبند کیا گیا تھا۔ خاص بات یہ ہے کہ کتاب سے زیادہ مصنّف کی شخصیت کو اُجاگر کرنے میں محنت کی گئی ہے۔ مصنّف "جمہرہ" حضرت ابو محمد ابن حزم ظاہری اسپین کے پانچویں صدی ہجری کے ایک ذی مرتبت عالم تھے۔ اُن کے سوانح اور آثار کو جمع کرنے میں مولانا نے بڑی تحقیق

[۱] بالکل اسی نام کی ایک کتاب مولوی سیّد علی نقی صاحب نقوی مجتہد نے بھی اب سے بہت پہلے لکھی تھی۔ جو امامیہ مشن لکھنؤ کی طرف سے ۱۳۵۶ھ میں شائع ہوئی تھی۔ ضخامت عرشی صاحب کے مقالے کے نصف سے کچھ زیادہ ہے مگر مناظرے کے رنگ میں ہے۔ انداز اور استدلال بلاشبہ تحقیق اور عالمانہ ہیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ مولانا عرشی نے اپنے مقالے میں ایک ایسی کتاب کا ذکر تک نہیں کیا جو ان کے مقالے سے تقریباً اٹھارہ برس پہلے طبع ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ نام بھی بچا کر نہیں رکھا اور حال یہ ہے کہ "نہج البلاغہ" کے مؤلف کے تعین کے سلسلے میں دونوں کے بیانات اور دلائل تقریباً یکساں ہیں۔ یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی نہیں کہ مولانا کے علم میں یہ کتاب نہ آئی ہو، کیونکہ اس کتاب کا نسخہ رضا لائبریری میں موجود ہے۔ (ص۔ س)

اور جانکاہی سے کام لیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے سوانحی حالات (جو مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں بکھرے پڑے تھے) کو تاریخی ترتیب اور تحقیقی تہذیب کے ساتھ جمع کیا ہے۔ جو یقیناً آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل عنوانات قائم کئے گئے ہیں۔

ابن حزم کی ولادت، تعلیم و تربیت، ابتلائے مصائب، علمی زندگی کا آغاز اور ترقی، ابن حزم کا علمی مرتبہ، ابن حزم کا مسلک اور اس کی مخالفت، مخالفت کی وجہ، ابن حزم کی شاعری، ابن حزم کی وفات۔

ان عنوانات کے تحت انھوں نے (مولانا نے) اختلافی پہلوؤں اور جزوی واقعات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ (ابن حزم کو) اُن کو طلب علم کا شوق کیسے لگا اس کے متعلق ایک عبرت خیز واقعہ تک، نقل کر دیا ہے۔ شاعری پر تو سیر حاصل ریویو بھی کر دیا ہے۔ قابل ذکر یہ بات ہے علامہ ابن حزم کی شاعرانہ حیثیت کو اب تک قطعی نظر انداز کیا گیا تھا۔

اس کے بعد اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس کے لیے مندرجہ ذیل عنوانات قائم کیے ہیں۔

تصنیف و تالیف اور تدریس، جمہرہ کی تاریخ تصنیف، جمہرۃ النسب کے مآخذ، جمہرہ کی تاریخی تحقیقات، تاریخی و ادبی لطائف، قواعد کلیہ، ضرب الامثال، اولیات۔

تصنیف و تالیف اور تدریس کے تحت قاضی ساعد الجیلانی کی ایک کتاب کے مطابق ابن حزم کی تقریباً اسی ہزار اوراق پر مشتمل چار سو کتابوں کی تسوید کی اطلاع دی ہے۔ لیکن ابن حیان کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی زیادہ تر کتابوں کو ضائع کر دیا گیا۔

تاریخِ تصنیف کے تحت داخلی اور خارجی شواہد سے "جمہرہ" کے آغاز اور انجام کی تقریبی تاریخیں (۴۱۷ تا ۴۴۸ھ) طے کی ہیں۔ اس کتاب کے دیباچے یا اختتام میں اس کی کوئی صراحت نہیں کی گئی تھی۔

"جمہرہ" کی "تاریخی تحقیقات" اور "تاریخی و ادبی لطائف" کے ذیل میں کتاب سے کچھ معلومات افزا عبارتیں نقل کی گئی ہیں۔ جن میں سے بعض میں یا تو امام صاحب نے بعض سابقہ مشہور اطلاعات سے اختلاف کیا ہے یا بعض سے مشہور روایات کی تردید ہوتی ہے۔

قواعد کلیہ کے تحت اس کتاب سے عربی اسمار کے صحیح تلفظ سے متعلق تین کلیے تحریر کیے ہیں۔ ضرب الامثال میں تینؔ عربی کہاوتوں کے متعلق جمہرہ کی عبارتیں اور حسب ضرورت دوسرے علمار کی آرار قلمبند ہوئی ہیں۔ اوّلیات کے ضمن میں ۱۶ ر ایسے واقعات دیے گئے ہیں جن کو عربی تاریخ میں اوّلیت حاصل ہے۔

آخر میں جمہرہ کے نسخہ رام پور کی کیفیت اور اس پر لکھے گئے حواشی پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ حواشی میں کسی بعد کے شخص نے مصنّف کے ایک اندراج کی تصحیح کی ہے۔ اس باب میں مولانا مصحح کے حق میں ہیں۔ بعض حاشیوں کو یونہی بغیر کسی تبصرے کے بھی نقل کر دیا ہے۔ کل تیرہ حاشیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جن میں سے اُن کی رائے میں زیادہ تر عمران بن محمد بن شرف الدین لمینی کے قلم کے نوشتہ ہیں اور جگہ جگہ مصنّف سے اختلاف کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں سخت اور درشت الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

مقالہ ختم کرنے سے قبل مولانا آرزو کرتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کسی جواں مرگ طالب علم نے مرتب کیا تھا۔ اگر وہ شائع ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔

"مقالات" کا یہ پہلا مقالہ ہے جس کا تعلق ادبیات فارسی سے ہے۔ محترم عرشی زادہ کی اطلاع کے مطابق یہ مقالہ "معارف" اعظم گڑھ اکتوبر / دسمبر ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ نیم تحقیقی اور نیم تنقیدی ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ رباعیات عمر خیّام کا ایک اہم نسخہ رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کے متن کا دوؔ مطبوعہ نسخوں کے متنوں سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ مطبوعہ نسخوں میں ایک مولانا جلال الدّین جعفری کا مرتّب کردہ (الہ آبادی) نسخہ ہے اور دوسرا مولانا نصیر الدین کا ترتیب دیا ہوا (لاہوری) نسخہ ہے۔

عمر خیام کی رباعیات کے بارے میں محققین میں سخت اختلاف ہے محققین کی ایک جماعت رباعیات کی کثیر تعداد کو الحاقی مانتی ہے۔ ان نسخوں کے متون کا تقابل کرتے ہوئے یہی بات مولانا عرشی کے پیش نظر رہی ہے۔ رام پور کے قلمی نسخے میں

تین سو پچاس رباعیات درج ہیں۔ جب کہ یہ ناقص الآخر ہے۔ اس نقص کی وجہ سے اس کی سنہ کتابت کا بھی علم نہ ہو سکا۔ پہلے مولانا نے یہ رائے قائم کی تھی کہ دسویں صدی ہجری کا مخطوطہ ہے۔ مگر بعد کو یعنی مقالات کی اشاعت کے وقت انھوں نے اس سے رُجوع کر لیا۔ فٹ نوٹ میں تشریح کرتے ہیں۔

"یہ میرا اندازہ اُس وقت کا ہے جب میں اس کوچے میں نووارد تھا۔ موجودہ معائنے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ بارھویں صدی ہجری کا نوشتہ ہے۔"

یہ مولانا کی تحقیق میں دیانت داری کی روشن دلیل ہے۔ ایسا ہی ایک اندراج صفحہ ۲۴۵ کے فٹ نوٹ پر بھی ہے۔ وہاں پر بھی مولانا نے اپنی سابقہ رائے سے رجوع کیا ہے۔

اس تقابل کا مقصد یہی تھا کہ خطی نسخے کی صحت کو ترجیح دی جائے۔ لیکن اختلاف متن کی حالت میں جب نتائج اخذ کرنے کے لیے مولانا نے رُباعیات کی شرح کی، نکات ظاہر کیے، مفاہیم پر غور و فکر کیا، فصاحتِ الفاظ کا جائزہ لیا تو کئی جگہ مخطوطے کے متن کو غلط قرار دیا، کئی جگہ مطبوعہ نسخوں کے متن کی صحت پر اصرار کر کے اُن کو ترجیح دی۔ یہ بھی تحقیقی دیانت داری کی زندہ مثال ہے۔ ورنہ اس تقابل سے مولانا کا مقصد تو مخطوطے کے متن کو ہی ترجیح دینا تھا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ مطبوعہ نسخوں کے اکثر متون کو قرار دیے جانے کا جواز ہاتھ آگیا۔

اس بحث میں فارسی شاعری کے بڑے اہم رموز و نکات ظاہر ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی مقالے کے مفید ہونے میں کلام نہیں۔

مقالہ زیرِ نظر سے مولانا عرشی کی باریک بینی اور تحقیقی ژرف نگاہی کا بھی پتا چلتا ہے۔ ۶۶ پر جو رباعی نقل ہوئی ہے اس کا صرف ایک ایک مصرع مطبوعہ نسخوں سے متحد ہے۔ وہ بھی الگ الگ۔ الہ آبادی نسخے میں چوتھا مصرع اور لاہوری نسخے میں پہلا قلمی جیسا ہے۔ دونوں مطبوعہ نسخوں میں صرف دو مصرعے باہم متحد ہیں۔ سرسری نظر کے مطالعے سے مقابلے کے لیے ایسی رباعیوں کو منتخب کر لینا ممکن نہیں تھا۔ اسی طرح ۳۱ اور نمبر ۳۴۳ میں جو مطبوعہ

نسخوں کی ایک ہی رباعی دو جگہ نقل ہو گئی ہے اُس کا سبب یہ ہے کہ اس مضمون کی ایک قلمی رباعی کسی حد تک ۳۱ سے اور کسی حد تک ۳۴۳ سے مشابہ ہے۔

۱۵ میں قلمی رباعی کا چوتھا مصرع ہے۔

ع والله نخورم خون عدو گرنہ رواست

لیکن اس میں مولانا کی تحریر کے مطابق لفظ "گرنہ" صاف لکھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ اس کی شکل ایسی ہے کہ اس کو "گوتہ" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ جس سے معنی بدل جاتے ہیں۔ مولانا اس بدلی ہوئی حالت کی بھی شرح کرتے ہیں۔ یہی نہیں ایک تیسری احتمالی شکل اور بھی پیدا کر لیتے ہیں۔

بلاشبہ یہ کام عام نظروں کی پہنچ سے باہر ہے۔ اس پر مولانا عرشی جیسے بالغ نظر محقق ہی دسترس رکھتے تھے۔

؎ این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

"مقالات" میں سب سے زیادہ مختصر مقالہ ہے۔ جو کہ صرف ساڑھے چار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا موضوع فارسی ادب ہے۔ مقالے میں بھی فارسی عبارتیں اور اشعار زیادہ نقل ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر اس کی زبان کا بھی کثیر حصہ فارسی پر ہی مشتمل ہے۔ یہ فروری ۱۹۴۱ء میں "معارف" اعظم گڑھ نے شائع کیا تھا۔

مقالے میں کل بارہ رباعیاں "مرصاد العباد من المبدا الی المعاد"، مصنفہ علامہ نجم الدین ابوبکر رازی ہمدانی سے نقل ہوئی ہیں۔ ہوا یہ تھا کہ ۱۸۹۷ء میں روسی مستشرق ژوکووسکی نے "مظفریہ" نام کے ایک مجموعے میں ایک مضمون شائع کرایا تھا جس میں "مرصاد العباد" کے دو مقالات کا ذکر کر کے کہا گیا تھا کہ اس میں عمر خیام کی رباعیاں شامل ہیں۔ اس پر مولانا عرشی نے ۷ رعدد ایسی رباعیوں کی نشاندہی کی جو نام کی صراحت یا بغیر صراحت کے خیام سے منسوب ہیں اور وہ عمر خیام کے رباعیوں کے مجموعوں میں پائی جاتی ہیں۔ ایک رباعی کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ خیام کی نہیں ہے۔ لیکن خلافِ عادت کوئی دلیل نہیں دی۔

اغلب ہے کہ وہ کسی نسخے میں نہ ملی ہوگی۔ "مقالات" کی اشاعت کے وقت "پس نوشت" کے عنوان سے مقالے میں اضافہ کیا ہے۔ جس میں چار رباعیاں مزید بڑھائی گئی ہیں۔ ان میں سے دُو کے مضمون میں سے خاصا اشتراک ہے اور اس کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔ یہ بھی قیاس کیا ہے کہ ان میں سے ایک دوسری کی اصلاحی شکل ہو سکتی ہے۔

مقالے میں دُو رباعیاں ایسی بھی ہیں جن میں صرف دُو لفظوں کا فرق ہے۔ اس لیے ان کو بھی اختلافِ متن پر مبنی ایک ہی رباعی قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا مولانا عرشی کی تحقیق کے مطابق "مرصاد العباد" میں عمر خیام کی نُو رباعیاں شامل ہیں۔

کئی رباعیوں کے آگے یا پیچھے یا آگے اور پیچھے کی نثر کو بھی نقل کر دیا ہے۔

اس مقالے میں عرفی تحقیق ہوئی ہے۔

صاف "ہدایہ" برہان الدین علی حسن کے اُستاد علامہ عمر بن محمد ملقب بہ نجم الدین کو نجم نسفی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے جید عالم تھے۔ ان کے علم و فضل کے سبب ان کو "مفتی جن و انس" کہا جاتا تھا۔ مگر ان کے سوانحی آثار اور کارنامے عام نظروں سے مخفی تھے۔ مولانا عرشی نے اس طویل مقالے میں امام نجم نسفی سے اپنے قارئین کو مستند اور تاریخی مآخذات کے حوالوں کے ذریعہ متعارف کرایا ہے۔ مآخذات کو فٹ نوٹس میں مندرج کرتے گئے ہیں۔ ابتداءً مقالے میں ضمنی عنوانات مندرجہ ذیل ہیں۔

نام و نسب، اساتذہ، "تلامذہ" سفر، وفات، اولاد، تصنیفات،

مقالے کی تمہید میں "مرآت الجنان" اور "شذرات الذہب" کے حوالوں سے امام صاحب کی تصنیفات کی تعداد سَو لکھی ہے۔ جن کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی بڑی تعداد حوادث کی نذر ہو گئی۔ مگر تصنیفات کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

"نجم نسفی کی سو سوا سو کتابوں میں صرف حسب ذیل کا ہمیں علم ہے۔"

یہ سَو کے بعد سوا سو کا اضافہ مولانا نے کسی اطلاع کی بنیاد پر کیا ہے۔ اس کا حوالہ انھوں نے نہیں دیا۔ غالباً یہ اُن کا حُسنِ ظن ہے اور یہ حسنِ ظن کسی حد تک درست بھی

ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ مولانا نے تصنیفات کی فہرست میں ایک ایسی کتاب "مطلع النجوم و مجمع العلوم" کا بھی ذکر کیا ہے جس کو تذکرہ نویسوں نے قطعی نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر رام پور کے سرکاری کتب خانے میں اس کا ایک ناقص الاوّل نسخہ نہ ہوتا تو مولانا کو بھی اس کے وجود کا علم نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ ایسی کتابیں اور بھی ہو سکتی ہیں جو تذکرہ نویسوں کے علم میں نہ آئی ہوں۔

یہاں پر مولانا نے مختلف ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کی روشنی میں امام صاحب کی ۲۱ کتابوں کی فہرست درج کی ہے۔ فہرست میں آخری کتاب وہی "مطلع النجوم" ہے۔ جس کا ذکر تذکرہ نویسوں نے نہیں کیا ہے۔ اس لیے اس کا تعارف تفصیل سے کرانے کے لیے مندرجہ ذیل سُرخیاں قائم کی ہیں۔

کیفیت مخطوطہ: رام پور کی اسٹیٹ لائبریری میں محفوظ مخطوطے کا تعارف مع اُس کی موجودہ کیفیت کے کرایا گیا ہے۔

کتاب کے مضامین :- مولانا کی تحریر کے مطابق اس کتاب میں بہت سی کتابیں پوری اور بہت کے خلاصے درج کیے گئے ہیں۔ بعض ناپید کتابوں کے مضامین بھی اس میں شامل ہیں۔ مولانا نے ان ناپید کتابوں کی فہرست بھی دے دی ہے اور ریویو بھی کر دیا ہے۔ ایسی کتابوں کی تعداد چھ ہے۔

"مطلع النجوم" میں جن فارسی گو شعراء کے اشعار استشہاد کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ مولانا نے اُن کے نام اور وہ اشعار بھی درج کر دیے ہیں۔ ایسے شعراء کی کل تعداد بارہ ہے۔ بعض اشعار ان میں ایسے ہیں جو اور کسی جگہ نہیں ملتے۔ کچھ اشعار گم نام ہیں۔ "مطلع النجوم" کے فارسی اشعار پر مولانا نے تبصرہ بھی کیا ہے۔ ایک دُو جگہ متن کے اختلاف کا ذکر بھی ایسے شعروں کے بارے میں کیا ہے جو دوسری جگہ بھی ملتے ہیں۔ جہاں مفہوم صاف نہیں ہے۔ اُس کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔

امام نسفی فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ مگر وہ اس حیثیت سے معروف نہیں ہیں۔ اس لیے مولانا نے اس مقالے میں ان کے فارسی اشعار کی خاصی تعداد دے کر ان کے

محاسن اور صنائع پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جس سے اس مقالے کی اہمیت اور افادیت بڑھ گئی ہے۔

"مطالع النجوم" کے مفصل تعارف کے بعد مولانا دو ایسی کتابوں کے مصنف کی بحث اُٹھاتے ہیں جن کو جمہور نے امام نسفی کی ہی تسلیم کیا ہے۔ مگر اس سے اختلاف بھی ہوا ہے۔ وہ کتابیں ہیں: ۱۔ العقائد النسفیہ ۲۔ طلبۃ الطلبہ۔

جمہور کے خلاف پہلے علامہ زرقانی نے اور بعد کو مولانا عبدالحیٔ نے "العقائد النسفیہ" کو بُرہان الدین نسفی کی تصنیف لکھا ہے۔ "طلبۃ الطلبۃ" کا انتساب صاحب "الجواہر" نے رُکن الائمہ عبدالکریم سے کیا ہے۔ مولانا نے پہلی کتاب کے لئے چار عدد محکم شہادتیں فراہم کرکے ان کو امام نجم نسفی کی تصنیف اور تالیف ہونا ثابت کیا ہے۔

اس بحث سے فارغ ہوکر "طلبۃ الطلبۃ" (جو فقہی اصطلاحات کا لغت ہے) کے ایک اور پہلو پر نظر ڈالی ہے اور وہ پہلو ہے اُس میں فارسی الفاظ کا پایا جانا۔ اس کتاب کے فارسی الفاظ کی فہرست مولانا نے حروفِ تہجی کا لحاظ رکھتے ہوئے مع اس کے عربی مرادفات کے تیار کرکے شاملِ مقالہ کر لی ہے۔ ساتھ ہی ان الفاظ کی تشریح اور توضیح کے لئے دوسری عربی و فارسی کے حوالے مع صفحات کے نمبروں کے قوسین میں دے دیئے ہیں۔ ان الفاظ کی تعداد ۱۱۸ ہے۔ متعدد الفاظ کے سامنے لغات کے حوالے بھی نہیں ہیں۔ کئی لفظوں کے بارے میں لکھا ہے کہ تحقیق نہ ہو سکی۔

مقالے کے آخری حصے میں مولانا نے نجم نسفی کی تین مزید کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ گمان غالب ہے ان کتابوں کا پتا مقالہ مکمل ہو جانے کے بعد چلا ہوگا۔ وہ کتابیں ہیں: ۱۔ الاربعون ۲۔ الجمل المأثورہ ۳۔ النجاح فی شرح اخبار کتاب الصحاح۔

اوّل الذکر چہل حدیث کا مجموعہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہے۔ موخر الذکر دونوں کتابوں کے نام عماد الدّین محمود الفاریابی کی کتاب "خلاصۃ الحقائق" اور حاجی خلیفہ کی "کشف الظنون" کے حوالے دے کر لکھے گئے ہیں۔ مقالے کے خاتمے کو ہم بجا طور پر تتمہ کہہ سکتے ہیں۔ جس میں فارسی گو شعرا کے عنوان کے تحت سابق میں گنائے گئے شعراء میں سے دو یعنی جبلی اور نظری کے بارے میں مزید معلومات درج کی گئی ہیں۔ پہلے کے بارے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے ایک مکتوب اور دوسرے کے لئے کئی کتابوں کی مدد لی گئی ہے۔

یہ مقالہ پہلے "معارف" اعظم گڈھ کی مارچ، اپریل اور جون ۱۹۴۶ء کی اشاعتوں میں قسط وار نکلا تھا۔ اہلِ علم نے اس کو بہت پسند کیا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی نے اپنے ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھا تھا:

"واقعی نسفی کی قدر و منزلت اس مضمون سے بڑھ گئی۔"

(مکتوباتِ سلیمانی، جلد دوم ۱۹۶۷ء، ص ۱۷۷)

اس جملے پر مولانا عبدالماجد دریابادی کا نوٹ بھی قابلِ ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مراد امام نجم الدین نسفی صاحب عقائد ہیں۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے معارف کے تین نمبروں میں ان پر مفصل اور تحقیقی مضمون مولوی امتیاز علی خاں عرشی رام پوری کے قلم سے نکلا تھا۔ میں نے اس مضمون کی داد لکھ کر بھیجی تھی۔"

(ایضاً)

۸۔ سمعانی اور اُن کی کتاب الانساب

اس مقالے کا موضوع عربی تحقیق ہے۔ یہ پہلے ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کی ۱۹۳۹ء کی روئداد میں شائع ہوا تھا۔ "انساب" کی یہ دوسری کتاب ہے جس پر مولانا عرشی نے مقالہ قلم بند کیا ہے۔ پہلی کتاب امام ابن حزم ظاہری کی تھی اور یہ دوسری کتاب تاج الاسلام ابو سعد عبدالکریم بن محمد سمعانی کی ہے۔ اس کا نام ہی "الانساب" ہے۔

مولانا نے بڑی عرق ریزی سے تاج الاسلام کی سوانح حیات مرتّب کی ہے۔ نام و نسب سے مفصّل بحث کرتے ہوئے خاندان سمعانی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس خاندان کی چند مشہور شخصیتوں کے حالات بھی مختصراً تحریر کئے ہیں۔ تاج الاسلام کی ولادت اور تعلیم، ان کے تعلیمی سفر، شادی اور تدریس، شیوخ اور تلامذہ کا مفصل احوال لکھتے ہوئے وفات تک مربوط سوانح عمری ترتیب دی ہے۔ ایک عنوان اولاد قائم کرکے ان کے صاحب زادے ابو المظفر کے بہت ہی مختصر حالات لکھے ہیں اور ظاہر کیا ہے کہ ان کی موت کے ساتھ خاندان سمعانی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

سوانحی حصے کے بعد مولانا نے سمعانی کی تصنیفات کو لیا ہے مسٹر مارگولیتھ اور مولانا سبکی کے فہرستوں کے حوالوں سے لکھا ہے کہ سمعانی کی ۵۲ کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ چار کتابوں کے نام "الانساب"

سے معلوم ہوتے ہیں۔ سمعانی کی کتابوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ضخیم تھیں۔ کتاب الانساب کا تعارف کراتے ہوئے ابتدا میں ہی سات کتابوں کی کل جلدوں کی تعداد ۶۲ بتائی ہے۔ جن میں سے ذیل تاریخ بتعداد ۱۵، تاریخ مرو ۲۰، اور کتاب الانساب ۸ جلدوں میں لکھی گئی تھیں۔

چونکہ کتاب الانساب اس مقالے کا خاص موضوع ہے۔ اس لئے اس پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کی ترتیب ۵۵۰ھ میں ابو شجاع بسطامی کی ترغیب سے شروع ہوئی۔ اس میں نسبتوں کو حروفِ تہجی کا لحاظ رکھتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے۔ کل ۵۲۶۴ نسبتیں اور لقب مذکور ہوئے ہیں۔ مولانا عرشی کے اندازے کے مطابق یہ کتاب ۱۴ - ۱۵ ہزار اشخاص کے حالات پر مشتمل ہے۔

کتاب کے ماخذوں کے بارے میں ان کے مطابق بہت سی کتابیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا حوالہ مصنف ہی نے نہ دیا ہو اور بہت سی مقالہ نگار کے سرسری مطالعہ کے وقت نظر انداز بھی ہو سکتی ہیں۔ پھر بھی جن کتابوں کے نام "الانساب" میں آئے ہیں ان کی فہرست مولانا نے مقالے میں شامل کر دی ہے جن کی تعداد ۱۰۲ ہے۔

"الانساب" کی تاریخی اہمیت ثابت کرنے کے لئے پانچ نکات پر بحث کی گئی ہے۔ وہ نکات ہیں (۱) موضوع (۲) جذبات اسلوب (۳) جامعیت (۴) مصنف کے متعلق ماہرین کی آراء (۵) مصنفین مابعد کا "الانساب" سے استفادہ۔

"الانساب" پر اعتراضات ہوئے ہیں۔ معترضین میں مسٹر مارگولیتھ اور ابن الجوزی ہیں۔ مولانا نے مسٹر مارگولیتھ کے اعتراضات کے جوابات تو اپنی طرف سے دے دیئے ہیں مگر ابن الجوزی کے اعتراض کے جواب میں ابن الاثیر کا جواب نقل کر کے اُس پر اپنی طرف سے معتدل تبصرہ کر دیا ہے۔

"الانساب" سے ۸ ایسے تاریخی حقائق بھی اخذ کئے گئے ہیں جو یا تو کسی سابقہ خیال کی تردید کرتے ہیں یا قاری کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کرتے ہیں۔

کتاب میں فارسی گو شعراء کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہ تین ہیں۔ رودکی، اسمٰعیل بن احمد بن اسمٰعیل اور مصنف کا چچازاد بھائی ابو منصور بن الحسن سمعانی۔ ان میں بعد کے دونوں شاعر ذولسانین ہیں۔ مولانا نے ان کا بھی تذکرہ کر دیا ہے۔ کچھ ہندی علماء کا ذکر بھی اس کتاب میں ہے۔ ان کی تعداد مقالے میں سترہ ہے۔ مختصر تعارف بھی درج ہوا ہے۔

مولانا عرشی کی معلومات کے مطابق ساری دنیا میں اس کتاب کے جو نسخے موجود ہیں ان کی تعداد نو یا دس ہے۔ ان کی فہرست مع کیٹلاگ نمبروں کے دے کر نسخہ رام پور اور نسخہ لندن کی کیفیتوں کا ذکر ہے۔ دونوں نسخوں کا تقابل بھی دے دیا گیا ہے۔ جس سے نسخہ رام پور مکمل تر ٹھہرتا ہے۔

نسخہ رام پور پر کچھ حواشی بھی ہیں۔ اُن میں سے چھے کا ذکر کیا گیا ہے۔ دو حاشیے جلد بندھتے وقت کٹ گئے ہیں۔ اس لئے پورے نہیں پڑھے جاتے۔ مگر پھر بھی نتیجے نکالے جا سکتے ہیں۔

لندنی نسخے کے حواشی درج نہیں کئے گئے ہیں۔ اس لے کہ اس کا عکس نایاب نہیں ہے۔

زرنوجی کا نظامِ تعلیم و تعلّم

اس مقالے کا موضوع عربی تحقیق ہے۔ یہ "تعلیم جوہر" رام پور کے اپریل ۱۹۴۶ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔

چھٹی صدی ہجری میں ایک ترکی فاضل نے طلبہ کے لئے "تعلیم المتعلم طریق التعلّم" نام کا ایک رسالہ عربی مقالہ لکھا تھا۔ یہ رسالہ طلبہ کے لئے بے حد مفید ہے۔ مولانا اس رسالے اور اس کے مصنف پر ایک سیر حاصل مقالہ تحریر کرنا چاہتے تھے۔ لیکن انتہائی حیرت اور افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ انھیں رضا لائبریری جیسے ذخیرۂ کُتب میں اس رسالے کے مصنف کے بارے میں جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ معجم البلدان حموی سے مصنف کا نام تو بُرہان الدین (بُرہان الاسلام) زرنوجی معلوم ہو گیا۔ لیکن مولانا کی رائے میں یہ نام نہیں۔ بلکہ لقب اور نسبت سے مرکب ہے۔ تذکروں کو کھنگا لنے کے بعد اتنا اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ مشہور اسلامی متفنن بُرہان الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر الفرغانی (مصنف الہدایہ) کے شاگرد تھے۔ لیکن مولانا عرشی کے مطابق اتنی مختصر اطلاع بھی محققین کی کسی ذاتی کدوکاوش کی مرہونِ منت نہیں۔ بلکہ خود زرنوجی کے ہی ایک بیان کی نقل ہے۔ انھوں نے اس تذکرے کو آگے بڑھانے کے لئے، ایسے علماء کا تذکرہ اور کر دیا ہے جن کے نام وغیرہ اس رسالے میں ملتے ہیں اور خیال ہے کہ وہ زرنوجی کے استاد رہے ہوں گے۔ مصنف رسالہ کے بارے میں اُن کے والد کے متعلق ایک جملے کے علاوہ مزید کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ یہاں تک کہ اس رسالے کے علاوہ کسی اور تصنیف کا بھی علم نہیں ہوتا۔ بلکہ انتہا تو یہ ہے کہ اس رسالے کی تاریخِ تصنیف کا تعین بھی کسی طرح نہیں ہو پاتا۔ البتہ انھوں نے رسالے کے بارے میں بہت تفصیل سے لکھ دیا ہے۔

یہ رسالہ علمی دُنیا میں کافی مشہور رہا ہے۔ اور اس کی کافی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں۔ مولانا نے اس کے مضامین کے خلاصے بھی مقالے میں درج کر دیئے ہیں جو طلبہ کے لئے بے حد مفید ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہاں اُن کا ذکر بے سُود ہے۔

مقالے کے شروع میں نظام تعلیم کے متعلّق مسلمانوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ۱۹ کتابوں کے نام بھی گنائے ہیں جن کو مختصر فہرست کہہ کر اظہارِ افسوس کیا ہے کہ ان میں سے بھی صرف چند ہی کتابیں محفوظ رہ گئی ہیں۔

مقالہ ختم ہوتے ہوئے زرنوجی کے بیانات کا تجزیہ کر کے جدید انداز پر ایک تعلیمی دستور العمل پیش کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن کثرتِ کار نے اس کا موقع نہ آنے دیا، یہاں تک کہ موعودہ وقت پر فرشتۂ اجل اپنا کام کر کے ہمیں اس کے فوائد سے محروم کر گیا۔

نمبر۱ آداب المتعلمین اور محقق طوسی:

اس مقالے کا موضوع عربی تحقیق ہے۔ یہ پہلے مجلّہ "فکر و نظر" علی گڑھ میں جولائی ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔ نذرِ عرشی میں کتابت کی غلطی سے اس کے آگے مجلّہ "علومِ اسلامیہ" علی گڑھ جون ۱۹۶۱ء چھپ گیا ہے۔ یہ غلطی غالباً اس لئے ہوئی کہ اس کے اُوپر نمبر۶۰ پر "طبقات الفقہاء الشافعیۃ الوسطیٰ" کا نام ہے اور اس کے آگے مجلّہ علومِ اسلامیہ علی گڑھ جون ۱۹۶۱ء چھپا ہے۔ کاتب نے بے پروائی سے نمبر۶۱ پر اس مقالے کے نام کے آگے اس کو دوبارہ نقل کر دیا۔

اس کو "زرنوجی کا نظامِ تعلیم و تعلّم" سے مربُوط کیا جا سکتا ہے۔ زرنوجی کے رسالے کا ایک خلاصہ رام پور کی اسٹیٹ لائبریری میں "آداب المتعلّمین" کے نام سے موجود ہے۔ اس مقالے (آداب المتعلّمین) کی پیشگی اطلاع مولانا عرشی نے "مقالات" میں مندرجہ بالا خلاصے کا ذکر کرتے ہوئے فٹ نوٹ میں دے دی ہے۔

اس مقالے کو لکھنے کا سبب یہ ہوا کہ ڈاکٹر یحییٰ خشاب نے "آداب المتعلّمین" کا متن شائع کر کے اس کو محقق طوسی کی تالیف قرار دیا تھا۔ مولانا عرشی کو اس سے اختلاف تھا، جس کا اظہار اس مقالے کی صورت میں ہوا ہے۔

بلاشبہ مولانا نے ڈاکٹر خشاب کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن نفسانیت سے کوسوں

دُور رہ کر۔ آج ہمارے علماء کا حال یہ ہے کہ اختلاف کرتے وقت مخالف کی کمیوں اور غلطیوں کو تو بڑے زور شور کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں لیکن اُس کی خوبیوں کا ذکر تک نہیں کرتے۔ مولانا عرشی نے ایک دیانت دار محقق کی طرح ڈاکٹر یحییٰ خشاب کی اس لغزش کے پسِ پردہ کارفرما عوامل کو بھی نہ صرف نظر میں رکھا ہے بلکہ ڈاکٹر خشاب کو بری الذمہ قرار دینے کے لئے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب نے اس رسالے کا انتساب محقق طوسی سے کیا ہے تو یہ بے وجہ اور محض خود رائی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے قرائن اور دلائل بھی ہیں۔ ان قرائن اور دلائل کی فہرست انھوں نے شروع میں ہی درج کر دی ہے۔ چار دلائل نمبروار ہیں اور ایک بغیر نمبر کے ہے۔ حاجی خلیفہ نے اس کا ذکر کس طور پر کیا ہے، مقالے کی عبارت سے یہ بات واضح نہیں ہوتی یعنی یہ پتا نہیں چلتا کہ حاجی خلیفہ کی رائے سے ڈاکٹر خشاب کی تائید ہوتی ہے یا تردید۔ بے نمبری دلیل یہ ہے کہ رام پور کی لائبریری میں اس کتاب کا جو نسخہ محفوظ ہے اُس پر محقق طوسی ہی کو اس کا مؤلف لکھا ہے۔

مولانا نے ڈاکٹر خشاب کے خلاف جو دلیلیں دی ہیں اُن میں سب سے پہلی دلیل ان دونوں رسالوں کے سبک اور انداز کا فرق ہے۔ اگرچہ یہ کوئی پختہ دلیل نہیں ہے مگر نہایت دیانت داری کے ساتھ ڈاکٹر خشاب کی جانب سے یہ صفائی بھی پیش کر دی ہے کہ یہ بات انھیں بھی کھٹکی تھی۔ لیکن انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ یہ رسالہ فارسی میں لکھا گیا ہوگا جس کا ترجمہ بعد کو کسی نے عربی میں کر دیا۔ (ظاہر ہے کہ ترجمے میں اصل کے سبک کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔)

اپنی رائے (یعنی اس رسالے کا مؤلف محقق طوسی نہیں ہے) کی تائید میں دو داخلی دلیلیں اور دینے کے بعد چوتھی دلیل بہت مضبوط دیتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ رسالہ "تعلیم المتعلّم طریق التعلّم" کا خلاصہ ہے۔ اس کے لئے انھوں نے دونوں رسالوں کی کئی عبارتوں کا مقابلہ کیا ہے۔ اوّل تو دونوں رسالوں کی فہرست ہائے مضامین میں ہی بہت معمولی سا فرق ہے۔ پھر دونوں کے دیباچوں کا مضمون بھی یکساں ہے۔ متن کی عبارتیں یا مضامین باہم متحد ہیں، جس کے تقابل کے بعد اس میں شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ "آدابُ المتعلّمین" "تعلیم التعلّم" کا خلاصہ ہے اور یہ بات بھی بعید از فہم ہے کہ محقق طوسی جیسا علّامہ اپنے کسی ایسے معاصر کے رسالے کا خلاصہ لکھتا جو نہ صرف مراتب، شہرت اور نام وری میں اُس سے کم تھا، بلکہ ایسا رسالہ اُس کے دماغ کے سامنے بچّوں کے کھیل سے زیادہ نہیں تھا

اور اگر وہ خلاصہ بھی کرتا تو کیا اتنا بھی نہ کرتا کہ علمائے احناف کے حوالوں کی جگہ شیعی ائمہ اور علماء کے حوالے پیش کر دیتا۔ واضح ہو کہ محقق طوسی کا شیعہ عالم ہونا مسلّم ہے۔

لیکن یحییٰ خشاب کی رائے کی تردید کے باوجود مولانا یہ سراغ لگانے میں ناکام رہے کہ زیر بحث رسالے کا مؤلف کون ہے۔ ان کے مطابق ابھی تک اس قسم کے شواہد ناپید ہیں۔

اس رسالے میں مثنوی معنوی کے دو شعر بھی "الحکمۃ الفارسیۃ" کے تحت درج ہوئے ہیں، جن سے مولانا نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مولوی معنوی سے ان کے معاصرین حد درجہ متاثر تھے۔ اگرچہ یہ بات مقالے کے موضوع سے تعلق نہیں رکھتی مگر خالی از دلچسپی و معلومات بھی نہیں ہے۔

ایک ضروری بات جس کا لکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ مقالے کو شاملِ کتاب کرتے ہوئے کچھ ایسے اضافے بھی ہوئے ہیں جو فکر و نظر کی اشاعت میں نہیں تھے۔ جیسے صفحہ ۳۹۴ پر سطر ۱۲ و ۱۳۔

طبقات الفقہاء الشافعیۃ الوسطیٰ:

یہ مقالہ پہلے مجلہ "علومِ اسلامیہ" علی گڑھ میں جون ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا۔

اس مقالے میں عربی تحقیق ہوئی ہے۔ علامہ سبکی آٹھویں صدی ہجری کے بلند پایہ شافعی عالم تھے۔ انھوں نے دیگر اہم کتابوں کے علاوہ فقہائے شافعیہ کے تین تذکرے بھی ترتیب دیے تھے۔ جن میں پہلا "طبقات الفقہاء الشافعیۃ الکبریٰ"، دوسرا "طبقات الفقہاء الشافعیۃ الوسطیٰ" اور تیسرا "طبقات الفقہاء الشافعیۃ الصُغریٰ" ہے۔ زیرِ نظر مقالے میں پہلے دو تذکروں یعنی "کُبریٰ" اور "وسطیٰ" کے اندراجات پر بحث ہوئی ہے۔ لیکن زیادہ زور تذکرہ "وسطیٰ" کے اندراجات پر دیا گیا ہے۔

مقالے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ "کُبریٰ" بہت زیادہ ضخیم تھا۔ اتنا ضخیم کہ اُس کا استعمال آسان نہ تھا۔ اس لئے اُس کے مضامین اور مطالب کو عام کرنے کی غرض سے "وسطیٰ" میں اس کی تلخیص کر دی گئی۔ "کبریٰ" اور "وسطیٰ" کی ضخامت کے فرق کا اندازہ اس لئے لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کے شمار کے مطابق "کبریٰ" کے آٹھویں صدی ہجری کے ۱۲۹ رجال میں صرف ۵۴ جگہ پا سکے ہیں۔

لیکن "وسطیٰ" کے اختصار کے باوجود بہت سے مندرجات ایسے ہیں جو "وسطیٰ" میں تو موجود ہیں مگر "کُبریٰ" میں نہیں پائے جاتے۔ یہاں یہ لکھ دینا بھی ضروری ہے کہ "کبریٰ" کی ترتیب

بلحاظ زمانہ ہوئی ہے اور "وسطیٰ" کی ترتیب میں حروفِ تہجی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ایسی حالت میں ایسے اندراجات کو چھانٹ لینا جو بڑے تذکرے میں موجود نہ ہوں اور چھوٹے میں پائے جاتے ہوں باریک بینی اور خصوصی توجہ کے سبب ہی ہو سکتا ہے۔

اس مقالے میں مولانا عرشی نے بالاستیعاب دونوں تذکروں کا تقابل کیا ہے اور ۱ سے ۴۸ تک ترتیب وار ایسے اندراجات کا ذکر کیا ہے جو وسطیٰ میں تو پائے جاتے ہیں لیکن "کبریٰ" میں موجود نہیں۔ ص ۱۹ پر لکھتے ہیں کہ دونوں تذکروں میں کہیں کہیں سنین کے اختلافات بھی نظر آتے ہیں۔ (ظاہر ہے کہ اس کی یافت بھی سرسری مقابلے کا نتیجہ نہیں ہو سکتی) جن کو کاتب اور مؤلف دونوں میں سے کسی ایک کا سہو قلم کہا جا سکتا ہے۔ کچھ بھی ہو اس سب سے مولانا عرشی کے تحقیقی ذہن اور ان کی قوتِ مشاہدہ کا کافی ثبوت مل جاتا ہے۔

تذکرہ "صغریٰ" کا ذکر مولانا نے صرف چار سطروں میں کیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولانا کی نظروں سے نہیں گزرا۔

۱۲۔ ظہور الاسرار نامی اور مظہر کرتہ

یہ "معارف" اعظم گڑھ جولائی و اگست ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ موضوع ادبیات فارسی کی تحقیق ہے۔

مولانا عرشی نے اس مقالے میں ادب میں سرقے کی ایک بدترین مثال کی گرفت کی ہے۔

خواجہ نظامی گنجوی کی مثنوی "مخزن الاسرار" کی مختلف شرحیں لکھی گئی ہیں۔ انھیں میں سے ایک شرح "ظہور الاسرار نامی" ہے، جو مطبع نولکشور لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے۔ اس شرح کے دیباچے میں اس کے مصنف کا نام "ظہور الحسن بجوری" چھپا ہے۔ خاتمہ طبع میں مصحح کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ کارپردازانِ مطبع بھی اس بات سے مطمئن نہیں تھے کہ انھوں نے اس شرح کے مصنف کی صحیح نشاندہی کی ہے۔ کیونکہ ان کے مطابق جس نسخے سے یہ کتاب چھاپی گئی تھی اس کے دیباچے میں کسی نام کو مٹا کر ظہور الحسن نام لکھا گیا تھا۔ مگر کوئی دوسرا نسخہ نہ ملنے کے سبب شک کی تصدیق یا تکذیب نہ ہو سکی۔

مولانا عرشی نے اس بات کو پا لیا کہ یہ کتاب واقعتاً ظہور الحسن صاحب کی تصنیف نہیں ہے بلکہ اس میں اصل مصنف کا نام کاغذ سے محو کر کے ان کا نام لکھا گیا ہوگا۔ کتاب خانہ ریاست رام پور کے

ایک قلمی نسخے سے جب اس کو ملایا گیا تو دونوں کتابوں میں بہت معمولی سے اختلافات نظر آئے۔ ایک اور نسخے سے اس شرح کا محمد بلخی کی تصنیف ہونا بھی ثابت ہو گیا۔ اس لئے اس میں تو کوئی شک رہا ہی نہیں کہ کسی ظہور الحسن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

رہا مذکورہ شرح بلخی کا سالِ تصنیف۔ اس پر مولانا نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اشپرنگر کے مطابق یہ ۱۰۹۱ھ میں لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر ریو اور ایتھے نے بھی اس کی تصنیف کا قریب قریب یہی زمانہ ٹھہرایا ہے۔ مگر مولانا نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے اشپرنگر کی بنیادی غلطی کی نشاندہی کر کے طویل بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ یہ شرح مغربی محققین کے طے شدہ وقت سے تقریباً تین صدی قبل ۷۹۵ھ میں لکھی گئی تھی۔

اس کے بعد مولانا شارح کے نام کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس مقالے کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ یہی ہے۔ مولانا کے بیان کے مطابق اس کتاب کے عام نسخوں میں مصنف کا نام اس طرح درج ہے۔

"محمد بن قوام الدین بن رستم بن احمد بن محمود بدر الخزانہ البلخی المعروف بکرئی"۔

صاحبِ "کشف الظنون" نے عرفیت سے پہلے الفاظ کو "بدر البلخی" لکھا ہے۔ اشپرنگر نے وہی نام لکھا ہے جو عام نسخوں میں مندرج ہے۔ لیکن "بدر الخزانہ" کے سامنے نہ سمجھ سکنے کے سبب استفہامیہ لگا دیا ہے اور "بکرئی" کو مصنف کا عرف فرض کر لیا ہے۔ ڈاکٹر ریو کے نسخے میں "بدر الخزانہ" تھا جس کو انھوں نے قوسین میں درست کر لیا۔ نیز انھوں نے شارح کا عرف "الکرئی" یا "بکرئی" کے بجائے کرخی خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر ایتھے کے نسخے کو ناقابلِ اعتماد مان لیا اور "کرخی" کے حق میں ہو گئے۔ کتاب خانہ رام پور کے ایک قلمی نسخے میں یہ آخری لفظ "بکرئی" درج ہوا ہے اور یہیں کے ایک اور نسخے میں نام کے پہلے جزو یعنی محمد کی جگہ مطہر ہے۔ ان سب اندراجات کو نظر میں رکھتے ہوئے مولانا نے نام کے ہر جزو سے بحث کی ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے عرفیت کی بحث اٹھائی ہے۔

مولانا کی رائے میں یہ عرف "کرہی" یا "کرئی" ہے اور یہ کڑہ کی نسبت سے ہے۔ اس سے مراد کڑہ مانک پور ہے جو الہ آباد کے پاس واقع ہے۔ مولانا نے ثابت کیا ہے کہ بسا اوقات یائے نسبتی کا اضافہ ہونے پر آخری "ہ" ہمزہ میں بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہ یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ کڑہ مانک پور کے قدیم علما خود کو "الکرئی" بھی لکھا کرتے تھے۔ جہاں کہیں عرفیت "بکرہی" ہے وہ کاتب کے سہوِ قلم کے نتیجے میں "بکرئی" کی ہی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ "بکرئی" کی "با" کو حرفِ جار تسلیم کرنے میں بھی کوئی

ہرج نہیں معلوم ہوتا نیز اس شخص کا خاندان بلخ کا ہو سکتا ہے جس کے سبب وہ "البلخی" بھی لکھتا تھا۔

لفظ "بکری" کی ایک صورت بھکر سے نسبت بھی ممکن ہے۔ لیکن کسی نسخے میں "با" کے بعد ہائے مخلوطہ نہ ہونے کے سبب یہ نسبت نادرست قرار پاتی ہے۔

لقب کی تحقیق کرتے ہوئے مولانا "بدر الخزانہ" کو "بدر الدین" کی مسخ شدہ صورت مانتے ہیں۔ ان کے مطابق "الخزانہ" اور "الدین" میں مشابہت ہونے کے سبب کاتب سے یہ سہو ہوا ہے۔ لیکن راقم کو مولانا کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ "الخزانہ" یا "الحرانہ" میں "الدین" کے ساتھ مشابہت کا ہونا ناقابلِ تسلیم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ "الخزانہ" یا "الطرانہ" کا کوئی اور مطلب ہو یا یہ کسی اور لفظ کی بدلی یا بگڑی ہوئی شکلیں ہوں۔

جہاں کہیں بدر البلخی لکھا گیا ہے وہاں "الخزانہ" یا "الطرانہ" کا حذف عربی قاعدے پر قابلِ قبول ہے۔

عرفیت اور لقب کے بعد مولانا مصنف (یا شارح) کے اصل نام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے کتاب خانے کے نسخہ ۵۹ کو بنیاد مان کر طویل بحث اور متعدد مآخذوں کے حوالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ شخص زیرِ بحث کا اصل نام "بدر الدین مطہر بن قوام بن رستم بن محمود البلخی الکرئی" تھا جو فیروز شاہ تغلق کے عہد میں "مطہر کڑہ" کے نام سے مشہور شاعر تھا۔ اس کی پانچ عدد دیگر کتابوں کے نام بھی لکھے ہیں جن میں سے تین اب بھی دستیاب ہوتی ہیں۔

مولانا عرشی کی اس تحقیق سے کہ شارح مطہر بلخی اور شاعر مطہر کڑہ ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے سخت اختلاف کیا۔ انھوں نے مولانا عرشی کے دلائل کو درجِ مضمون فرما کر بدلائلِ قاہرہ اُن کی تردید کی۔ اسی عنوان سے پروفیسر نذیر احمد صاحب کا یہ مضمون ماہنامہ "معارف" اعظم گڑھ میں مولانا عرشی کے مضمون کی پہلی اشاعت سے تقریباً ۲۵½ سال بعد جنوری ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔

۱۳۔ تاریخِ محمدی اور اُس کے مؤلف کے احوال و آثار:

یہ مقالہ اگست ۱۹۴۲ء کے "معارف" اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا۔ اس کا موضوع فارسی تحقیق ہے۔

رضا لائبریری رام پور میں "تاریخِ محمدی" کا ایک نسخہ محفوظ ہے، جس کی وسعتِ معلومات سے

عرشی صاحب اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے بہ سعی بلیغ اس کو مرتب کرکے عام افادے کی غرض سے شائع کرادیا۔ مولانا کی رائے ہے کہ رام پور کا قلمی نسخہ خود مؤلف کے ہی قلم کا لکھا ہوا ہے۔

مقالے میں مصنف تاریخ محمدی محمد بن رستم حارثی بدخشی کے نام و نسب پر بحث کرتے ہوئے اُس کے حالاتِ زندگی بھی اجمالاً بیان کئے گئے ہیں۔ ساتھ ہی اس کے افرادِ خاندان سے ۳۸ کے نام، ان کا مختصر ذکر بھی تاریخ محمدی سے ہی نقل کرکے اُردو خوانوں کے لئے اُس کا ترجمہ بھی اُردو میں کر دیا ہے۔ سہولت کے خیال سے مرزا محمد (مؤلف تاریخ محمدی) کے دادھیال اور ننھیال کے خاندانی تجربے بھی مقالے میں درج کر دیئے ہیں۔ تعلیم و تصنیف کے تحت مرزا محمد کے ایک اُستاد اور مختلف علوم کے ساتھ اس کے لگاؤ کا ذکر کیا ہے۔ تصنیفات یا تالیفات کی تعداد چھ بتائی ہے، جن میں تاریخ محمدی کا ذکر بالتفصیل کیا ہے۔

تاریخ محمد کے سالِ تالیف کی بحث اس مقالے کا اہم ترین اور قابلِ قدر حصہ ہے۔ ڈاکٹر ریو نے اپنی فہرست میں سنہ ۱۱۹۰ھ کو اس کا سال اختتام بتایا ہے۔ مولانا عرشی کا کہنا ہے کہ ڈاکٹر ریو کو غلط فہمی ہوئی ہے اور اس غلط فہمی کا سبب تاریخ محمدی کا وہ نسخہ ہے جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہے کیونکہ اس میں سنہ ۱۱۹۰ھ تک کے قضیات لگاتار ایک ہی کاتب کے قلم سے لکھے گئے ہیں۔ مولانا کا یہ بھی خیال ہے کہ برٹش میوزیم کا مخطوطہ رام کے نسخے پر مبنی ہے۔ برٹش میوزیم کے نسخے کے سرورق پر جو نوٹ ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید آل رسول مارہروی نے اس کو تیار کرایا تھا۔ جب کہ نسخہ رام پور سید مہدی میاں مارہروی نے دربارِ رام پور میں پیش کیا تھا۔ مولانا کی اس رائے کی تائید کہ نسخہ لندن نسخہ رام پور کی نقل ہے اس بات سے ہو جاتی ہے کہ نسخہ لندن کی جلد دوم میں انھیں فقروں اور الفاظ کے لئے سادہ جگہ چھوڑی گئی ہے جو رام پور کے نسخے میں یا تو حاشیے کے ساتھ کٹ گئے ہیں یا پھر کاغذ کے گل جانے کے سبب پڑھے نہیں جاتے۔

اور نسخہ رام پور میں سنہ ۱۱۶۱ھ تک کے وفیات ایک قلم یا ایک کاتب کے ہاتھ کے مرہونِ منت ہیں۔ اس کے بعد یہ تحریر نظر نہیں آتی۔ اس لئے مولانا کی اس رائے کو نہ ماننے کا کوئی سبب نہیں کہ اس کتاب کا اختتام سنہ ۱۱۶۱ھ میں ہوا۔ مولانا نے یہ بھی پتا چلالیا کہ سنہ ۱۱۶۱ھ کے بعد کے وفیات مارہرہ شریف کے خاندانِ سادات کے بزرگواروں کے ہاتھ کے ہیں۔

مولانا سید مقبول احمد صمدنی کا ایک مضمون اس کتاب کے بارے میں "معارف" اعظم گڑھ

کے جنوری سنہ ۱۹۴۲ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ مولانا عرشی نے اس سے استفادہ کرکے ایک سال سنہ ۱۱۲۳ھ کے واقعات تاریخی کا مجمل بیان بھی نقل کر دیا ہے جو کسی اور نسخے سے مولانا صمدنی نے اخذ کیا تھا۔ رام پور یا لندن کے نسخے میں دس پانچ مقامات کو چھوڑ کر تاریخی بیانات نہیں ہیں۔ یہ دونوں نسخے صرف وفیات پر ہی مشتمل ہیں۔

مولانا نے مقالے میں نسخہ رام کی کیفیت بھی درج کر دی ہے۔ اس بات پر انتہائی افسوس کا اظہار بھی کیا ہے کہ جس شخص نے ہزاروں انسانوں کے وفیات تحقیق کرکے لکھے ہم آج اُس کی تاریخِ وفات سے لاعلم ہیں۔

۱۴۔ مولانا آصفی اور ان کی شاعری:

یہ مقالہ "مقالاتِ عرشی" کا آخری اور سب سے زیادہ طویل مقالہ ہے۔ یعنی ۴۷ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا موضوع فارسی شاعری ہے۔

اس کی ایک قسط سب سے پہلے "نیرنگ" رام پور کے اپریل سنہ ۱۹۲۶ء کے شمارے میں ملتی ہے۔ جو خاقانِ ہند قاآنی عصر حضرت آصفی نظامی مرحوم" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد کا کوئی شمارہ ایسا دستیاب نہیں ہوا جس میں مقالے کا بقیہ حصہ شائع ہوا ہو۔ ممکن ہے اس وقت ایک ہی قسط چھپ کر رہ گئی ہو۔ بعد کو یہ "نگار" لکھنؤ کے سنہ ۱۹۳۰ء کے پرچوں میں مکمل شائع ہوا۔

یہ مولانا عرشی کا اوائل عمر کا کام ہے۔ زیادہ سے زیادہ ۲۲ برس کی عمر رہی ہو گی جب اس کو لکھنا شروع کیا ہو گا۔ ایسے ہی مواقع پر یہ مثل بولی جاتی ہے "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات"۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ تنقیدی مقالہ ہے۔ تنقید بھی توضیحی، تاثراتی اور تقابلی۔ تمام تر رجحان مولانا آصفی کی فارسی شاعری بلکہ فارسی قصیدہ نگاری کے محاسن کے اظہار کی طرف پایا جاتا ہے۔ مولانا نے یہ ظاہر کیا ہے کہ ہند (موجودہ برِ صغیر) اور ایران کے شعراء میں مرزا حبیب قاآنی اور مرزا اسداللہ خاں غالب کے بعد اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ ہے عبدالجبار خاں آصفی نظامی ابنِ حافظ عبدالرزاق خاں رام پوری ہی ہیں۔ بلکہ مقالے سے یہ تاثر بھی ملتا ہے کہ فطرت کی جانب سے جو کمالِ شاعری آصفی کو ودیعت ہوا اس سے ان کا محبوب ترین شاعر غالب بھی محروم رہا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک طرح سے مولانا آصفی کی مدلل مداحی ہے۔

حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری نے جب "تذکرہ کاملانِ رام پور" ترتیب دینا چاہا تو مولانا آصفی

کو بھی (دکن) ایک خط اُن کے حالات جاننے کے لئے لکھا تھا۔ جواب میں مولانا آصفی نے اپنے مختصر حالات زندگی اور تصنیفات کی تفصیل لکھ بھیجی تھی۔ اس خط تک مولانا عرشی کی بھی رسائی ہوگئی۔ وہی ان کے اس مقالے میں شامل حالاتِ زندگی اور تفصیلِ تصنیفات کا ماخذ بنا۔ اس مقالے کو اس حد تک تحقیقی بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس میں آصفی کے سالِ ولادت کی تصحیح کی گئی ہے جو "تذکرہ کاملانِ رام پور" میں غلط شائع ہوگیا تھا۔ اور ان کی تصنیفات سے بحث کی گئی ہے جو تعداد میں ۱۹ ہیں۔

مولانا نے مقالے کے شروع میں تمہیدی طور پر گہرائی کے ساتھ سیاسی، تاریخی اور علمی پس منظر میں فارسی ادب کے عروج و زوال کا جائزہ لیا ہے۔ یہ حصہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مولانا کی زبان اور بیان کا رچاؤ یہاں پر قابلِ داد و تحسین ہے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مولانا عرشی صاحب اعداد و شمار کے ہی محقق نہیں تھے بلکہ وہ اس درجے کے نثر نگار بھی تھے جو اپنے قارئین کے ذوق کو فرحت اور سامانِ انبساط فراہم کرتا ہے۔ ان کا شگفتہ نگار قلم یہاں پر ایک شگوفہ زار کھِلاتا ہوا رواں دواں ہوا ہے۔ رہی اس حصۂ مقالہ میں ان کی وسعتِ معلومات اور تاریخ پر عبور ہونے کی بات تو اس کے بارے میں کچھ کہنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔

حافظ احمد علی خاں صاحب شوق رام پوری کے نام مولانا آصفی کے خط کو ماخذ بنا کر عرشی صاحب نے ان کے حالاتِ زندگی پر بھی تفصیل کے ساتھ دل آویز انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

مولانا آصفی کی قصیدہ نگاری پر ریویو ایک سو سات صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں قصیدے کے اجزا و ترکیبی کو الگ الگ لے کر آصفی صاحب کے کلام سے بڑی کثرت کے ساتھ مثالیں دی ہیں۔ فارسی اساتذہ کے مضامین کے ساتھ ان کے مضامینِ شعری کا موازنہ کیا ہے۔ اشعار کی مفصل شرحیں درج کی ہیں۔ رموز و نکات کی نقاب کشائی کی ہے۔ صنائعِ شعری کو بھی ظاہر کیا ہے۔ مزید کچھ کہنا چاہتے تھے مگر مقالے کی طوالت مانع آئی۔ آخر میں رقم طراز ہیں۔

"تبصرے کے ان صفحات میں مولانا آصفی کے قصائد کے اجزا اور خصوصیات کا ہر ہر پہلو روشن ہوچکا ہے۔ بات حد سے زائد بڑھ گئی۔ اس لئے ہم علیحدہ علیحدہ تخیل، تشبیہ، زور اور چستی وغیرہ کی مثالیں نہیں دیں گے۔"

مولانا عرشی کا یہ مقالہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ جتنے اعلیٰ پائے کے محقق تھے اُس سے

کم درجے کے نقاد نہیں تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن کا رُجحان زیادہ تر تحقیق کی جانب ہی رہا ہے، جو تنقید کے مقابلے میں بہرحال مشکل اور اہم ہے۔

مولانا عرشی کے سو سے زیادہ مضامین زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکے ہیں۔ ۱۹۷۰ء میں جب یہ کتاب "مقالاتِ عرشی" چھپی، اُس وقت بھی مولانا کے تقریباً ۸۰ مضامین شائع ہوچکے تھے۔ لیکن مجلسِ ترقی ادب لاہور نے ان میں سے صرف ۱۴ مضامین کس معیار کو پیشِ نظر رکھ کر انتخاب کئے، یہ مجلس کے اربابِ عقد و حل ہی جانتے ہوں گے۔ جو مضامین شامل مجموعہ ہیں ان میں موضوعاتی یکسانیت کا خیال رکھا گیا ہے، اور نہ اس بات کا کہ مضامین ایک ہی زمانے کے ہوں۔ اس مجموعے میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۱ء تک یعنی ۳۱ سال کی مدت میں لکھے ہوئے مضامین شامل ہیں۔ واضح ہو کہ ۱۹۶۱ء تک بھی مولانا عرشی کے تقریباً ۶۵ مضامین شائع ہوچکے تھے۔ ان میں سے ان چودہ مضامین کا انتخاب کس معیار کو پیشِ نظر رکھ کر کیا گیا ہے اس بابت کچھ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔

بہرحال ان چودہ مضامین سے ہی مولانا عرشی کی مقالہ نگاری کا بلند معیار واضح ہوجاتا ہے۔

غالب شناسی میں ایک اہم اضافہ

تفہیمِ غالب

قدیم و جدید شعریات کی روشنی میں غالب کے منتخب اشعار کی شرح

شمس الرحمٰن فاروقی

قیمت : ۹۰ روپے

ملنے کا پتا :

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

ڈاکٹر شریف حسین قاسمی

تاریخِ محمدی

تاریخ محمدی مصنفہ میرزا محمد بن رستم مخاطب بہ معتمد خان بن قباد مخاطب بہ دیانت خان حارثی بدخشی دہلوی ایک اہم تاریخی دایرۃ المعارف ہے۔ اس میں ہجری سال کے آغاز سے ۱۱۶۱ ہجری/۱۷۴۸ عیسوی تک کے چند ہزار اہم اور غیر معروف اشخاص کی وفات اور بعض تاریخی، ادبی اور سماجی امور کا اجمالی ذکر ہے۔ یہی سال غالباً مصنف کی وفات کا سال بھی ہے۔

فارسی میں اس تاریخی دستاویز کی جلد دوم کا چھٹا حصہ، ہندستان کے معروف عالم، محقق اور دانشور جناب امتیاز علی عرشی مرحوم نے تصحیح و تحشیہ کے بعد، شعبۂ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے شائع کیا ہے۔ اس حصہ میں مصنف نے اپنے معاصر یعنی بارھویں صدی ہجری کے اہلِ علم، وزرا، امرا، ان کے متعلقین کی وفیات کا سال بہ سال ذکر کیا ہے۔ عرشی صاحب مرحوم نے ایک سو چوالیس (۱۴۴) صفحات کے اس متن پر ستاسی (۸۷) صفحے کے تعلیقات کا اضافہ کیا ہے۔ ان تعلیقات کی ترتیب میں چورانوے (۹۴) اہم منابع سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ اشاعت رضا لائبریری، رام پور میں موجود، تاریخ محمدی کے اس خطی نسخے پر مبنی ہے جو بقول مرتبِ مرحوم، خود مصنف کا کتابت کردہ ہے۔

تاریخ محمدی کو عرشی صاحب مرحوم نے تدوین و ترتیب کے تمام مروجہ اصولوں کی بنیاد پر مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب جہاں مصنف کی دقت نظری اور اعلا علمی صلاحیتوں کی مظہر ہے، وہاں خود مرتب کے تبحرِ علمی، وسیع معلومات اور محققانہ جدّ و جہد کا بیّن ثبوت بھی ہے۔

عرشی صاحب نے رضا لائبریری میں محفوظ تاریخ محمدی کے اُس خطی نسخے کو تدوین متن کے لیے بنیاد بنایا ہے جو بقولِ مرتب، خود مصنف کا مکتوبہ ہے۔ چونکہ اس مخطوطے کے بعض حصے، خاص طور پر حاشیے کے قریب عبارتیں کرم خوردگی کی وجہ سے اب مکمل طور پر پڑھی نہیں جاتیں، اس لیے عرشی صاحب نے برٹش میوزیم میں محفوظ تاریخ محمدی کے دو خطی نسخوں سے اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت حال

میں یہی کیا جاتا ہے۔

عرشی صاحب نے اپنے مرتبہ متن کے حواشی (پاورق) کو اختلافِ نسخ کی نشان دہی تک محدود رکھا ہے۔ اگر متن میں خود اپنی طرف سے کسی لفظ یا عبارت کا اضافہ کیا ہے تو اسے قوسین میں رکھا ہے اور حاشیے میں "اضافہ از مصحح" لکھ کر اس کی وضاحت کر دی ہے۔ بنیادی نسخۂ خطی میں بعض عبارتیں ایسی بھی موجود ہیں، جن کا خط اصل نسخہ کے خط سے متغایر ہے۔ اس طرح کی تمام تحریروں یا اضافوں کو مرتبِ مرحوم نے حاشیے میں نقل کیا ہے۔ انھیں متن میں جگہ نہیں دی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ متن، جیسا کہ عرض کیا گیا، خود مصنف کا کتابت کردہ ہے۔ ایسی صورت میں اگر متن میں اضافہ اُس خط میں نہیں جو متن کا، یا یوں کہیے کہ خود مصنف کا خط ہے، تو ظاہر ہے یہ اضافے بعد میں کیے گئے ہیں، جن کا تعلق مصنف سے نہیں۔ مثلاً میر نور اللہ کا ذکر متن میں خود مصنف کے قلم سے صرف اِس قدر ہے :

میر نور اللہ بن میر فیض اللہ بن میر ابوالعلاءِ احراری، از علمای عصر، صدر دہلی بود و ہم بہ دہلی فوت شد۔

اس عبارت کے بعد اسی جگہ ایک دوسرے خط میں اِن الفاظ کا اضافہ ہے :

شارح مثنوی و گلستان

عرشی صاحب نے اس جملے کو حاشیے میں "بخطِ غیر" کے عنوان سے جگہ دی ہے۔ ممکن ہے میر نور اللہ بن میر فیض اللہ مثنوی معنوی اور گلستان سعدی کے شارح ہوں، لیکن بہر حال اتنا معلوم ہے کہ خود مصنف ان کے بارے میں یہ اطلاع دینا نہیں چاہتا تھا یا اسے میر نور اللہ مذکور کے مثنوی اور گلستان کا شارح ہونے کی اطلاع نہیں تھی۔ اس لیے اس جملے کو متن میں رکھنا کسی بھی صورت میں مناسب نہیں تھا چونکہ تنقید یا تدوینِ متن کا اصل مقصد، متن کو حتی الامکان ۔۔۔۔ اس کے اصل روپ میں پیش کرنا ہے، یعنی وہ روپ جو مصنف نے اپنے متن کو دیا تھا۔

عرشی صاحب نے صرف ایک آدھ جگہ حاشیے پر اس اختلاف کی نشان دہی بھی کر دی ہے جو ایک ہی واقعے کے بارے میں، متن میں دو یا دو سے زیادہ مقامات پر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر میر محمد معظم کی والدہ نور سا بانو کی وفات کا ذکر ۱۰۸۱ھ کے تحت کیا گیا ہے۔ مصنف جب خود میر معظم کا ذکر کرتا ہے جو ۱۱۱۰ھجر میں فوت ہوا، تو ضمنی طور پر ان کی والدہ کا سالِ وفات ۱۰۸۱ھجر لکھتا ہے جو خود اس کے پہلے بیان سے مختلف ہے۔ اس نوعیت کے اختلافات کی نشان دہی بھی مرتبِ مرحوم نے حاشیے میں کی ہے۔ حاشیہ بہر حال متن کے صرف چند ہی صفحات پر

نظر آتا ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ متن اس قسم کے داخلی اختلافات سے محفوظ ہے۔

عرشی صاحب مرحوم نے تاریخ محمدی میں جن تعلیقات کا اضافہ فرمایا ہے، اس پر محض ایک سرسری نظر ہی اس حقیقت کا ٹھوس ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ مرتبِ مرحوم ایک وسیع مطالعے کے انسان تھے۔ بے شمار کتابوں کی نوعیت و ماہیت سے واقف تھے۔ آپ نے ان تعلیقات کی ترتیب میں، جیسا کہ اوائل میں عرض کیا گیا ہے، چورانوے (۹۴) مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔

یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ خود مصنف نے ہر شخص کا احوال لکھنے کے بعد اپنے مراجع اور مآخذ کا بڑی پابندی سے ذکر کیا ہے۔ عرشی صاحب نے متن میں شامل مختلف اشخاص کے بارے میں، جن کی حیثیتیں مختلف تھیں، کوئی امیر تھا اور کوئی وزیر، کوئی شاعر تھا کوئی ادیب، کوئی عارف تھا اور کوئی عالم، کوئی سپاہی تھا اور کوئی موسیقی داں اور بعض خواتین بھی، خود اپنے مآخذ سے جو مصنف کے مآخذ سے مختلف ہیں، تفصیلی اطلاعات نقل نہیں کی ہیں، بلکہ صرف مآخذ کی نشان دہی کر دی ہے۔ کہیں کہیں تاریخوں کے اختلاف کو ضرور درج کر دیا ہے۔ اسی طرح آپ نے ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کا ذکر اگر متن میں مختلف تاریخوں کے تحت ہوا ہے تو ان سب حضرات کی اپنے تعلیقات میں ایک ہی جگہ نشان دہی کر دی ہے۔ اس طرح قاری ایک خاندان کے مختلف افراد کے بارے میں عرشی صاحب کی کوششوں کی وجہ سے اطلاعات حاصل کر سکتا ہے۔

راقم نے ابھی عرض کیا ہے کہ عرشی صاحب نے تعلیقات، کے تحت متن میں مذکور افراد و اشخاص کے بارے میں مزید اطلاعات حاصل کرنے کے لیے، بعض منابع کا ذکر کیا ہے۔ وہ ان مآخذ سے متعلقہ شخص یا واقعہ سے متعلق کوئی عبارت عام طور پر نقل نہیں کرتے، صرف ماخذ کا ذکر کرتے ہیں، ان کا نام درج کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر کوئی قاری متعلقہ شخص کے بارے میں مزید معلومات اخذ کرنا چاہتا ہے تو تعلیقات میں مرقوم منابع و مآخذ سے خود استفادہ کرے۔ عرشی صاحب نے نئے مآخذ کی بنیاد پر اپنے تعلیقات کو ایسی ضروری اطلاعات سے بھی گراں بار نہیں کیا جو متن میں موجود نہیں۔ مرتبِ محترم غالباً یہ چاہتے تھے کہ جب ان کی مرتبہ تاریخ محمدی شائع ہو تو وہ مناسب حجم سے متجاوز نہ ہو۔ ایسی صورت حال میں مجھ جیسے طالب علم کو جو دشواری ہو گی اس کا اظہار بےجا نہیں۔

عرشی صاحب کے منابع اور مآخذ میں متعدد ایسی کتابیں شامل ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر گمانِ غالب یہی ہے کہ فارسی کے یہ مآخذ جلد ہی شائع بھی نہ ہوں گے اور اس طرح ہماری دسترس سے دور رہیں گے۔ ایسی غیر مطبوعہ کتابوں میں مثلاً ایک ریاض الشعرا مصنفہ علی قلی والہ داغستانی ہے۔ یہ ایک ضخیم تذکرہ ہے۔ اس کے جلد شائع ہونے کا امکان نظر نہیں آتا۔ اِس تذکرے کا خطی نسخہ ہر کتاب خانے میں موجود

نہیں۔ عرشی صاحب نے اس کا متعدد جگہ حوالہ دیا ہے، لیکن اس سے اخذ و اقتباس نہیں کیا چونکہ تاریخ محمدی کے تعلیقات میں یہی ان کا طریقہ کار تھا غالباً ہر شخص کے لیے یہ ممکن نہیں کہ تاریخ محمدی کے تعلیقات میں اس تذکرے کے محض ذکر اور حوالے کی بنیاد پر وہ اس تذکرے سے ضروری اطلاعات کی فراہمی کے لیے دور یا نزدیک کا سفر کرے۔ اس لیے خاص طور پر فارسی کتابوں کی طباعت و اشاعت کی صورتِ حال کے پیشِ نظر، ایک مرتب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تعلیقات میں کم از کم غیر مطبوعہ مآخذ سے ضروری اور بنیادی اطلاعات نقل کر دے تاکہ ضرورت کے وقت ان تعلیقات سے خاطر خواہ استفادہ کیا جا سکے۔

اس وقت ایک دوسرے پہلو کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے۔

فارسی زبان اور ادب کے میدان میں کام کرنے والوں کا بنیادی اور اولین فرض یہ ہے کہ وہ غیر مطبوعہ متون کی تدوین و ترتیب اور اشاعت کی طرف خاص توجہ دیں۔ اس کے بغیر ہماری تحقیق اور تدوین و ترتیب کی بیشتر کوششیں تشنۂ تکمیل رہیں گی۔ اس ضمن میں بھی خود تاریخ محمدی مرتبہ عرشی صاحب مرحوم سے ہی ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

تاریخ محمدی کا وہ مخطوطہ جو مرتب کے پیشِ نظر تھا، ایک لحاظ سے ناقص ہے۔ اس میں چند جلے نسخے کی کرم خوردگی کی وجہ سے مکمل طور پر پڑھے نہیں جا سکے۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے مرتب نے کتاب کے دوسرے دست یاب خطی نسخوں سے مدد لی ہے۔ اس کے باوجود ابھی بعض مقامات پر الفاظ و عبارات مکمل نہیں کی جا سکیں۔

راقم حروف نے سیر المنازل کا فارسی متن مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب اردو ترجمے کے ساتھ ایوان غالب سے شائع ہوئی ہے۔ سیر المنازل کے حواشی کی ترتیب میں تاریخ محمدی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک مقام پر خود مطبوعہ تاریخ محمدی میں ایک مفقود نام کی نشان دہی بھی سیر المنازل کی مدد سے ہو گئی۔ یہ نام عرشی صاحب مرحوم کے پیشِ نظر خطی نسخے میں کرم خوردگی کی وجہ سے موجود نہیں۔

مطبوعہ تاریخ محمدی کے صفحہ ۱۳۰ پر درج ذیل عبارت مرقوم ہے:

...... بنت حسن بیگ مخاطب بہ صف شکن خاں، زوجۂ معز الدولہ حیدر قلی خان بہادر ظفر جنگ و والدۂ پسرانش حیدر قلی خان و جعفر قلی خان، اوائل عشرۂ ثالثۂ صفر در شاہجہان آباد فوت شد۔

اس عبارت میں حسن بیگ مخاطب بہ صف شکن خان کی لڑکی اور معز الدولہ حیدر قلی خان کی زوجہ

کی تاریخ وفات بیان کی گئی ہے، لیکن اس خاتون کا نام موجود نہیں جس کی تاریخ وفات درج کرنا مصنف کا مقصد ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ محمدی کے درج بالا اقتباس میں حسن بیگ مخاطب بہ صف شکن خان، معز الدولہ حیدر قلی خان بہادر ظفر جنگ، حیدر قلی خان اور جعفر قلی خان کے نام ملتے ہیں۔

حسن بیگ مخاطب بہ صف شکن خان فرخ سیر کے میر آتش تھے۔ یہ فرخ سیر اور جہاندار شاہ کے درمیان ہونے والی جنگ کے دوران ۱۳؍ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء میں مارے گئے۔ (تاریخ محمدی: ۳۱)

"معز الدولہ حیدر قلی خان بہادر ظفر جنگ" یہ خطاب آقا محمد رضا اسفرائینی کو دیا گیا تھا جو محمد شاہ کے میر آتش تھے۔ یہ نہایت سخت گیر منصب دار تھے۔ اپنی بیوی کے ساتھ خس خانے میں سوتے ہوئے، آگ سے جل گئے اور کچھ مدت بعد پچاس سال سے زیادہ عرصے تک زندہ رہ کر شبِ جمعہ ۱۴؍رمضان ۱۱۳۷ھ/۱۷۲۴ء کو شاہجہان آباد میں فوت ہوئے۔ (تاریخ محمدی: ۶۲، منتخب اللباب ج ۲: ۹۷۳) چاندنی چوک دہلی میں مسجد فتح پوری کے نزدیک حویلی حیدر قلی غالباً انھی کے نام سے موسوم رہی ہو گی۔

خود تاریخ محمدی میں معز الدولہ کے دو لڑکوں کی وفات کا ذکر موجود ہے۔ ان کا ایک لڑکا محمد عسکری، محمد شاہی امرا میں شامل تھا اور ۱۱۵۰ھ/۸-۱۷۳۷ء کے اواخرِ محرم میں شاہجہان آباد میں فوت ہوا (مآثر الامرا ج ۳: ۴۷۶، یہاں ان سے متعلق تفصیلی حالات تحریر ہیں؛ سیر المتاخرین ج ۲: ۴۵۹) ان کا دوسرا لڑکا محمد کاظم تھا۔ یہ بھی اپنے زمانے کا ایک امیر تھا اور فتح علی خان بن ثابت خان کے خلاف جنگ میں ۷ رجب ۱۱۵۱ ہجری/ ۹-۱۷۳۸ء میں مارا گیا۔ ان دونوں میں بڑا کون تھا، اس کا علم نہیں ہو سکا۔

تاریخ محمدی کے درج بالا اقتباس میں معز الدولہ کے دو لڑکوں کے نام تحریر ہیں۔ ایک حیدر قلی خان اور دوسرا جعفر قلی خان۔ گمان غالب یہ ہے کہ محمد عسکری اور محمد کاظم کو حیدر قلی خان اور جعفر قلی خان کے خطابات سے نوازا گیا ہو گا۔

دہلی میں علاقہ موتیا کھان کے عقب میں ایک بستی "حبش پورہ" ہے۔ اس آبادی میں ایک مسجد واقع ہے اس کا ذکر سیر المنازل میں شامل ہے اور اس کا درج ذیل کتبہ بھی سیر المنازل میں نقل ہوا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم　　　لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

در عہدِ محمد شاہ ۱۲۲۴ ہجری برای ثواب بخشیدن نواب معز الدولہ بہادر و بی بی ارجمند خانم و نواب کاظم خان مرحوم، ہر کس کہ نماز بخواند، ثواب بایں ہر سہ ارواح بخشد و ہر کہ خدمتِ اینجا را قبول کند، شرط اینست: چیزیکہ در سال از اینجا پیدا شود، اوّل عرس نواب معز الدولہ بکند، چہار دہم رمضان المبارک و عرس

بی بی ارجمند خانم بکند، ہفتم ماہ صفر و عرس نواب کاظم خان مرحوم ہفتم ماہِ رجب۔ اگر بریں شرط قبول کند و در خدمت عمل نکند بر و طلاق است۔ و ہر روز چراغ ناغہ نشود و ہر شب جمعہ شیر بنج و گلہای فاتحہ کند و مالک ایں مسجد و چاہ میرزا مہدی علی خان بہادر ولد نواب کاظم خان بہادر بن معز الدولہ بہادر، بی بی دیانت نسار خانم والدۂ میرزا مہدی علی خان، خرچ اخراجات ہمہ در قبض و تصرّف اوشان است۔ (سیر المنازل: ۵۲)

تاریخ محمدی سے درج بالا اقتباس اور اس سے متعلق ضروری تشریحات کے پیش نظر یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ سیر المنازل میں منقول اس کتبے کا تعلق آقا محمد رضا اسفرائینی مخاطب بہ معز الدولہ حیدر قلی خان بہادر ظفر جنگ سے ہے۔ دیگر قابل توجہ امر یہ ہے کہ معز الدولہ کی زوجہ کا نام بی بی ارجمند خانم تھا، جو تاریخ محمدی کے مطابق ۱۱۵۸ھ میں صفر کے اوائل عشرۂ ثالثہ میں فوت ہوئیں۔ فارسی کتبے کے مطابق ان کی قطعی تاریخ وفات ۷ صفر ہے۔

مطبوعہ تاریخ محمدی میں معز الدولہ کی زوجہ کا نام کرم خوردگی کی نظر ہوگیا جو اس کتبے کی مدد سے معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فارسی کتبے سے محمد کاظم خان کی زوجہ بی بی دیانت نسار خانم اور ان کے لڑکے میرزا مہدی علی خان کے ناموں کا علم بھی ہوتا ہے۔

چونکہ سیر المنازل کے خطی نسخے عام نہیں اور عرشی صاحب مرحوم بھی اسی وجہ سے اس کا مطالعہ نہ کر سکے اس لیے اس ماخذ یا کسی اور ماخذ کی مدد سے وہ معز الدولہ کی زوجہ کا نام قاری کو نہ بتا سکے اور مطبوعہ متن میں نام کی جگہ خالی چھوڑ دینے پر مجبور ہوئے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہمارا اہم ترین فرض ہے کہ ہم فارسی متون کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی کوشش کریں، تاکہ تحقیق کا کام جاری رہے۔ تحقیق جسے عملِ مسلسل کہا جاتا ہے، نئے منابع و مآخذ کے منظرِ عام پر آئے بغیر جاری ہی نہیں رہ سکتی۔ یہی منابع اور مآخذ ایک محقق کے ایسے وسائل ہیں جن کی مدد سے وہ مختلف امور کی تحقیق کرتا ہے۔

شبیر علی خاں شکیب

عرشی صاحب' کچھ یادیں کچھ باتیں

مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم کی ذات مجموعۂ صفات تھی۔ آپ عربی، فارسی اور اردو کے عالم و فاضل، محقق و نقاد، ادیب و شاعر اور ماہر غالبیات کی حیثیت سے ممتاز مقام کے مالک تھے۔ بلند پایہ مصنف ہونے کے ساتھ عمدہ مقرر بھی تھے۔ مشہورِ زمانہ رضا لائبریری رام پور کے سنوارنے اور بنانے کے سلسلے میں آپ نے زندگی بھر جو خدمات بہ حیثیت ناظم، لائبریری اور ڈائریکٹر انجام دیں وہ مثالی کہی جاسکتی ہیں۔ ان کی تہہ دار شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر متعدد حضرات روشنی ڈال چکے ہیں۔ راقم الحروف نے ان کے علمی و تحقیقی کارناموں کے ذکر کے بجائے، اپنے ذاتی مراسم اور یادوں کے سہارے موصوف کی دلکش شخصیت اور سیرت کے بعض پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی حقیر کوشش کی ہے اور اسی کی فرمائش بھی کی گئی تھی۔

یادوں کا بھی عجب معاملہ ہے، جب آتی ہیں تو قیودِ زمانی سے بے نیاز ایک ریلے کی صورت میں نازل ہوتی ہیں اور ان کا سمیٹنا اور تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر پچاس برس کی مدت بھی کچھ کم نہیں ہوتی۔ ہزار یادیں' ہزار باتیں۔ لیکن جیسا کہ عرشی صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "سیمینار یا جلسے میں پڑھے جانے والے مضمون کو ایسا نہ ہونا چاہیے۔ کہ سننے والوں کو اپنے بیوی بچوں کی یاد ستانے لگے"۔ میں نے حتی الامکان اس کا لحاظ رکھا ہے۔

عرشی صاحب کی ولادت تو اُن کے آبائی مکان واقع پھلواڑ میں ہوئی تھی لیکن وہ کمسنی ہی میں اپنے والد ڈاکٹر مختار علی خاں صاحب کی منتقلی مکان کے باعث محلّہ باغ پختہ کے گھیر الف خاں میں آگئے۔ ہمارے خاندانی مکانات قریب کے گھیر مبارک شاہ خاں میں تھے۔

عرشی صاحب اور میرے بڑے بھائی مُشتبر علی خاں عرف تبو صاحب دونوں ہم عمر تھے۔ مزاج اور مذاق کے اعتبار سے دونوں میں کافی یکسانیت تھی یہی سبب تھا کہ دونوں میں گہری دوستی ہوگئی جو تاعمر قائم رہی۔

عرشی صاحب کی تعلیم کے بارے میں اُن کے ایک دوسرے دیرینہ دوست حکیم نبی احمد خاں نے ایک دل چسپ واقعہ سُنایا جب وہ لاہور سے عرشی صاحب کی تعزیت کی غرض سے رام پور آئے ہوئے تھے۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ جب میں رام پور کے مدرسہ مطلع العلوم میں عربی کا طالب علم تھا، ایک دن چودہ پندرہ برس کا ایک لڑکا مدرسے کے صحن میں آکر کھڑا ہوا اور عمارت کو بغور دیکھنے لگا۔ مولوی صاحب کی بھی اس پر نظر پڑی، اُنھوں نے مجھے حکم دیا کہ اسے بلاؤ۔ میں بلا کر لایا۔ مولوی صاحب نے دریافت کیا کہ میاں آپ کیا دیکھ رہے ہیں، لڑکے نے جواب دیا کہ مدرسہ کو دیکھ رہا تھا۔ مولوی صاحب نے مسکرا کے فرمایا کہ مدرسہ تو پڑھنے کی جگہ ہے، دیکھنے کی چیز نہیں۔ لڑکے نے کہا میں پڑھنا ہی چاہتا ہوں۔ مولوی صاحب نے والد صاحب کا نام پوچھا تو اس نے ڈاکٹر مختار علی خاں کا نام بتایا۔ مولوی صاحب نے کہا بھئی تم تو عالموں کے خاندان سے ہو۔ کل والد صاحب کو لے آنا۔ داخلہ ہو جائے گا اور دوسرے دن اس کا داخلہ ہوگیا۔ یہ لڑکا عرشی صاحب تھے۔ حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ میں عرشی صاحب سے عمر میں چار برس بڑا تھا اور دو درجے آگے تھا۔ لیکن عرشی صاحب بے حد ذہین اور محنتی تھے۔ اُنھوں نے سخت محنت کی اور ابتدائی درجوں میں جلد جلد ترقی پاکر میرے ہم سبق ہوگئے۔ ہماری دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔

تعلیم سے فارغ ہوکر عرشی صاحب اور حکیم صاحب نے ایک جرمن کمپنی کی ایجنسی لے کر پہلے لکھنؤ بعدہٗ رام پور میں تجارت بھی کی لیکن نقصان کے پیشِ نظر اسے چھوڑنا پڑا۔ کچھ دنوں ندوہ سے بھی منسلک رہے۔ لکن یہ دونوں کام ان کے مزاج کے مطابق نہ تھے۔ بالآخر رام پور اسٹیٹ لائبریری (موجودہ رضا لائبریری) میں ۱۹۳۲ء میں وہ بحیثیت ناظم لائبریری ملازم ہوگئے۔ جہاں وہ بعد میں لائبریرین اور ڈائریکٹر کے عہدوں پر فائز رہے۔

ناظم لائبریری کی جگہ کس طرح ملی، اس واقعہ سے بھی ان کی خود اعتمادی اور قوتِ ارادی

پر روشنی پڑتی ہے۔ مطالعہ کی غرض سے انہیں لائبریری اکثر جانا پڑتا تھا۔ اسی دوران میں ناظم لائبریری کی خالی جگہ کے لیے درخواستیں طلب کی گئیں۔ عرشی صاحب نے بھی درخواست دے دی۔ لیکن درخواست گزاروں کا انٹرویو اور تقرر ایک منسٹر ابو محمد صاحب کے سپرد تھا۔ جو غیر مقامی ہونے کے علاوہ کچھ سخت مزاج بھی تھے۔ چنانچہ انٹرویو کے آغاز میں اُن کا پہلا جملہ ہی کافی ہمت شکن تھا یعنی رام پور میں ایسا کون شخص ہے جو اس عظیم ذمّے داری کو اٹھا سکتا ہے۔ مگر عرشی صاحب نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے لائبریری کی موجودہ خرابیوں اور ان کی اصلاح کے بارے میں جب اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کیے تو ابو محمد صاحب نرم پڑتے گئے اور توجہ سے ان کی باتیں سننے لگے، یہاں تک کہ آخر میں وہ ناظم کی جگہ کے لیے منتخب ہوگئے۔

اسی زمانے میں امپیریل لائبریری کلکتہ کے ریٹائرڈ لائبریرین مسٹر جے۔ اے چیپ مین لائبریرین مقرر ہوکر رام پور آگئے۔ اس طرح عرشی صاحب کو چیپ مین کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے جس محنت اور لگن سے لائبریری کے نظام کو درست کیا، اس سے چیپ مین بے حد متاثر ہوئے اور یہ ساتھ دوستی میں بدل گیا۔

چیپ مین کی صحبت میں رہ کر عرشی صاحب کی انگریزی کی استعداد میں کافی اضافہ ہوا۔ کیونکہ ہر وقت انگریزی میں گفتگو کرنا اور رپورٹیں تیار کرنا پڑتا تھا۔ نیز خدا بخش لائبریری پٹنہ میں کیٹیلاگنگ (فہرست سازی) کا جو کام ہو رہا تھا، اس کی ایک نقل چیپ مین کے پاس بغرض منظوری آتی تھی جسے وہ عرشی صاحب کے سپرد کر دیتے تھے، عرشی صاحب رضا لائبریری کی کتابوں کی مدد سے رپورٹ میں جو غلطیاں ہوتیں ان کی نشاندہی کرکے چیپ مین کو دے دیتے۔ جب یہ فہرستیں پٹنہ واپس کی جاتیں تو عرشی صاحب کے اعتراضات درست نکلتے۔ عرشی صاحب نے بعد میں رضا لائبریری کی کتابوں کی جو اعلیٰ درجے کی فہرست سازی کی، اس میں یہ تجربہ بہت کام آیا۔

بہت کم لوگوں کو چیپ مین اور عرشی صاحب کے تعلقات کا صحیح علم ہے، چیپ مین محض ایک قابل لائبریرین ہی نہ تھے، انگریزی کے عمدہ ادیب و شاعر بھی تھے۔ یہ عرشی صاحب

کی صحبت ہی کا اثر تھا کہ انھیں مشرقی ادب سے گہرا لگاؤ پیدا ہوا۔ رضا لائبریری میں عمر خیام کی رباعیات کا ایک قیمتی نسخہ ملا۔ عرشی صاحب نے چیپ مین کو دکھایا اور انگریزی میں باعیات کا فارسی سے انگریزی نثر میں ترجمہ کر کے چیپ مین کو پیش کیا جسے انھوں نے انگریزی میں نظم کر کے اپنے شعری مجموعے " دی رام پور انتھالوجی" کا آغاز کیا۔ اس مجموعے کے پہلے نصف حصّے میں عمر خیاؔم کی رباعیات کے علاوہ فارسی اور اردو کے دیگر شعرار حافظؔ، رومیؔ ابوسعید ابوالخیرؔ، سرمدؔ، عالمگیرؔ، غالبؔ اور حالیؔ کے علاوہ وغیرہم کی رباعیات، قطعات اور غزلیات کے منظوم ترجمے شامل ہیں بقیہ نصف حصّے میں خود چیپ مین کی نظمیں ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۳ء میں مکمل ہوا اور ۱۹۳۴ء میں آکسفورڈ پریس لندن نے شائع کیا۔

مجھے اس مجموعے کی اُس کاپی کو دیکھنے کا موقع ملا ہے جو چیپ مین نے عرشی صاحب کو دی تھی۔ دیباچے کے علاوہ کتاب پر چیپ مین نے اپنے قلم سے جو عبارت لکھی ہے اس میں بھی عرشی صاحب کی مدد کا بڑے خلوص سے اظہار کیا ہے :۔

" امتیاز علی عرشیؔ، ناظم صاحب رام پور اسٹیٹ لائبریری کی نذر۔

ممنونِ کرم جے۔ اے۔ چیپ مین لائبریرین کی جانب سے۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۴ء"

اس کے نیچے ایک نوٹ ہے :۔

" **نوٹ** : ناظم صاحب کو یاد تو ہوگا کہ اس کتاب کے نصفِ اوّل کا آغاز عمر خیاؔم کے نسخے کی ۴۹ رباعیات سے ہوا تھا۔"

غالباً یہ عرشی صاحب کی قابلیت اور دل نشیں اندازِ گفتگو ہی کا اثر تھا کہ چیپ مین مشرقی ادب کے اس درجہ گرویدہ ہو گئے کہ وہ اسے انگریزی ادب پر ترجیح دیتے نظر آتے ہیں۔ اس امر کا اظہار دیباچے کے ان الفاظ سے ہوتا ہے :۔

" ایک مشرقی شاعر اگر کسی معمولی چیز کو بھی اپنا موضوعِ سخن بناتا ہے تب بھی وہ ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے، جس کے لیے آپ کو ایک شیکسپیر کی ضرورت پڑے گی تاکہ وہ اُن سے بہتر کسی لفظ کا ہلکا سا تصور کر سکے۔"

مثال کے طور پر عرشیؔ صاحب کی ایک نظم "سفینہ کا غذیں" کے دو مصرعوں کا انگریزی منظوم ترجمہ پیش کر کے لکھا ہے کہ اس نظم کا موضوع اگرچہ ایک معمولی سی شے ہے لیکن جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے بڑھ کر اور کیا الفاظ ممکن ہیں۔

ریاستی دور میں موجودہ رضا لائبریری کی حیثیت سرکاری تھی۔ اجازت حاصل کر کے ہی اس سے استفادہ کیا جاسکتا تھا۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ شہر میں ایک پبلک لائبریری کا قیام عمل میں آئے۔ عرشی صاحب نے خاص طور پر شہر کے ایک سماجی و سیاسی رہنما صولت علی خاں کو اس طرف متوجہ کیا جن کا ایک عمدہ ذاتی کتب خانہ تھا۔ وہ راضی ہو گئے۔ انھوں نے اپنا کتب خانہ ہی نہیں دیا بلکہ وہ عرشی صاحب اور دیگر احباب کے ساتھ شہر بھر میں گھومے اور لوگوں سے کتابیں حاصل کر کے ایک لائبریری قایم کر دی جس کا نام صولت پبلک لائبریری رکھا گیا۔ عرشی صاحب زندگی بھر اس لائبریری کے تحفظ اور فروغ کے لیے کوشاں رہے۔

عرشی صاحب کو خدا نے حسنِ سیرت کے ساتھ حسنِ صورت سے بھی نوازا تھا، جوانی میں بھی وہ اپنی سنجیدگی، بردباری اور مہذب اطوار کی بنا پر احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بڑے سے بڑے مجمع میں وہ لوگوں کا مرکزِ نظر ہوتے۔ آخری دور کی تو بات ہی الگ تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ کانپور میں انجمن ترقی اردو کی کانفرنس میں عرشی صاحب اور میں شریک ہوئے۔ اس وقت عرشی صاحب کا مرتبہ دیوان غالب شائع ہو چکا تھا۔ لنچ کے وقفے میں سب لوگ باہر لان میں کھڑے تھے کہ الٰہ آباد کے ڈاکٹر رفیق میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ میں الٰہ آباد سے یہاں محض عرشی صاحب سے ملنے کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ آپ مجھے ملوا دیں۔ عرشی صاحب اس وقت فاصلے پر کھڑے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے گفتگو میں مصروف تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ مجمع کو دیکھیے جس شخص پر آپ کی نظر ٹھہر جائے وہی عرشی صاحب ہوں گے۔ انھوں نے چاروں طرف دیکھا اور کہنے لگے کہ کیا جو صاحب حفظ الرحمٰن سے گفتگو کر رہے ہیں وہ تو نہیں ؟ میں نے انھیں عرشی صاحب سے ملایا وہ بڑے تپاک

سے ملے۔

ڈاکٹر رفیق نے بڑی صفائی سے کہا "عرشی صاحب آپ کے مرتبہ دیوانِ غالب کا اس نیت سے مطالعہ کیا تھا کہ اس کی خامیوں کی نشان دہی کروں، لیکن باوجود کوشش مجھے ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ یہ معلوم ہو کر کہ آپ کانپور تشریف لائے ہوئے ہیں، میں بے اختیار چلا آیا کہ آپ کو مبارکباد پیش کر سکوں۔" عرشی صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ "رفیق صاحب دوست تو تعریف کیا ہی کرتے ہیں، مجھے خوشی ہے کہ آپ نے دشمن کی نظر سے میری حقیر کاوش کو دیکھا اور پسند فرمایا۔"

پٹھانوں کے بارے میں یہ عام خیال ہے کہ وہ گرم مزاج ہوتے ہیں، اور یہ تصور کچھ غلط بھی نہیں۔ لیکن رام پور کے امتیاز علی خاں اور قائم گنج کے ذاکر حسین خاں دو کھرے پٹھانوں کو نجانے کتنی ریاضت اور تہذیب نفس کے مرحلوں سے گزرنا پڑا ہوگا کہ وہ حلم وانکساری اور نرمی و دلنوازی کا مجسم نمونہ بن گئے۔ اور پٹھنولی کی انا اور سرکشی سے اس حد تک چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو گئے کہ ایک امتیاز علی اور دوسرے ذاکر حسین بن گئے۔

عرشی صاحب کی گفتگو بڑی دل چسپ ہوتی تھی، ان کے یہاں بھرپور مزاح لطیف تھا، دورانِ گفتگو وہ اپنے مزیدار فقروں، برمحل اشعار اور دل چسپ واقعات کے ذریعے سے نئے ملاقاتی کے ذہن سے اس دباو کو جلد دور کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے جو ان کے بارے میں اپنے ذہن میں لئے آتا تھا۔ ایک مرتبہ کی ملاقات کے بعد ہر شخص دوبارہ ملنے کا آرزومند رہتا۔ وہ دوسروں کی باتیں بھی بڑی توجّہ سے سنتے۔ ان کے یہاں نہ ملنے والوں کی کوئی تخصیص تھی، نہ موضوعِ گفتگو کی کوئی قید۔ چنانچہ ایک مرتبہ پروفیسر ذکا صدیقی کا عرشی صاحب پر ایک مضمون مقامی روزنامہ میں شایع ہوا جس میں رام پور کے ایک شاعر کا نام لیے بغیر یہ جملہ بھی لکھ دیا کہ وہ عرشی صاحب سے فلموں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جسے وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں۔ دوسرے دن وہ حضرت عرشی صاحب سے ذکا صاحب کی شکایت لے کر آئے۔ عرشی صاحب نے مسکراتے ہوئے

فرمایا کہ "اگر آپ کو فلموں کے بارے میں سنجیدگی سے گفتگو کرنا ہو تو میرے علاوہ کون موزوں شخص ہو سکتا ہے، اور اگر میں فلمی دنیا کے بارے میں کچھ مفید معلومات حاصل کرنا چاہوں تو آپ سے بہتر مجھے کون شخص مل سکتا ہے۔" وہ صاحب مطمئن ہو کر چلے گئے۔

عرشی صاحب نے جوانی میں دو چار مرتبہ ضرور فلم دیکھے ہوں گے۔ اس کے بعد نہ انھیں کسی فلم سے کوئی واسطہ رہا نہ فلم کے اداکاروں سے۔ بہت عرصہ ہوا وہ بمبئی گئے ہوئے تھے وہاں رام پور کے ایک رئیس نے ان کو ڈنر پر مدعو کیا۔ عرشی صاحب کے برابر دلیپ کمار کو جگہ ملی۔ میزبان نے دلیپ کمار کا رسمی تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ دلیپ کمار کو پڑھنے کا شوق ہے انھوں نے عرشی صاحب کے نسخۂ دیوانِ غالب کے بارے میں تعریف کرتے ہوئے بعض باتیں ایسی کہیں جن سے عرشی صاحب کو ان کے پڑھے لکھے ہونے کا احساس ہوا۔ بہت دنوں بعد مکان میں کسی بچے کا کوئی فلمی رسالہ نظر پڑا جس میں دلیپ کمار کا فوٹو تھا۔ عرشی صاحب نے بغور دیکھا اور کہا کہ بمبئی میں ایک ایسے ہی نوجوان سے ملاقات ہوئی تھی۔ بچوں نے کہا کہ یہ تو مشہور ہیرو دلیپ کمار ہیں۔ اس واقعہ کی اگر دلیپ کمار کو خبر ہو جاتی تو وہ ٹاٹا کے ساتھ عرشی صاحب کا بھی اپنے انٹرویو میں ضرور ذکر کرتے۔ ٹاٹا بھی ایک مرتبہ ہوائی جہاز میں دلیپ کمار کو اسی طرح نہ جان پائے تھے۔ کیونکہ ان کو فلم دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی۔

یوں تو ہر لائبریری میں ایک لائبریرین بھی ہوتا ہے، لیکن مثالی لائبریرین کو ایک ماں جیسا ہونا چاہیے۔ جس طرح ایک ماں اپنے تمام بچوں کے ناموں اور ان کے مزاج سے واقف ہوتی ہے، ایک اچھے لائبریرین کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے یہاں کی کتابوں کے نام، موضوعات اور ان کی خصوصیات کا علم رکھتا ہو۔ عرشی صاحب ایک ایسے ہی لائبریرین تھے۔ بعض بیرونی ریسرچ اسکالرز دوسری لائبریریوں میں اپنے مقالے کی تیاری کر کے رضا لائبریری اس نیت سے آتے کہ خانہ پُری ہو جائے۔ عرشی صاحب کو وہ اپنی کارگزاری کے بارے میں تفصیلی طور پر بتاتے۔ وہ بہت نرمی سے متعدد ایسے

کتابوں کے مطالعہ کی ہدایت کرتے جو لائبریری میں موجود ہوتیں۔ چنانچہ بعض ریسرچ اسکالرز نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اگر عرشی صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی ہوتی تو ان کا مقالہ انتہائی نامکمل اور تشنہ رہ جاتا۔ یہ معاملہ ان موضوعات کے بارے میں بھی ہوتا جو عرشی صاحب کے احاطۂ تحقیق سے باہر ہوتے۔

ایسا ہونا جبھی تو ممکن تھا کہ انھوں نے لائبریری کی ایک ایک کتاب کا مطالعہ کرلیا ہو۔ چنانچہ ایک مرتبہ عرشی صاحب کو جب ایوارڈ ملا تو ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اور مقررین نے ان کی قابلیت کو سراہا۔ عرشی صاحب نے حسب عادت اس تعریف و توصیف کے تاثر کو ہلکا کرنے کی غرض سے ایک واقعہ سُنایا۔ فرمانے لگے کہ جب میں ۱۹۳۲ء میں ناظم لائبریری مقرر ہوا تو میری عمر ۲۸ برس کی تھی۔ کتابوں کے مطالعہ کا ابتدا سے شوق تھا۔ اب جو موقعہ ملا تو میں الماریوں کے قریب کھڑے ہو کر گھنٹوں کتابیں پڑھتا رہتا۔ لائبریری میں دو بوڑھے چپراسی دروازے کے باہر بیٹھے ایک دن گفتگو کررہے تھے۔ میں آڑ میں تھا۔ ایک نے کہا" یہ نئے نوجوان ناظم صاحب جو آتے ہیں عِلم کی ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر بھائی عِلم کی ٹوہ آج تک کسی کو نہیں ملی"۔ عرشی صاحب نے کہا کہ اِس بوڑھے شخص کی بات کتنی سچی تھی۔ آج میں پڑھتے پڑھتے بوڑھا ہوگیا۔ لیکن علم کی ٹوہ نہ ملنا تھی نہ ملی۔

شگفتگی مزاج غضب کی تھی۔ بیسیوں واقعات یاد آرہے ہیں۔ ایک مرتبہ رضا ڈگری کالج رام پور میں کالج کا جلسہ تھا۔ ناظمِ جلسہ پروفیسر نجم الدّین نقوی نے جب عرشی صاحب کو تقریر کے لیے پکارا تو نام سے پہلے احتراماً "علاّمہ" کا لفظ بھی شامل کردیا۔ عرشی صاحب ڈائس پر تشریف لائے اور فرمایا۔ "صاحبو" ہمارے شہر میں عورتیں علاّمہ کو بُرے معنوں میں استعمال کرتی ہیں۔ مثلاً فلاں عورت بڑی علاّمہ ہے میں نے تو ایسا کوئی قصور نہیں کیا ہے جو نقوی صاحب مجھے یہ سزا دے رہے ہیں"۔ حاضرینِ جلسہ ہنسنے لگے۔

اسی لفظِ "علاّمہ" پر ایک دل چسپ واقعہ بھی سُنایا تھا۔ رام پور کے ایک شاعر باہر کسی شہر میں مقیم تھے ان کو اپنے نام سے پہلے علاّمہ لکھوانے کا شوق تھا۔ ایک مرتبہ

انہوں نے عرشی صاحب کو لکھا کہ یہاں میرے ایک ہمنام رہتے ہیں، ڈاکیہ غلطی سے میرا خط انہیں دے دیتا ہے۔ اگر آپ میرے نام کے ساتھ "علاّمہ لکھنے کی زحمت فرمائیں تو خط مجھ کو ملے گا۔ عرشی صاحب نے جواب میں لکھا" بھائی یہ کام اگر ہندوستان کے کسی مستند عالم سے لیں تو مناسب ہوگا۔ میں تو آپ کا ہم وطن ٹھہرا، لوگ اِسے جانبداری پر محمول کریں گے"۔

عام طور پر مشہور ہے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں، بنائے نہیں جاتے۔ لیکن رام پور میں یہ مفروضہ غلط ثابت ہوگیا۔ تین ایسے پڑھے لکھے حضرات جنھوں نے پچاس برس کی عمر تک ایک شعر نہیں کہا تھا، اچانک شعر کہنے لگے اور صاحب دیوان بن گئے۔ میری مراد انندکمار جین سرورعرفانی سابق ریونیو منسٹر، دواکر راہی ایڈوکیٹ اور پروفیسر نجم الدّین نقوی سے ہے۔ پہلے سرورعرفانی شاعر ہوئے اور مجھ سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ اُن کی دیکھا دیکھی دواکر راہی شعر کہنے لگے اور محشر عنایتی مرحوم کے شاگرد ہوگئے۔ نقوی صاحب تو صدر شعبہ اردو تھے ایک دن ذرا سی بات پر خفا ہوگئے اور رات گئے تک شعر کہنے کی کوشش کرتے رہے۔ دوسرے دن آتش کی زمین میں پانچ چھے شعر کی ایک غزل کہہ کر لائے اور زمرۂ شعرا میں داخل ہوگئے۔ یہ تینوں " نوشاعر" تقریباً روز ایک غزل کہنے لگے۔ نقوی صاحب نے عرشی صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنا مناسب سمجھا۔ عرشی صاحب اُس زمانے میں علالت کے باوجود ضروری کاموں میں مصروف تھے۔ لیکن انھوں نے نقوی صاحب کو منع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ روز ایک غزل کہہ کر لاتے اور کئی کئی گھنٹے بیٹھتے یہاں تک کہ پانچ ماہ کے اندر ان کا شعری مجموعہ "چمن جاگے" شائع ہوگیا۔ لیکن مشق سخن یا مشق ستم برابر جاری رہی۔ میں نے اس صورت حال کے پیش نظر عرشی صاحب سے ایک دن کہا اگر آپ نقوی صاحب کو فارغ الاصلاح قرار نہیں دے سکتے تو اتنا تو ضرور فرما سکتے ہیں کہ ایک ہفتے کی غزلیں ایک دن لے آیا کریں۔ عرشی صاحب حسب عادت مسکرائے اور یہ شعر پڑھا:۔

سینہ رنجہ کیا گزرتی ہے ∴ یہ لبِ نے نواز کیا جانے

اس کاروباری دنیا میں بھی عرشی صاحب کی دوستی کا معیار کتابی رہا۔ یعنے وہ دوستوں کی مدد کے لیے دامے، درمے، قدمے سخنے کی روایت کے قائل تھے۔ ۱۹۳۰ء میں جب رام پور میں سیاسی تحریک چل رہی تھی، اس میں عرشی صاحب کے بعض مخلص دوست بھی شامل تھے، اور قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے ذرا سی شکایت پر ریاست میں ملازمت سے برطرفی عمل میں آجاتی تھی۔ لیکن عرشی صاحب نے اپنے دوستوں سے برابر تعلقات قائم رکھے۔ یہاں تک کہ جب مجبور ہو کر بعض سیاسی حضرات ہجرت کر کے بریلی میں مقیم ہو گئے تاکہ وہاں سے تحریک چلائیں تو ان کے ایک قریبی دوست کو بھی وہاں جانا پڑا۔ عرشی صاحب نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان صاحب کا وہاں کوئی ذریعہ معاش نہیں ہے اور مالی حالت بھی ٹھیک نہیں ہے، اپنی نصف تنخواہ ان کو برابر بھیجتے رہے اور اس کی خبر اپنی اہلیہ تک کو نہ ہونے دی۔ اس زمانے میں ان کی تنخواہ کچھ زیادہ نہ تھی خدا جانے انھوں نے اتنی مدت کس طرح گزاری۔ یہ واقعہ مجھے خود ان صاحب نے سنایا تھا۔

عام طور پر عرشی صاحب کو غالب کا پرستار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن وہ غالب کے طرفدار کبھی نہیں بنے۔ بہت عرصہ ہوا انگلعۂ معلّٰی رام پور میں یوم موٓمن منایا گیا۔ جلسے میں عرشی صاحب بھی موجود تھے۔ ایک صاحب نے موٓمن کی مثنویوں کی روشنی میں موٓمن کو عیّاش قرار دینے کے علاوہ ان کی شاعری کو بھی گرا کے پیش کیا۔ وہ صاحب سمجھ رہے تھے کہ عرشی صاحب ان کی اس کاوش کی داد دیں گے۔ لیکن جب عرشی صاحب تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو انھوں نے خلاف توقع ان صاحب کے اعتراضات کا جواب ہی نہیں دیا بلکہ موٓمن کی شاعری کی بیحد تعریف کی۔ ان کا یہ جملہ آج بھی یاد ہے کہ "دلّی کے سادہ کار مشہور ہیں، موٓمن اردو شاعری کا سادہ کار ہے۔" موٓمن کا یہ شعر بھی انہوں نے سُنایا تھا:

دل ہی مانندِ نشانِ کفِ پا بیٹھ گیا
پا نو کیا کوچے سے اس ہوش رُبا کے اُٹھے

عرشی صاحب کو چاربیت کا ذوق اپنے والد ڈاکٹر مختار علی خاں سے ورثے میں ملا تھا۔

روہیلہ پٹھان جب سرحد سے آکر روہیلکھنڈ میں آباد ہوئے تو پشتو چاربیت بھی ساتھ لائے۔ اُردو چاربیت کا آغاز رام پور میں ایک صاحب عبدالکریم خاں نے کیا۔ انھوں نے چاربیتیں لکھیں بھی اور ایک جماعت گانے والوں کی بھی تیار کی۔ یہاں سے یہ فن روہیلکھنڈ کے دوسرے شہروں کے علاوہ دوسری پٹھان ریاستوں ٹونک، جاورہ اور بھوپال میں ان کے خلفا اور شاگردوں کے ذریعے سے پہونچا اور آج بھی بیحد مقبول ہے۔

عرشی صاحب نے کچھ چاربیتیں نقل کرا کے رضا لائبریری میں جمع کر دی تھیں، ایک دن انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ تذکرہ نگاروں اور اہلِ قلم حضرات نے چاربیت کو نظر انداز کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج سیکڑوں قدیم چاربیتیں لوگ بھول چکے ہیں۔ اور کم پڑھے لکھے یا اَن پڑھ چاربیت گانے والے ان کی کہاں تک حفاظت کر سکیں گے۔ میں تو یہ کام اب خود نہیں کر سکتا بہتر ہوگا کہ تم ایک مقالہ لکھو اور دو سو برس کی چاربیتیوں کو جمع کر کے ان کا انتخاب شایع کر دو چنانچہ تعمیلِ حکم کے طور پر میں نے دس بارہ دن میں ایک مقالہ لکھا اور ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ بہت مسرور ہوئے۔ اس دن کے بعد وہ لائبریری بوجہ علالت نہ آسکے اور ان کا انتقال ہو گیا "چاربیت" کے نام سے یہ کتاب معہ انتخاب چاربیت خدابخش لائبریری پٹنہ میں زیرِ طباعت ہے۔ یہ عرشی صاحب ہی کی توجہ دلانے کا نتیجہ ہے کہ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن رام پور سے ہر ہفتہ چاربیت کا پروگرام نشر ہوتا ہے۔ اور ہر سال نمائش رام پور میں ایک رات چاربیت کے جلسے کے لیے مخصوص ہو گئی ہے جس میں روہیلکھنڈ ٹونک اور بھوپال کی چاربیت جماعتیں حصہ لیتی ہیں۔

میرے بھائی صاحب مشیّر علی خاں عرف بنّو صاحب کا انتقال ہو گیا۔ عرشی صاحب اس زمانے میں قلبی مریض تھے اور لائبریری کے علاوہ کہیں اور نہیں آتے جاتے تھے۔ ڈاکٹروں کی ہدایت کے بموجب گھر کے لوگ کسی کی موت یا کوئی غم ناک خبر انہیں نہیں سُناتے تھے۔ چند روز بعد میرا لائبریری جانا ہوا۔ وہ کمرے میں خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ سلام علیک کے بعد میں قریب بیٹھ گیا۔ وہ مجھے عجیب انداز سے دیکھتے رہے۔ مجھے خیال ہوا کہ غالباً انہیں اس واقعہ کی خبر نہیں دی گئی ہے۔ میں نے بھی از خود کہنا مناسب نہ سمجھا۔ چند لمحوں کے بعد

خود کلامی کے انداز میں اُن کی زبان سے صرف ایک جملہ نکلا " بنو صاحب مر گئے " اور وہ سامنے دیوار کی طرف دیکھنے لگے۔ اس جملے میں نہ کوئی خبر تھی، نہ کوئی سوال کریں کچھ کہتا۔ وہ بڑے سے بڑے صدموں کو کس ضبط و صبر سے برداشت کرنے کے عادی تھے۔ ایک جگری دوست کی موت پر اس مختصر سے جملے میں کس قدر درد جھلک رہا تھا۔

عرشی صاحب بھی ایک انسان تھے۔ اپنی کاوش کی تعریف سُن کر کون خوش نہیں ہوتا، ان کو بھی دلی مسرت حاصل ہوتی ہوگی لیکن اُن کی ایک ادا ہمیشہ قایم رہی، جب کوئی ان کی تعریف کرتا تو وہ کوئی ہنسی کا جملہ کہہ کر یا شعر پڑھ کر اس تاثر کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ان کی ایک کتاب مکاتیب غالب کی جب ایک صاحب نے بیحد تعریف کی تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے، 'دُم ہاتھ لگ گئی تھی' اُس میں گائے باندھ دی ہے " یہ انکساری ان کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی۔

واقعی اُن کی صحبت میں جی بہلتا تھا۔ خُردی و بزرگی کے لحاظ کے ساتھ ساتھ ہمارے درمیان قدرے بے تکلفی بھی ہو گئی تھی۔ " شب خون " رسالہ لائبریری میں آتا تھا۔ جدید ادب کی بعض غزلوں کے اشعار روایتی انداز سے اس قدر ہٹ کر ہوتے کہ اس کی تشریح کے لیے خود شاعر سے رجوع کرنے کی ضرورت لاحق ہونے لگتی۔ عرشی صاحب فرصت کے لمحوں میں اس کا مطالعہ بھی ضرور کرتے۔ ایسے مواقع پر وہ مجھ سے کوئی ایسا ہی شعر سنا کے اس کا مفہوم معلوم کرتے۔ میرا کام اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا کہ بظاہر کسی بھی مہمل سے مہمل شعر کے وہ معنی بیان کروں جو غالباً شاعر کے ذہن میں بھی نہ ہوں اور وہ میری اس سعیِ حاصل سے کافی محظوظ ہوتے۔ مگر اس تفریح کا تعلق خود ان کے سنائے ہوئے ایک دل چسپ واقعہ سے تھا۔

انہوں نے ایک دن بتایا تھا کہ ایک مولوی صاحب غالب کے شیدائی اور کلام کے پرستار تھے۔ اس زمانے میں دیوانِ غالب کا نسخہ حمیدیہ دریافت ہوا تھا ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم نے ازراہ شرارت ایک مہمل شعر غالب کے انداز میں کہنے کی کوشش کی تاکہ مولوی صاحب کو سُنایا جائے، اور لطف لیا جائے۔ چنانچہ ہم

دونوں نے اَنمل بے جوڑ الفاظ کی مدد سے یہ شعر تیار کیا ہے ؎

دیا قوزہ نشیمن، لاابالی حرزِ مستعمل
مری جاں ہر رگ گل ماورائے نہر دوراں کا

جب مولوی صاحب تشریف لائے تو عندلیب شادانی نے کہا کہ بھوپال میں غالب کے دیوان کا ایک نسخہ ملا ہے جس میں بہت سا کلام زیادہ ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ہاں سُنا تو ہے۔ عندلیب نے کہا کہ ایک شعر اس میں بالکل مہمل ہے۔ مولوی صاحب بھڑک اٹھے اور کہا آپ مہمل ہیں جو غالب جیسے شاعر کے کلام کو مہمل گردانتے ہیں۔ عندلیب نے مذکورہ بالا شعر سُنایا۔ مولوی صاحب سر جھکا کر غور کرنے لگے۔ عندلیب نے مجھے دیکھا کہ آج مولوی صاحب بھی ہتھیار ڈال دیں گے۔ لیکن مولوی صاحب کہیں ہار ماننے والے تھے انھوں نے کہا " میاں شعر بالکل صاف ہے۔ غالب فرماتے ہیں کہ اس قدر دوائیں استعمال کی ہیں کہ دیا قوزہ میرا نشیمن بن چکا ہے اور جو تعویذ مجرّب تھا وہ لاابالی یعنی بے اثر ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب دوا اور دعا دونوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ غالب چونکہ ماوراالنّہر کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے، اس کی رعایت سے کہتے ہیں کہ اس قدر نقاہت بڑھ گئی ہے کہ رگِ گل بھی میرے لیے ...... " عرشی صاحب نے کہا کہ اس قدر مہمل شعر کے جو مطالب مولوی صاحب نے بیان کرنا شروع کیے تو ہم اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔ اس شعر کے پس منظر ہی میں اکثر بے معنی اشعار کا میں مطلب عرض کرتا تھا۔

اُن کا علمی تجسّس آخری دم تک برقرار رہا۔ انتقال سے ایک رات پہلے میں ان کی خیریت معلوم کرنے کی غرض سے پہنچا۔ عرشی زادہ (اکبر علی خاں) نے بتایا کہ ڈاکٹر کی ہدایت ہے کہ آبا کافی پانی پییں لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں۔ میں ایک دفعہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔ ابھی ان کے دو دوست تشریف لائے تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ کسی صورت سے انھیں راضی کریں۔ چنانچہ جب وہ مزاج پُرسی کے بعد چلنے لگے تو پانی زیادہ پینے پر زور دیا۔ آبا سمجھ گئے اور یہ مصرع جواب

میں پڑھا :

ایک جاتا ہے تو دو آتے ہیں سمجھانے کو

میں نے مناسب نہ سمجھا کہ دوبارہ پردہ ہو' اس لیے عرشی صاحب کے دوسرے صاحبزادے ممتاز عرشی سے خیریت معلوم کرائی۔ ممتاز لوٹ کر آئے اور کہا ابا نے دعا کہی ہے اور پوچھا ہے کہ اس مصرعے کا مصرعِ ثانی کیا ہے اور یہ مصرع سنایا۔ میں نے کہا کہ مجھے صحیح مصرع تو معلوم نہیں لیکن اس مصرعے سے بھی کام چل سکتا ہے۔ اور فی البدیہہ مصرعہ موزوں کر دیا ؎

چین لینے نہیں دیتے ترے دیوانے کو
ایک جاتا ہے تو دو آتے ہیں سمجھانے کو

عرشی صاحب بہت محظوظ ہوئے اور کہلوایا کہ ممکن ہے یہی اصل مصرع ہو اور اگر ایسا نہیں ہے تب بھی یہ مصرع ہی عمدہ ہے۔ اللہ اللہ کیا شگفتگی مزاج اور علم کی جستجو تھی۔ موت سے پہلے چند گھنٹے قبل تک وہ کس اطمینان سے شعر و شاعری کی بات کر رہے تھے۔ صبح کو جب رام پور کے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے یہ اندوہناک خبر نشر ہوئی کہ عرشی صاحب کا انتقال ہو گیا تو میں دم بخود رہ گیا۔

ایک دن انھوں نے دورانِ گفتگو جو بات ازراہ مذاق کہی تھی کہ مرنے کے بعد اُن کی رُوح ضرور لائبریری کا طواف کیا کرے گی' اس کے پیشِ نظر راج ماتا رفعت زمانی بیگم آف رام پور نے خصوصی اجازت حاصل کر کے لائبریری کے مغربی گوشے میں ان کی قبر کے لیے جگہ فراہم کر دی آج وہ کتابوں کے اس تاج محل کے زیرِ سایہ محوِ استراحت ہیں ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

محمد نظر علی خاں

عرشی صاحب

شمالی ہند (اتر پردیش) میں مصطفیٰ آباد عرف رام پور پٹھانوں کی ایک چھوٹی سی ریاست ہونے کے باوجود علوم و فنون کا مرکز تھی۔ رام پور بہ قولِ حضرتِ غالب (دارالسرور) مشہور علما' صوفیہ' شعرا' ادبا' ممتاز اطبا اور عظیم سیاسی لیڈروں کا مولد و مسکن رہا ہے۔

اس ریاست کے آخری دور میں فخرِ افغاناں' ادیب العصر حضرت مولانا امتیاز علیخاں عرشی (خان زادہ حاجی خیل) افقِ رام پور پر جلوہ گر ہوئے۔ مولانا عرشی مرحوم کے علم و فضل اور ادب و انشا پر بہت سے مقالات لکھے جا چکے ہیں اور اس نشست میں بھی بہت سے فاضل اصحاب مولانا عرشی مرحوم مغفور کی علمی شخصیت پر روشنی ڈالیں گے' (جن میں آپ کے معاصر (گو عمر میں آپ سے چھوٹے ہیں) اور قریبی عزیز موجودہ دور میں رام پور کے سب سے بڑے فلسفی' عالم' استاذی مولانا عبدالسلام خاں صاحب مدظلہ العالی سابق پرنسپل مدرسۂ عالیہ کے فاضلانہ مقالے سے سامعین محظوظ ہوں گے۔ میں تو صرف چند یادیں جو میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور اپنے تاثرات مولانا عرشی صاحب کی پُرکشش اور باوقار شخصیت کے متعلق پیش کروں گا۔

(۱) عرشی صاحب کی طبیعت میں فخر و تمکنت یا تعلّی بالکل نہیں تھی' اور نہ اپنے علم سے دوسروں کو مرعوب کرنے کا مزاج تھا۔ کبھی آپ نے ادعائے علم و فضل نہیں کیا۔ آپ کا برتاؤ چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا اور بڑوں کے ساتھ احترام کا ہوتا تھا۔ چھوٹوں کی ہمت افزائی کرتے تھے' چاہے ان کا کام وقیع نہ ہو۔ مولانا مرحوم کی شرافت و متانت کا قلب پر

بہت اثر ہوتا تھا۔ اِس سلسلے میں ایک واقعہ آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میں تو عمر طالب علم تھا، راستے میں مولانا مرحوم سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی، میں چاہتا تھا کہ محترم عرشی صاحب کو پہلے میں سلام کروں، لیکن اکثر و بیشتر بلکہ اگر ہمیشہ بھی کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا، عرشی صاحب کا ہاتھ سبقت کر جاتا اور مجھے شرمندہ کر جاتا تھا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے مولانا عرشی کو روشن اور پرکشش آنکھیں اور خوب صورت داڑھی عطا فرما کر ان کی باوقار شخصیت کو وجیہہ بنا دیا تھا۔

(۳) مولانا عرشی مرحوم ہمیشہ اپنے معاصر کا نام ادب و احترام سے لیتے تھے اور کبھی کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے۔ اپنے معاصرین کا ذکر (جن میں بعض سے فکری اختلاف بھی تھا) اس طرح کرتے تھے کہ اگر وہ تذکرہ معاصر مذکور کے سامنے نقل کیا جائے تو اسے ناگوار نہ ہو، اور اس کا دل نہ دکھے۔ معاصرین کے کاموں کو سراہتے تھے۔ ایک مرتبہ استاذی مولانا سید عبدالدائم صاحب جلالی کا ذکر آیا۔ پہلے تو اُن کے علم و فضل کی تعریف کی اور اُس کے بعد فرمایا :- جلالی صاحب نے تدریسی مشغولیت کے باوجود اتنا زیادہ کیسے لکھا اور اس قدر اہم کتابوں کے کثیر تراجم کیسے کیے؟

(۴) عرشی صاحب کو پٹھانوں کے بچّوں کے تعلیمی امور سے بہت دل چسپی تھی وہ چاہتے تھے کہ یہ بچے اپنی صلاحیت، بجائے لہو و لعب میں صرف کرنے کے، حصول تعلیم میں صرف کریں۔ جب میں مدرسۂ عالیہ کے ابتدائی درجے میں پڑھتا تھا، اس وقت اس کلاس میں رام پور کے پٹھانوں کے بہت سے بچّے جمع ہو گئے تھے جن سے مولانا کا بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق تھا، اس لیے اس کلاس سے مولانا کو بہت دل چسپی تھی۔ اکثر و بیشتر بطور امتحان اس کلاس کے لڑکوں کی کاپیاں بھی دیکھا کرتے تھے، نمبر بھی دیتے تھے، ریمارکس بھی کیا کرتے تھے، خصوصاً عربی تعلیم حاصل کرنے والے پٹھان بچّوں سے بہت لگاؤ تھا۔ انھیں اپنی مفید نصیحتوں سے نوازتے رہتے تھے۔

اِس سلسلے کی ایک کڑی انجمنِ کلاسیہ کا قیام بھی تھا، جس میں عربی کے طلبہ

تقریریں کیا کرتے تھے، یہ انجمن خانقاہ حضرت شاہ احمد علی صاحبؒ میں جہاں اب مدرسۂ فرقانیہ ہے، طلبہ کو خطابت سکھانے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس کے ارکانِ ثلاثہ، حضرت خطیب اعظم مولانا وجیہہ الدین احمد خاں صاحب، مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی، اور قاری محمد اسماعیل صاحب مجدّدی تھے، جلسے کے اختتام پر بالعموم عرشی صاحب خود طلبہ کی ہمت افزائی کے لیے تقریر بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے بھی اپنی طالب علمی کے زمانے میں اس انجمن کے سالانہ جلسے میں تقریریں کی ہیں۔

(۵) مکرمی عرشی صاحب تقریر بھی بہت عمدہ کیا کرتے تھے۔ ان کی خطابت واضح اور دل نشیں ہوتی تھی۔ الفاظ، نہایت شستہ ہوتے تھے۔ سامع ان کی تقریر کا مفہوم پوری طرح سمجھ لیتا تھا۔ میں نے ان کی تقریر کئی مرتبہ سنی ہے اور اس کی گونج آج تک میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ اسی طرح ان کی گفتگو بھی بہت خوب صورت اور دل چسپ ہوتی تھی۔ اُن کی خوبیِ گفتگو کی تعریف میں نے ان کے معاصرین کی زبانی سنی ہے۔ نیاز فتح پوری جو خود مشہور صاحب طرز ادیب تھے، مولانا عرشی کی گفتگو کی بہت تعریف کرتے تھے، فرماتے تھے کہ عرشی صاحب کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔

میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو صرف عرشی صاحب کی باتیں سننے کے لیے اور ان کی گفتگو سے استفادے کی غرض سے مرحوم یوسف خاں صاحب کی دکان پر، جو عرشی صاحب کی مستقل نشست گاہ تھی، پابندی سے بعد مغرب آیا کرتے تھے۔

(۶) یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ عرشی صاحب عالمِ دین بھی ہیں، بہت سے لوگ انھیں ادیب ہی سمجھتے تھے اور ان کے کارناموں کو ادبی کارنامے قرار دیتے تھے، لیکن رام پور میں ایسے لوگ بھی تھے، جن میں خواص زیادہ تھے، خصوصاً موجودور کے روشن خیال پڑھے لکھے حضرات، یہ لوگ عرشی صاحب کو ایک صالح و متقی بزرگ اور دینی امور میں بصیرت رکھنے والا عالمِ دین جانتے اور مانتے تھے، اور دینی معاملات میں ان کی رائے جاننے کے متمنّی ہوتے تھے۔ رام پور کا ایک مشہور پٹھان خاندان جس میں پڑھے لکھے افراد زیادہ تھے، ان کے ہاں تقریب شادی تھی، میں بھی شریک تھا، خطبۂ نکاح

رام پور کے مشہور قاری اور امام جامع مسجد عبدالحق خاں صاحب نے پڑھا۔ میرے استفسار پر ان صاحب نے جن کا نکاح ہوا تھا کہا کہ ہماری دلی خواہش تو یہ تھی کہ عرشی صاحب خطبۂ نکاح پڑھیں، لیکن موصوف نے معذرت کرتے ہوئے قاری صاحب مذکور کا نام تجویز فرمایا اور خود ہی انھوں نے قاری صاحب کو اس کام کے لیے مدعو بھی کیا۔

(۷) عرشی صاحب نہایت لطیف و متوازن مزاج رکھتے تھے، غصّے سے گریز کرتے تھے، لیکن کبھی کبھی پٹھانی جذبہ ابھر آتا تھا۔ ایک مرتبہ میں اور قبلہ عرشی صاحب جمعیۃ علمائے ہند کے دفتر مجاہدِ ملّت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم سے ملاقات کے لیے گئے۔ مجاہدِ ملّت نے عرشی صاحب کا پرتپاک خیر مقدم کیا، کمرے میں ایک اور بزرگ بھی تھے (جن کا نام میں نہیں لوں گا) ان بزرگ نے بھی ہم لوگوں کو دیکھا اور مجاہدِ ملّت کے پُرتپاک خیر مقدم کو بھی، لیکن وہ الماری کی کتابوں سے نہیں ہٹے۔ عرشی صاحب نے ایک مرتبہ اٹھنا چاہا ان سے مصافحہ کرنے کے لیے، لیکن پھر بیٹھ گئے، جسے میں نے بھی محسوس کیا۔ اُس کے بعد مولانا حفظ الرحمان صاحب نے ان بزرگ کو متنبہ کیا کہ آپ ان سے ملیں، یہ ہندوستان کی نامور علمی و ادبی شخصیت مولانا عرشی رام پور کے رہنے والے ہیں۔ اس پر وہ صاحب عرشی صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور مصافحہ کیا۔ عرشی صاحب بھی تپاک سے ان سے ملے۔ واپسی میں میں نے سوالیہ نظروں سے مولانا کو دیکھا، سمجھ گئے، فرمانے لگے: محمد میاں: اس وقت پٹھنولی مزاج میں آ گئی تھی جس نے مجھے ارادے کے باوجود مصافحہ کرنے کے لیے اٹھنے نہیں دیا، کہ جب انھوں نے التفات نہیں کیا، تو میں کیوں ان سے مصافحہ کروں اور ملاقات کے لیے اٹھوں۔ حالانکہ یہ بات عرشی صاحب کی افتادِ طبع کے خلاف تھی، لیکن کبھی کبھی اس غیور پٹھان کی رگِ حمیت پھڑک اٹھتی تھی۔ اثنائے گفتگو مولانا حفظ الرحمان صاحب کی تعریف کی، فرمایا کہ مولانا حفظ الرحمان صاحب کی شخصیت ایسی ہے کہ ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے اور جمعیۃ علما کے دفتر انھیں سے ملاقات کے لیے جاتا ہوں۔ اس ذیل میں اور دل چسپ قصہ سنتے چلیے۔ مولانا حفظ الرحمان

صاحب مرحوم نے مجھ سے ایک مرتبہ مزاحاً فرمایا کہ تمھیں رام پور کا پٹھان ہونے کے باوجود غصّہ نہیں آتا اور نہ زبان سے "پٹھانی کلمات" ادا کرتے ہو، حالانکہ وہاں کے لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ مولانا عبدالوہاب خاں صاحب تو خیر پہلے پٹھان ہیں اور پھر مولوی، لیکن عرشی صاحب جیسے نرم و متوازن مزاج رکھنے والے شخص کو بھی ہم نے یومِ موتمن کے موقع پر غضب ناک ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس سلسلے میں برادرم اکبر علی خان عرشی زادہ خلفِ اکبر مولانا عرشی مرحوم کی زبانی ایک واقعہ یاد آگیا۔ عرشی صاحب فرماتے تھے کہ تم سلام میں پہل دس مرتبہ تو خود کرو، اس کے بعد دیکھو کہ وہ شخص جسے تم دس مرتبہ سلام کر چکے ہو، تمھیں سلام کرتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ سلام میں دس کے بعد بھی پہل نہیں کرتا تو اس کا مطلب ہے کہ وہ تم سے سلام لینا چاہتا ہے، یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھ رہا ہے اور تمھیں چھوٹا، برابر کا برتاو نہیں کرتا، اس لیے اس کے بعد تم اس کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔

(۸) تقریباً تیس سال قبل میں دہلی تلاشِ معاش میں آیا ہوا تھا کہ عرشی صاحب لائبریری کے کسی کام کے سلسلے میں دہلی تشریف لائے اور مفتی عتیق الرحمان صاحب مرحوم کے یہاں ندوۃ المصنفین کی عمارت میں قیام پذیر ہوئے۔ میں بھی ملاقات کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے لے کر وہ مسجد فتحپوری مولانا قاضی سجاد حسین صاحب مرحوم سے ملاقات کے لیے پہنچے۔ قاضی صاحب سے دل چسپ گفتگو ہوتی رہی، قاضی صاحب پنجاب عربی و فارسی بورڈ کے ممبر نامزد کیے گئے تھے، بورڈ کی طرف سے ممبر کو ایک سکریٹری بھی ملتا تھا۔ قاضی صاحب مجھ سے اس کا ذکر فرما چکے تھے، عرشی صاحب کے علم میں بھی یہ بات آچکی تھی اور عرشی صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ عارضی طور پر یہ ملازمت کرلی جائے اور دوسری جگہ مستقل ملازمت کی کوشش جاری رکھی جائے۔ دورانِ گفتگو عرشی صاحب نے اس کا تذکرہ کیا، جس پر قاضی صاحب نے فرمایا کہ میں خود چاہتا ہوں کہ اس آسامی پر ان کا تقرر ہو جائے لیکن ابھی تک بورڈ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ بطورِ جملۂ معترضہ عرض کردوں کہ اس گفتگو کے چند روز بعد ہی مجھے دوسری جگہ مستقل ملازمت مل گئی اور اس تقرر کی نوبت نہیں آئی۔ دورانِ گفتگو بطور مزاح عرشی صاحب نے کہا کہ اچھا

قاضی صاحب! آپ ہمیں اپنا سکریٹری بنا لیجیے۔ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ میں آپ کو
سکریٹری بنا تو لوں لیکن پہلے آپ ایک قصّہ سُن لیں۔ ایک چھوٹی سی ریاست کے نواب
صاحب کے قریبی رشتے دار ایک حسین و شکیل اور ذہین نوجوان تھے، انھیں نواب صاحب
نے حصولِ تعلیم کے لیے بیرونِ ملک بھیجا۔ جب وہ جوان زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوکر
وطن واپس آئے تو نواب صاحب نے انھیں اپنا پرائیویٹ سکریٹری مقرر کیا۔ جب لوگ
نواب صاحب سے ملاقات کے لیے آتے یا نواب صاحب کہیں جاتے تو سکریٹری صاحب
بھی ان کے ہمراہ ہوتے۔ لوگ بجائے نواب صاحب کے، سکریٹری صاحب کی طرف اُن
کی پرکشش شخصیت کی وجہ سے متوجہ ہو جاتے اور انھیں سے گفتگو بھی کرتے۔ معلوم ہوتا
تھا کہ نواب صاحب کی، جن کے سکریٹری صاحب ملازم تھے، کوئی حیثیت و مرتبہ ہی نہیں
اور سکریٹری صاحب سب کچھ ہیں۔ نواب صاحب یہ رنگ دیکھ کر بہت کڑھتے اور پریشان
ہوتے، اس طرح میرا اور آپ کا بھی معاملہ ہوگا کہ میری طرف تو کوئی توجہ نہیں دے گا
اور سکریٹری صاحب پر ہر شخص فریفتہ ہو جائے گا اور انھیں سے محوِ گفتگو ہوگا۔ پھر مجھ پر کیا
گزرے گی۔ یہ سُن کر عرشی صاحب بہت ہنسے۔

(۹) سنّی اور شیعہ، دیوبندی و بریلوی، خانقاہی اور جماعتِ اسلامیہ سے تعلق رکھنے
والے حضرات، سب ہی مولانا عرشی صاحب کی تعریف کرتے اور ان کی گفتگو سے متاثر
ہوتے تھے، وہ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کرتے تھے۔ میں نے خود بعض بریلوی مسلک کے
حامل افراد کی زبانی مولانا موصوف کے لیے تعریفی کلمات سنے ہیں، حالانکہ عرشی صاحب
اپنے مسلک و موقف پر اٹل تھے، وہ مداہنت فی الدّین کے مرتکب نہیں ہوتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا، مولوی اعظم صاحب امام مسجد نوری، بریلوی جو
بریلوی السلک تھے، عرشی صاحب کے انتقال کے بعد برائے تعزیت رام پور اکبر خاں
کے پاس آئے، اور عرشی صاحب کے ذکرِ خیر کے دوران رو کر فرمانے لگے کہ میں نے
عرشی صاحب جیسا آدمی نہیں دیکھا جس نے کبھی کسی کی دل آزاری نہ کی ہو در آں حالیکہ وہ
اپنے مسلک کو چھپاتے بھی نہیں تھے۔

(۱۰) عرشی صاحب کی ادبی حیثیت تو معروف ہے ہی، لیکن ان کو دینی علوم میں
بھی بصیرت حاصل تھی۔ اور انھوں نے اپنے دینی و مذہبی تشخص و شناخت کو (اس میں
علمی و عملی دونوں حیثیتیں شامل ہیں) پوری طرح برقرار رکھا تھا اور اسے اپنی ادبی شخصیت
میں ضم نہیں کیا تھا۔ اس کے شواہد تفسیر سفیان ثوری کی تحقیق (ایڈٹ) اور اس پر
نہایت مبسوط مقدّمے اور استنادِ نہج البلاغہ جیسی عالمانہ و محققانہ کتاب کی شکل میں
ہمارے سامنے موجود ہیں۔

(۱۱) عرشی صاحب علیل تھے، میں مزاج پرسی کے لیے ان کے دولت کدے پر
حاضر ہوا۔ اثنائے گفتگو گردشِ آسمان و زمین کا ذکر آگیا اس پر فلاسفۂ قدیم کی آرا اور فلاسفۂ
جدید و موجودہ سائنس دانوں کے نظریات مع اصطلاحات فلسفہ اس قدر عمدہ طریقے
سے بیان فرمائے کہ معلوم ہوتا تھا کہ فلسفے کا کوئی ایسا استاد درس دے رہا ہے جس
میں درس دینے کی پوری صلاحیت موجود ہے، حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ مولانا مرحوم
کا مشغلہ درس و تدریس نہیں تھا۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ مولانا نے اس موضوع پر
ترجیح موجودہ دور کے سائنسدانوں کو دیتے ہوئے فرمایا کہ اب گردشِ زمین کا مشاہدہ
ہو چکا ہے۔

(۱۲) عرشی صاحب میں عربی و فارسی، انگریزی اور پشتو زبان میں گفتگو کرنے کی
پوری استعداد تھی، میں نے عربی و انگریزی میں ان کی گفتگو سنی ہے۔

(۱۳) مجھ سے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک مرتبہ فرمایا کہ محمد میاں! میری نظر
اور میرا عمل ہمیشہ قرآنِ کریم کی آیت کریمہ "لیس للانسان الا ما سعیٰ" پر رہا ہے،
میں نے جدّوجہد کبھی ترک نہیں کی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

دیوانِ غالب (کشمیری)

اسد اللہ خاں غالب

ترجمہ کار

غلام نبی ناظر

غالب کے اُردو دیوان کا کشمیری زبان میں منظوم ترجمہ شائع ہوگیا ہے جس میں ایک صفحے پر کشمیری زبان میں ترجمہ اور مقابل کے صفحے پر اُردو زبان میں اصل غزل ہے۔

فوٹو آفسیٹ طباعت، عمدہ سفید کاغذ، مضبوط جلد اور دلکش سرورق کے ساتھ

قیمت : ساٹھ روپے

ملنے کا پتہ : غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

ڈاکٹر ممتاز عرشی

یادیں میرے ابّا کی

رات کے دو یا تین بجے ہیں، ایک بچہ جس کی عمر تقریباً ۴ سال کی ہے، اپنے پلنگ سے اٹھتا ہے، دالان کے ایک کونے میں مصلّیٰ کھڑا ہے، اسے اٹھا کر بچھاتا ہے، سجدہ کرتا ہے اور پھر ایک چارپائی کے پاس کھڑا ہو کر کہتا ہے : ابّا میں نے نماز پڑھ لی ہے، آپ کے پاس سو جاؤں اور ابّا بچے کو اپنی گود میں اٹھا کر پاس لٹا لیتے ہیں۔ ابّا سے متعلق یہ میری سب سے پُرانی یاد ہے۔ اِس بظاہر معمولی واقعے سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ ابّا سے ہم لوگوں کو ایسا لگاؤ تھا جو آدھی رات کو ان کے پلنگ تک اس کم عمری میں پہنچا دیتا تھا۔ باپ کو اپنی اولاد سے جو محبت ہوتی ہے، اس کے لیے کچھ کہنا مشکل نہیں ہے۔

ہمارے ابّا صرف ابّا نہیں تھے، ہمارے استاد بھی تھے، ہمارے ساتھی اور دوست بھی۔ اُن کی ذات سے ہمیں جتنے قرب کا احساس ہوتا تھا، وہ کسی دوسرے سے نہیں ہوا۔ کبھی کبھی یہ مشکل آجاتی ہے کہ آپ کو کوئی ہستی بہت عزیز ہو تو اس کے بارے میں بیان کی طاقت جواب دے جاتی ہے۔ میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔ پھر بھی بس یادوں کی کتاب کو کھول کر کہیں کہیں سے پڑھ دیتا ہوں۔

میری عمر تقریباً سات برس کی ہوگی، میسور یونیورسٹی کی ڈاکٹر آمنہ خاتون ریسرچ کے لیے رام پور آئیں اور ہمارے ساتھ ہی قیام کیا۔ ایک روز انھیں کہیں جانا تھا، میری آپا سواری میں ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی ضد کی مگر بچوں کی ضد کا جو انجام ہوتا ہے، وہی میری ضد کا بھی ہوا۔ نتیجے میں رونے لگا۔ گرمی کے دن تھے اور شام کا وقت۔

ابّا پلنگ پر لیٹے آنگن میں آرام فرما رہے تھے۔ میں باہر سے گھر میں آکر کمرے کے کواڑ کی اوٹ میں کھڑا ہو کر اپنی ناکامی پر رو رہا تھا۔ گھر کے دوسرے افراد اس رونے کو سُنی ان سنی کرتے رہے۔ اُسی زمانے میں، میں نے بھائی جان کی زبانی سیف الدین سیفؔ کی ایک غزل اکثر سنی تھی، مجھ پر اس وقت جو کیفیت گزر رہی تھی وہ غزل اُس کی کتنی ترجمانی کرتی تھی، یہ تو میں کیا جانتا مگر ردیف کی تکرار کچھ اپنے حسبِ حال معلوم ہوئی اور میں نے اس کا مطلع اپنی روتی ہوئی آواز میں پڑھا :

ہم کو تو گردشِ حالات پہ رونا آیا
رونے والے! تجھے کس بات پہ رونا آیا

ابّا نے اِس شعری ترجمانی کو سُن لیا، مجھے آکر پیار کیا، ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لائے۔ خود ہی منہ دھلایا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ساتھ دل دہی کی خاطر بازار لے گئے۔

ابّا کا روز شام کا معمول یہ تھا کہ جب لائبریری سے لوٹ کر آتے، تو آرام کرتے۔ اتنی دیر میں چائے بن جاتی اور سب گھر والے ایک ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے۔ یہی وہ وقت تھا جب ہم سب لوگ ابّا سے اپنے اپنے سوالات کرتے اور وہ ان کا جواب دیتے۔ اگر ہم کچھ نہ پوچھتے تو خود سوالات کرتے۔ کبھی شعر پڑھتے اس کا مطلب پوچھ لیتے، کبھی شاعروں اور ادیبوں کے دل چسپ قصّے سناتے۔ عربی کے مقولے، فارسی کی حکایات سناتے۔ ان سب باتوں سے ان کا مقصد ہماری عام معلومات کو بڑھانا اور طور طریق اور عادات و اطوار میں سدھار پیدا کرنا ہوتا تھا۔ ان میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ وہ بغیر زبان سے کہے اپنی مرضی کا ہر کام ہم لوگوں سے کرا لیتے تھے۔ پرانے مقولے اور حکایات سنا کر وہ یہ باور کرا دیتے تھے کہ ہمیں کس راہ پر چلنا چاہیے۔

شام کی چائے پر ہوئی کچھ دل چسپ باتیں میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ بھائی جان، اپنی طالب علمی کے دور میں علّامہ اقبال کے بڑے ہی حمایتی تھے۔ غالبؔ سے اس زمانے میں کچھ خاص دوستی نہ تھی۔ آپا اور باجی بھی بھائی جان کے گروپ میں تھیں۔ یوں تو ابّا بھی اقبال کو بہت پسند کرتے تھے مگر قدرتاً غالبؔ کا تذکرہ اکثر رہتا، اور زیادہ تر ڈبیٹ

یا مباحثہ کی صورت پیدا کرنے کی غرض سے گفتگو میں غالبؔ کی حمایت کرتے تھے۔ ایک روز اقبالؔ اور غالبؔ کا تقابل ہو رہا تھا۔ میں ابّا کے ساتھ تھا۔ گفتگو چل رہی تھی کہ غالبؔ اچھا شاعر تھا یا اقبالؔ۔ دونوں گروپ شعر پڑھ پڑھ کر ایک دوسرے کو مطمئن کرنے کی کوشش میں تھے جب بھائی جان کا گروپ کمزور پڑنے لگا تو آپا نے اپنی نظر میں آخری کارگر حربہ کیا۔ کہنے لگیں : ابّا آپ بھی ایسے شاعر کے طرف دار ہیں جو شرابی تھا۔ میں ابّا کی چارپائی پر بیٹھا اس بحث کو سُن رہا تھا۔ ابّا کی حمایت میں بولا کہ غالبؔ شرابی تھے تو کیا اقبالؔ بھی شرابی تھے۔ بھائی جان، آپا اور باجی تینوں نے میری طرف غضب آلود انداز میں دیکھتے ہوئے ایک ساتھ پوچھا : وہ کیسے؟ میں نے کہا وہ تو ایک روز شراب پی کر جا رہے تھے۔ ٹھوکر کھا کر گر پڑے اور پھر یہ شعر کہہ دیا۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی

بھائی جان نے قدرے لہجہ بدل کر کہا یہ شعر ہے واقعہ نہیں۔ کچھ ایسا ہی انداز آپا اور باجی نے اختیار کیا۔ ابّا مسکرائے اور بولے : بھئی بحث میں جس نے غصّے سے کام لیا وہ ہارا۔ غصّے میں کوئی شخص معقول دلیل کبھی نہیں دے سکتا۔

ایک روز باجی سے کہنے لگے : باجی! تمھارے بھائی جان بھی اب ماہرِ غالبیات ہیں، کہو تو ان کا کچھ امتحان لیا جائے۔ باجی نے کہا ضرور۔ فرمایا : ذرا اُن سے جا کر پوچھو کر غالبؔ کا وہ کون سا شعر ہے جو انھوں نے غلط جگہ پر استعمال کیا ہے۔ باجی نے بھائی جان سے جا کر پوچھا۔ بھائی جان نے بہت یاد کیا مگر یاد نہ آیا، تو باجی کے ساتھ ہی آ گئے اور کہا : ابّا! اب آپ ہی بتائیے۔ ابّا بولے : ایسے نہیں، پہلے کہو : ہار گئے، لوہے کے چنے چاب گئے۔ ہم سب لوگ ہنسنے لگے۔ پھر ابّا نے فرمایا کہ غالبؔ کا یہ شعر :

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

صرف رسولِ اکرمؐ کے لیے ہونا چاہیے تھا، مگر انھوں نے یہ شعر تجمل حسین خاں

کے لیے کہا ہے۔

میں نے اپنی ملازمت برہان پور کے قادریہ سائنس کالج سے شروع کی۔ اسی دوران وہاں ایک بزرگ صوفی پیر سے، جو بہت بااثر اور سیاسی رسوخ بھی رکھتے تھے، میرے مراسم ہو گئے۔ روز مغرب کی نمازیں ان کی خانقاہ میں پڑھتا۔ ایک سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ قادریہ کالج کا انتظام داؤدی بوہروں کے ہاتھ میں تھا۔ جب ایک بوہرا لڑکا معمولی سکنڈ کلاس ایم۔ ایس۔ سی پاس کر کے آگیا تو اُنھوں نے میری فرسٹ کلاس کو نظر انداز کرتے ہوئے ملازمت سے علاحدہ کر دیا۔ میں حسب معمول شام کو پیر صاحب کے پاس پہنچا اور پورا واقعہ سنا کر کہا کہ میں انشاء اللہ دو تین روز بعد چلا جاؤں گا۔ پیر صاحب نے فرمایا: نہیں تم کو یہیں رہنا ہے، واپس اپنی جگہ لینا ہے اور کوئی طاقت تم کو برہان پور چھوڑنے پر مجبور نہ کر سکے گی۔ پیر صاحب نے (خدا ان کو جزائے خیر عطا فرمائے) اپنے سیاسی رسوخ کا استعمال کیا، میرے لیے وظیفہ پڑھا، غرض کوئی جتن نہ چھوڑا۔ میں یہ باتیں ابّا کو بھی لکھتا رہا۔ ابّا نے کسی قسم کی مخالفت نہ کی۔ لڑکوں نے بھی میری واپسی کے لیے ہڑتال کی۔ ابّا نے اس کی مخالفت کی اور مجھے لکھا کہ لڑکوں کو اپنے طور سے یہ سمجھاؤ کہ فتنہ و فساد برپا نہ کریں۔ اس جدوجہد میں ۳ ماہ نکل گئے۔ عید قریب آگئی، تب ابّا نے لکھا کہ تمھاری والدہ کی خواہش ہے کہ تم عید ہمارے ساتھ ہی مناؤ۔ میں اپنا سامان لے کے رام پور آگیا اور پھر واپس برہان پور نہیں گیا۔ برہان پور سے میں نے ابّا کو اپنی ذہنی پریشانی کے بارے میں لکھا، انھوں نے مجھے جو جواب لکھا، وہ یہ تھا:

میاں سلامت رہو!

تمھارا خط ملا۔ اُس کے جواب میں سب سے پہلے قرآن پاک کی تین آیتیں سناتا ہوں، ارشاد باری ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا

(یعنی زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو۔)

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ تمھارا رزق بھی اللہ کے ذمے ہے۔

دوسرا ارشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

مطلب یہ ہے کہ ہم ضرور بالضرور تمھارا امتحان لیں گے اور مضامین ہوں گے خوف، بھوک، اور مال و جان، پھلوں یا اولادوں کا نقصان۔ جو لوگ اس آزمائش میں پورے اتریں گے، اُنھیں خوش خبری دے دو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب اُنھیں کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اُن کے پروردگار کی برکتیں اور رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور یہی لوگ فلاح و بہبود پاتے ہیں۔ اس سے یہ سمجھ میں آیا کہ تمھارا امتحان لیا جا رہا ہے۔

تیسرا ارشاد ہے:

وَ مَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُه

یعنی جو اللہ پر بھروسا کرے گا، اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہر حال میں اللہ پر بھروسا کرنا چاہیے۔

مولانا روم نے کہا ہے۔

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما، آزارِ ما

یعنی تمھارا کام بنانے والا ہر وقت ہمارا دھیان رکھتا ہے، ہم اپنی فکریں کیوں دکھ اٹھائیں۔ ایک اور رُباعی ہے۔

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں، جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ بھی ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

اوپر لکھی ہوئی آیات اور اشعار کی روشنی میں دیکھو کہ کیا تمہارا موجودہ رویّہ درست ہے۔ تم ایک معمولی سی غیر مستقل ملازمت کے جانے سے صبر کا دامن چھوڑ بیٹھے ہو اور ربّ العالمین کی پروردگاری میں شک کرنے لگے۔ خدانخواستہ اِس سے بڑا امتحان درپیش آگیا تو شاید ایمان سے دست بردار ہو جاؤ گے۔ ایسے انسان بھی موجود ہیں جو فقر و فاقے کی زندگی میں شکرِ الٰہی بجالاتے ہیں اور کسی حال میں بھی آئینۂ دِل کو غبارِ شک سے مکدّر نہیں ہونے دیتے۔ تم خدا کے فضل سے مومن ہو اور ایسے گھر میں پیدا ہوئے ہو جس نے فقر و فاقہ قبول کیا، مگر اپنے دل کو مطمئن رکھا، علم و درویشی اختیار کی اور دولت وجاہ کو ٹھکرایا۔ تم بھی مردِ مومن کی طرح نڈر اور صابر بنو اور یہ پڑھا کرو۔ افوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد

یعنی میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ بیشک اللہ بندوں کو برابر دیکھ رہا ہے۔ اِس سے تمھارے اندر سکون و اطمینان پیدا ہو جائے گا۔"

برہان پور سے واپسی کے بعد جلد ہی مجھے رام پور ہی میں رضا ڈگری کالج میں سرکاری ملازمت مل گئی۔ جس روز میں نے نئی ملازمت شروع کی اور حسبِ معمول ہم لوگ شام کی چائے پر اکٹھا ہوئے، تو ابّا نے فرمایا: لاؤ بھائی "مُناج خاں" مٹھائی کھلاؤ۔ میں نے عرض کیا: مٹھائی تو آپ کھلائیے، آپ کے بیٹے کو سرکاری ملازمت ملی ہے۔ تب فرمایا: میں ملازمت کی مٹھائی نہیں مانگ رہا ہوں، وہ تو ہم سب کو تمھاری ماں کھلائیں گی۔ میں اِس بات کی مٹھائی مانگ رہا ہوں کہ اللہ نے تمھیں گمراہ ہونے سے بچالیا۔ اگر تمھیں دوبارہ برہان پور میں ملازمت مل جاتی تو تم ہمیشہ یہی سمجھتے کہ لوحِ محفوظ پر لکھی چیز کو پیر صاحب پڑھ سکتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ علمِ غیب سوائے خدا کے کسی دوسرے کو نہیں ہوتا۔

ایک شام چائے پینے کے دوران ذکر نکل آیا اولاد کی ماں باپ سے محبت کا۔ امّاں کہنے لگیں کہ یہ لوگ ہم سے ویسی محبت کیا کریں گے جیسی محبت ہم کو ان سے ہے۔ ابّا مسکرائے، میری طرف دیکھا اور کہا: مگر اس کی وجہ فطری ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا؟ فرمانے لگے: تم نے پڑھا ہو گا کہ اولاد میں جو خواص آتے ہیں، وہ ماں باپ سے آتے ہیں۔

میں نے کہا: جی ہاں۔ فرمایا: ماں باپ میں اُن کے ماں باپ سے اور اُن کے ماں باپ میں اُن کے ماں باپ سے۔ اِس طرح یہ سلسلہ آخر میں جاکر آدم اور حوّا پر تمام ہوتا ہے۔ یعنی آدم اور حوّا میں جو خواص تھے، نہ اُن کے ذہنوں میں ماں باپ کا تصوّر ہی تھا، اُن کے تو بس اولاد تھی! اِس لیے انسانی خمیر میں صرف اولاد کی محبت ہے۔ ماں باپ کی محبت تو کچھ ساتھ رہنے کی وجہ سے ہے۔ کچھ سماجی اور اخلاقی رسوم کے باعث ہے۔ میں خود بائلوجی کا طالب علم ہوں، مگر میں نے کبھی اس پہلو پر سوچا نہ تھا، مگر ابّا کو بغیر پڑھے بھی خواصِ وراثت کے قانون معلوم تھے۔

ایسے ہی ایک شام بات چل رہی تھی فقیروں اور سادھوؤں کی کہ یہ لوگ تعویذ دیتے ہیں اور کام ہو جاتا ہے۔ ابّا فرمانے لگے: بیٹے! ہر کام کے ہونے یا نہ ہونے کا پچاس فی صد امکان ہوتا ہے۔ تم کسی سادھو یا فقیر کے پاس گنڈے تعویذ لینے جاؤ کہ میں اوّل درجے میں کام یاب ہو جاؤں اور وہ تعویذ دے دے، نتیجہ آئے تو تم اوّل درجے میں کام یاب بھی ہو جاؤ، تو ہزار جگہہ کہو گے کہ فلاں بزرگ یا مہاراج کی کرامت ہے! لیکن فیل ہو گئے تو کسی سے بھی نہ کہو گے کہ فلاں بزرگ سے تعویذ لکھوایا تھا اور وہ بے کار ہو گیا۔ اب اگر تم جاکر تعویذ دینے والے سے ناکامی کی بات کرو تو ان کا جواب یہ ہو گا کہ اوپر والے کی مرضی ہی نہ تھی۔ اِس صورت میں اوّل درجے کی کامیابی کا کریڈٹ تو سادھو یا فقیر کو چلا جائے گا اور ناکامی کی ذمّے داری خدا کو یا ایشور کو۔ ابّا کے سمجھانے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ تو LAW OF PROBABILITY ہے۔

ابّا ہم لوگوں کو صرف ادبی باتیں، قصّے، حکایتیں اور اشعار ہی نہیں سُناتے تھے، بلکہ ہمارے ساتھ کھیل میں بھی حصّہ لیتے تھے، جس سے ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ہم لوگوں میں اسپورٹ مین اسپرٹ پیدا ہو۔ اکثر ایسا ہوتا کہ ابّا کمزور پارٹی کی طرف ہو جاتے تاکہ اس کا حوصلہ بڑھ جائے۔ اگر شام کو وہ آنگن میں لیٹے ہوتے اور ہم بھائیوں میں سے کوئی پتنگ اُڑاتا، تو وہ یہ بتاتے تھے کہ کس طرح پیچ لڑاؤ۔ میں شطرنج کا شوقین ہوں، مگر ابّا کے سامنے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ ایک مقابلے میں، میں نے ٹرافی جیت لی تو اگلے روز مقامی اخبار

میں یہ خبر چھپی۔ ابّا نے خبر پڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا: بہت خوب، ہمیں نہ معلوم تھا کہ آپ اِس ہُنر میں بھی یکتا ہیں۔ قدرے ٹھہر کر فرمانے لگے: میں نے کہیں ایک قصّہ پڑھا تھا کہ کسی بادشاہ کو دل آرام نامی طوائف بہت عزیز تھی اور وہ شطرنج بھی اچھا جانتی تھی۔ ایک روز بادشاہ کسی دوسرے بادشاہ سے بازی لگا کر شطرنج کھیلا اور سب کچھ ہار گیا، بس دل آرام بچ گئی۔ اگلی بازی میں بادشاہ نے دل آرام کو بھی شرط میں لگا دیا۔ کھیل شروع ہوا۔ دل آرام بادشاہ کے پاس بیٹھی تھی اور بادشاہ یہ بازی بھی ہارنے والا تھا کہ یکایک دل آرام نے بادشاہ کو یہ کہہ کر چال بتائی:

شاہا! دو رُخ بدہ، پہ دل آرام رامدہ
فیل و پیادہ پیش کن واسپ کشت، مات

بادشاہ نے یہ چالیں چلیں اور بازی جیت لی۔ پھر فرمایا: مگر میں نے شطرنج کے کئی کھلاڑیوں کو یہ سُنا کر پوچھا کہ کیا کوئی ایسا نقشہ ہے تو انھوں نے انکار کر دیا۔ اگر تمھیں معلوم ہو تو بتاؤ۔

اِس واقعے سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابّا اگر قصّے کو بھی پڑھتے تو وہ برسہا برس تک اُن کے حافظے میں محفوظ رہتا۔

ابّا کے پاس اکثر لوگ مسئلے مسائل لے کر اُن کے حل کے لیے آتے۔ اُن کی باتوں کو ابّا بہ غور سنتے اور انتہائی سادہ اور شیریں لہجے میں معقول دلائل سے اُنھیں سمجھاتے یہاں تک کہ مخاطَب کی سمجھ میں بات آجاتی۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب نے جو معمولی اردو لکھ پڑھ سکتے تھے، قرآنِ پاک کی تلاوت کے دوران یہ آیت اور اس کا ترجمہ پڑھا:

اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ

تمھارا مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے فتنہ ہیں۔ اس کے بعد وہ ابّا کے پاس لائبریری پہنچے اور اس کا مطلب جاننا چاہا۔ ابّا نے اس کا مطلب بتایا مگر ان کے سوالات جاری رہے، حتّٰی کہ لائبریری کے وقت کے بعد یہ صاحب ابّا کے ساتھ گھر آ گئے۔ نشست گاہ میں انھیں بٹھا دیا گیا۔ ابّا نے نمازِ عصر ادا کی اور نشست گاہ میں آ گئے۔ دوبارہ سمجھانا شروع کیا۔

مغرب کا وقت ہو گیا اور یہ صاحب اپنے گھر چلے گئے۔ دوسرے روز بھی یہی معمول رہا۔ تیسرے روز یہ پھر لائبریری پہنچے اور ابّا کے ساتھ ہی گھر آ گئے۔ ابّا نے تین روز میں انھیں طرح طرح سے سمجھایا مگر وہ یہی کہتے رہے کہ مولانا! قرآن اللہ کی کتاب، قیامت تک کے لیے ہے، یہ کیسے غلط ہو سکتا ہے۔ آخر ابّا نے تنگ آکر اُن سے کہا کہ یہ مسئلہ آپ کی سمجھ میں اب یوں نہیں آئے گا۔ اب آپ یہ کیجیے کہ پہلے اپنی دولت غریبوں میں بانٹ دیجیے اور اولاد کو گھر سے باہر نکال دیجیے، پھر میرے پاس تشریف لائیے۔

ایک بار ایسے ہی طلاق کے مسئلے میں ایک صاحب کئی روز آتے رہے، جو طلاق دے کر اب پچھتا رہے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ اُن کی مطلقہ بیوی واپس آجائیں۔ ابّا انھیں بتاتے رہے کہ طلاق تو ہو چکی۔ اس پر وہ صاحب کہنے لگے کہ میں نے تو طلاق غصّے میں دی تھی۔ ابّا نے فرمایا کہ بھائی! اگر ہنسی خوشی میں آج تک کسی نے طلاق دی ہو تو مجھے بھی اس کا نام بتائیے۔

منوّر بھائی حجام ابّا کے بال ہر جمعہ کو آکر بناتے تھے۔ وہ پہلے نواب رضا علی خاں کے محل میں بھی ملازم رہ چکے تھے۔ وہ جتنی دیر بال بناتے ابّا کو نواب صاحب کے قصّے اور لطیفے سناتے رہتے۔ ہمارے ایک قریبی عزیز سے ابّا ناراض تھے۔ انھوں نے منوّر بھائی سے کہا کہ مولانا سے مجھے معاف کرادو۔ منوّر بھائی اُس وقت ابّا کے بال تراشنے آرہے تھے۔ ان صاحب کو اپنی دُکان پر بٹھایا اور کہا: دیکھو کوشش کرتا ہوں۔ منوّر بھائی نے آکر بڑی سنجیدگی کے ساتھ بال تراشنا شروع کر دیا۔ چوں کہ سنجیدگی منوّر بھائی کا معمول نہ تھی، اس لیے کچھ ہی دیر میں ابّا نے دریافت کیا: منوّر بھائی آج چُپ کیوں ہیں؟ منوّر بھائی اس سوال کے لیے تیار تھے۔ بڑی اداکاری سے بولے: میاں، میں ایک مسئلے پر رات سے سوچ رہا ہوں۔ ابّا نے پوچھا: کیا مسئلہ ہے؟ منوّر بھائی بولے: میاں یہ بتائیے کہ کیا اللہ قصور کو معاف کر دیتا ہے۔ ابّا نے فرمایا: بے شک وہ رحیم و کریم ہے، اگر بندہ سچے دل سے توبہ کرے تو وہ معاف کر دیتا ہے۔ منوّر بھائی یہ سُن کر پھر بولے: میاں کیا حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہر قصور کو معاف کر دیتا ہے۔ ابّا نے پھر وہی جواب دیا۔ منوّر بھائی بولے: تو کیا

میاں آپ اللہ تعالیٰ سے بھی بڑھ کریں۔ ابّا نے تعجب سے پوچھا: کیا؟ منوّر بھائی نے پھر اپنی بات دہرائی۔ ابّا بولے: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔ منوّر بھائی نے کہا: میاں جب اللہ اپنے بندوں کے قصور معاف کر سکتا ہے، تو آپ فلاں صاحب کو کیوں معاف نہیں کر سکتے۔ ابّا چپ ہو گئے۔ منوّر بھائی اسی حالت میں ابّا کو چھوڑ کر بھاگے ہوئے اپنی دُکان پر گئے اور ان صاحب کو اپنے ساتھ لے آئے۔ ابّا نے اُنھیں معاف کر دیا۔

ابّا کو پہلی بار ۱۹۶۳ء میں دردِ دل کا عارضہ ہوا۔ فوراً خاندانی ڈاکٹر مراری لال گپتا کو بلایا گیا۔ جب وہ آئے تو دردِ دل کی کیفیت میں ابّا نے کہا: ڈاکٹر صاحب! میں چاہتا ہوں کہ عربی کیٹلاگ مکمّل کرنے کی مہلت مل جائے۔ اس وقت ابّا کو گھر کے کسی فرد کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ہماری امّاں کا ۱۹۷۸ء میں پتّے کا آپریشن دہلی میں ہوا، اس وقت میں وہاں موجود تھا۔ جب آپریشن کے بعد اُنھیں ۲۰۷ ۔ ٥ میں بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا، تو وہ اپنی اولادوں کا نام لے رہی تھیں۔ ابّا کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ میں نے رام پور واپس آکر ابّا کو یہ بات بتائی۔ اسی روز شام کو راج ماتا رفعت زمانی بیگم صاحبہ، جو ابّا کو اپنا بھائی کہتی تھیں، امّاں کی مزاج پُرسی کو تشریف لائیں۔ گفتگو کے دوران ابّا نے راج ماتا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: مجھے آپ کی بھاوج سے بڑی شکایت ہے۔ انھوں نے دریافت فرمایا: کیوں؟ ابّا نے کہا کہ بے ہوشی کے دوران انھیں گھر کے سب لوگ یاد آئے، بس میں یاد نہ آیا۔ راج ماتا نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ کو جب قلب کا دورہ پڑا تھا تو آپ نے بھی عربی کیٹلاگ کو یاد رکھا۔ ابّا اس جواب سے بہت محظوظ ہوئے۔ گفتگو میں اکثر اشعار بے ساختہ ابّا کی زبان پر آجاتے تھے، جو کیفیت کے بہترین عکّاس ہوتے۔

ایک روز میں، ابّا اور بھائی جان لائبریری سے ساتھ ساتھ لوٹے۔ گھر میں داخل ہونے پر آج خلافِ معمول پوتا پوتی میں سے کوئی اُن کا بید لینے آگے نہیں بڑھا جو دروازے سے گھستے ہی ابّا کے ہاتھ سے لینا ہر بچّہ اپنی شان سمجھتا تھا۔ بھائی جان سے پوچھا کہ کیا بچّے آج ننھیال چلے گئے۔ بھائی جان نے اثبات میں جواب دیا۔ ابّا نے یہ سُن کر غالب کا شعر پڑھا:

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں تو یہ کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

پھر فرمایا: بچّے گھر میں ہوں تو شور سے سارا گھر سر پر اٹھائے رہتے ہیں اور نہ ہوں تو آنکھیں ڈھونڈتی رہتی ہیں۔

ہماری امّاں فکر کی بات نہ ہو تب بھی فکر کی صورت پیدا کر لیتی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھائی سفر میں تھا اور کچھ عرصے سے اُس کی خیریت بھی نہ ملی تھی۔ غرض یہ ہوا کہ ابّا نے امّاں کو متفکّر دیکھ کر پوچھ لیا کہ بڑی بی! کیا بات ہے، خاموش کیوں ہو؟ بجائے کچھ جواب دینے کے اُن کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ ابّا مسکرائے اور فرمایا۔

پُر ہوں یوں شکوے سے میں، راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

باجی کو اپنی ریسرچ کے دوران کچھ حوالوں کی ضرورت تھی، انھوں نے ابّا کو ایک کاغذ پر نوٹ کر کے دے دیے کہ یہ نقل کرا دیجیے۔ جب شام کو ابّا واپس آئے تو باجی نے ان کی شیروانی اتارتے ہوئے اپنے کام کے بارے میں دریافت کیا۔ ابّا بولے: بیٹے! میں بالکل بھول گیا....... فلاں صاحب میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور تین چار گھنٹے مستقل اپنے قصّے سُناتے رہے۔ باجی ہنس کر بولیں: ابّا! آپ کا پیچھا بھی کیسے کیسے لوگ لیے رہتے ہیں۔ ابّا اس بات پر ہنسے اور فی البدیہہ ایک شعر کہا:

شہر میں جس قدر دِوانے ہیں
اپنا استاد ہم کو جانے ہیں

ابّا کا انتقال ہوا تو میرے پہلے بچّے کی عمر چھے مہینے کی تھی، اُسے اس عرصے میں میں نے ابّا کے سامنے کبھی گود میں نہیں لیا تھا اور نہ اُس کے سلسلے میں کوئی بات کی تھی۔ اُنھوں نے اگر کچھ کہا تو سُن لیا۔ ایک روز میرا بچّہ پلنگ پر لیٹا تھا۔ ابّا اس کے برابر کھڑے چٹکی بجا بجا کر اس سے باتیں کر رہے تھے۔ میری بیوی بھی پاس کھڑی تھیں۔ میں دبے پانو یہ منظر دیکھنے کے لیے دو تین بار اُدھر سے گزرا۔ ابّا میری دل چسپی کو بھانپ گئے، مسکرا کر میری

طرف دیکھا اور فرمایا:

ترے کوچے اس بہانے ہمیں دن سے رات کرنی
کبھی اس سے بات کرنی کبھی اس سے بات کرنی

اماں جب بھی کسی اولاد کے بارے میں کہتیں کہ یہ کھلاڑی ہے، پڑھتا نہیں، کھیل میں لگا رہتا ہے وغیرہ وغیرہ، تو ابا مسکرا کر کہتے: بخوبی! یہ میرے اوپر چلا گیا۔

ایک روز یہ مشہور مثل کہ "سر بڑا سردار کا اور پیر بڑا گنوار کا" گفتگو میں آگئی گفتگو میں شریک بڑے سر والے خوش اور بڑے پیر والے شرمندہ، کہ یکایک میں نے اپنے بچاؤ کا پہلو سوچتے ہوئے کہا کہ مگر ابا میرا تو سر بھی بڑا ہے اور پیر بھی بڑا۔ مسکرا کر فرمایا: چلو تم گنواروں کے سردار ہی سہی۔

پروفیسر علیم مرحوم علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ ابا کا بے حد احترام کرتے اور ابا کی بات کو نہ ٹالتے، یہ بات میرے علم میں تھی۔ ایک صاحب کو جن سے پروفیسر علیم بہت ناراض تھے، صرف ابا کے اِتنے کہنے کے بعد کہ آپ کے شعبے میں فلاں صاحب کی کمی ہے، شعبۂ عربی میں نوکر رکھ لیا تھا۔ اُس وقت علیم صاحب شعبۂ عربی کے صدر تھے۔ میں نے جب ایم ایس سی (باٹنی) پاس کیا تو پروفیسر علیم وائس چانسلر ہو چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ اگر ابا علیم صاحب کو لکھ دیں تو مجھے بھی ملازمت مل جائے گی، مگر ابا سے براہِ راست کہنے کی ہمت نہ پڑی، چناں چہ میں نے ابا کے بزرگ اور بھائی جیسے دوست سید حامد حسین جیلانی صاحب مرحوم سے کہا جو علی گڑھ میں میرے نگراں بھی تھے۔ وہ مجھ سے متفق ہو گئے اور انھوں نے ابا کو لکھا کہ آپ علیم صاحب کو لکھیں۔ ابا نے جیلانی چچا کی فرمائش پر پروفیسر علیم کو ایک مختصر خط اس مضمون کا لکھا:

"محترمی و مکرمی، ممتاز عرشی سلمہٗ آپ کے پاس حاضر ہو رہا ہے۔ اس کی مدد کر سکیں تو میں ممنون ہوں گا۔"

یہ خط جیلانی صاحب کے نام بھیجا کہ ممتاز کو دے دیجیے کہ وہ خود جا کر علیم صاحب سے مل لے۔ اور جیلانی چچا کو ان کے خط میں لکھا:

"میری پوری عمر کا تجربہ یہ ہے کہ جو کام میں نے صرف اللہ کے سپرد کیا اور کسی ظاہری سبب کو کام میں نہ لایا وہ بخوبی انجام پا گیا اور جس کام میں کسی شخص سے سفارش کی یا کرائی وہ کبھی نہ ہوا۔ دیکھیے اس امر میں کیا ہوتا ہے۔ خدا مالک ہے۔"

میں جب پروفیسر علیم سے ملنے گیا اور یہ خط انہیں بھجوایا تو وہ شام کی چائے پی رہے تھے۔ چپراسی سے مجھے وہیں بلوایا۔ چائے پلائی اور کام کے سلسلے میں پوچھا۔ میں نے بات بتائی۔ پروفیسر علیم مرحوم نے مجھے خوب ڈانٹا اور کہا کہ مولانا کو لکھنے کی ضرورت تمھیں کیوں پیش آئی، کیا تم خود آکر مجھ سے کہتے تو میں یہ کام نہ کرتا۔ میں وہاں سے خوشی خوشی یہ سوچ کر واپس ہوا کہ اب میرا کام ہو جائے گا۔ مگر آپ حضرات کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ واقعی یہ کام نہ ہو سکا۔ یہ ابا کی قوتِ ارادی بھی تھی اور خدا کی سازگاری پر بھروسا بھی۔

ایک بار ابا کو میں نے اُن کی ایک تصویر دکھاتے ہوئے کہا کہ آپ انھیں پہچانتے ہیں؟ دیکھ کر بولے: کچھ جانے پہچانے سے تو لگتے ہیں۔ میں نے درخواست کی کہ آپ اپنے دستخط فرما دیجیے۔ ہاتھ سے تصویر لے کر اُس کی پشت پر یہ شعر لکھا:

جائے کہ بلند بایدت بود
فرزندیِ من ندارت سود

یعنی اگر بلندی اور ترقی چاہتے ہو تو میرا بیٹا ہونا کام نہ دے گا۔ اِس سے بہتر نصیحت کوئی باپ اپنی اولاد کو اور کیا کر سکتا ہے۔

ابا کا انتقال ۲۴ فروری ۱۹۸۱ء کی رات کو ۲ اور ڈھائی بجے کے درمیان ہوا۔ اُس وقت سے لے کر آج تک ساغر جیلانی مرحوم کا ایک شعر (جو انھوں نے اپنے والد کے انتقال پر کہا تھا) حقیقت بن کر ہمارے ساتھ ہے۔

جو کچھ دنوں سے بڑا کوئی اپنا گھر پہ نہیں
تو جیسے دھوپ ہے، سایہ ہمارے سر پہ نہیں

ڈاکٹر زہرہ عرشی

میرے ابّا اور میں

آج ہی نہیں، گردشِ ایام جب بھی پیچھے کی طرف لوٹی ہے، ذہن پر ایک ہی تصویر اُبھری ہے: ہنستی ہنساتی، مسکراتی گنگناتی، کھیلتی کھلاتی، پڑھتی اور پڑھاتی ہوئی۔ زندگی کو میں نے جس زاویے سے بھی دیکھا ہے، وہ میرے لیے اسی ایک ہستی تک محدود رہی، لیکن میری یہ دنیا جسے سب نے مختصر سمجھا تھا، میرے لئے بہت وسیع تھی۔

کیا کچھ نہیں تھا میری اس دنیا میں، ایک شفق باپ کی محبّت، ماں کا پیار، بڑے بھائی کی دل داری، شفیق استاد کی تعلیم، مخلص دوست کی ہم دردی و غم خواری۔ یہی نہیں، زندگی کے تجربات اور ان کے اچھے برے نتائج، پیش آنے والے ممکنہ واقعات اور اُن سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت، دنیا بھر کی خوشیاں اور تفکرات، پرانی تہذیب اور موجودہ انقلابات اور اس کے اثرات! یہ سب کچھ میں نے اپنے ابّا کی صحبت میں بیٹھ کر اُن کی نگاہوں میں دیکھا اور ان کی زبان سے سُنا اور سمجھا تھا۔

اب یہ تو یاد نہیں کہ میری عمر کیا رہی ہوگی، البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ گھر میں رہ کر ابّا سے علاحدہ زندگی کا کوئی تصور نہ تھا۔ ان کی شیریں لے میں پشتو کی ایک چھوٹی سی لوری جو ہمارے خاندان میں سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے، آج بھی اسی طرح یاد ہے جیسے وہ میرے بچپن میں مجھے سلانے کے لئے گنگناتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے اُس وقت اس کے تصور سے بھی نیند آجاتی تھی، آج بستر کانٹوں کا محسوس ہونے لگتا ہے۔

مجھ سے انھیں بے حد محبت تھی، میرا دماغ بھی کچھ کم خراب نہیں تھا۔ صبح بیدار کرنے

کے لیے اگر ابّا آواز نہیں دیتے، تو سارا دن بے کیف گزرتا تھا۔ جب بہت چھوٹی تھی، اپنے سب کام اُنھی سے کرا کے خوشی ہوتی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابّا کے علاوہ کسی دوسرے سے بالوں میں کنگھا کرانا مجھے ناگوار تھا اور کبھی ایسا ہوتا، تو میں کچھ اس طرح منہ بسورتی کہ میرے ابّا ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر میرے بال سلجھاتے اور کنگھا کرتے تھے۔ برسوں بعد ایک بار باتوں باتوں میں ابّا نے مجھ سے پوچھا: کیا واقعی اُس وقت تمہارے بال دکھتے تھے؛ میں نے کہا: ابّا! بال نہیں، دل دُکھتا تھا۔ یہ سُن کر وہ آبدیدہ ہو گئے لیکن فوراً ہی مسکرائے اور میری امّاں سے کہا: تم نے اپنی بیٹی کو دیکھا، مجھے کتنا دھوکا دیتی تھی۔

کئی برسوں سے اُن کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ دوا کے ساتھ ساتھ غذا کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ پھل وغیرہ کھلاتے وقت اُن کی نگرانی بھی کی جاتی تاکہ وہ سب کچھ بچوں کو کھلا پلا کر مطمئن نہ ہو جائیں۔ وہ تیمارداروں کے اِن جذبات کو خوب سمجھتے اور ان کی قدر بھی کرتے تھے، مگر اپنی خو بھی بدل نہیں سکتے تھے۔ ایسے موقعوں پر ان کا انداز تجاہلِ عارفانہ کا ہوتا تھا۔ عموماً اُن لوگوں سے نظر نہیں ملاتے کہ اِس صورت میں مروّت پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اور گھر بھر کے بچوں کو کسی نہ کسی طرح مدعو کر لیتے تھے، کبھی اشاروں کنایوں سے اور کبھی آواز دے کر۔ اُس وقت اُن کے چہرے کی مسرّت دیکھنے کی ہوتی تھی۔ یہ ملحوظ رہے کہ میں خود بھی اُن چھوٹے بچوں میں بالکل اُنھی کی طرح شامل رہتی۔ اکثر عرق کا گلاس میرے ہاتھ میں یہ کہتے ہوئے دیتے: چپکے سے پی لو اگر ماں کو خبر ہو گئی، تو پٹ جاؤ گی۔ کیا آبِ حیات اس عرق سے زیادہ پُرلذّت ہو سکتا ہے؟

میرا دل شیشے سے سوا نازک تھا، لیکن ابّا کی "خو دل سے نازک" نہ تھی۔ آج مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جتنے نخرے اور جتنے ناز میں نے ابّا سے کیے تھے اور جس خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ اُنھوں نے میرے دل کو ٹھیس لگنے سے بچایا تھا، وہ صرف اُنھی کی ذات سے مخصوص تھا۔ کبھی کبھی لاشعوری طور پر جب وہی پُرانی عادت اپنا سر اُبھارتی ہے، تو دل کو سمجھانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔

میری بات وہ بہت کم ٹالتے تھے اور میں بھی اِس کا لحاظ رکھتی کہ مجھ سے کوئی ایسی بات

سرزد نہ ہو، جس سے اُنھیں دکھ ہو، لیکن اِس کے باوجود ہر چھوٹی بڑی بات میں اُن سے منوا لیتی تھی۔ اِس پر مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ اُنھیں گھر میں تصویر لگانا پسند نہ تھا۔ ابّا کی دو تصویریں میں نے ان لارج کرائی تھیں، بہت دن بکس میں رکھے رکھے جب خراب ہونے لگیں، تو میں نے فریم کرا کے کمرے میں کارنس پر رکھ دیں۔ ایک خوف تھا کہ ابّا خفا ہوں گے۔ ابّا جب لائبریری سے تشریف لائے تو دیکھا، سمجھ گئے یہ گستاخی کون کر سکتا ہے۔ میں بھی ڈری سہمی دو چار منٹ بعد ان کے پاس پہنچی۔ مجھے دیکھا، مسکرا کر کہا کہ: تمہارے دادا میاں تصویر کی آنکھیں کھرچ دیا کرتے تھے! بیٹی اگر چاقو لا دو تو تمہارے دادا کی سنّت میں بھی ادا کر دوں۔ میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ ابّا کی ناپسندیدگی کا تو اندازہ تھا، لیکن سزا اتنی سخت تجویز کی جائے گی، اِس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ میں نے تڑپ کر کہا: لیکن میرے دادا میاں میرے ابّا کی تصویر کبھی نہیں بگاڑتے تھے۔ وہ بھی شاید اس جواب کے لیے تیار نہیں تھے، مسکرا دیے اور فرمایا: خوب۔ خوب وہ ایک خاص انداز سے کہتے تھے، جس میں محبت بھی ہوتی تھی، شوخی بھی اور اجازت بھی۔

وہ انتہائی وضع دار اور بامروّت تھے۔ اگر کسی سے اُنھیں دلی تکلیف بھی پہنچتی، تو اظہار نہ کرتے بلکہ اُس بات کو اس طرح موڑ دیتے کہ کہنے والے نے کتنی ہی بدعقلی کی بات کہی ہو وہ سمجھنے لگتا کہ اُس نے بے حد سمجھ داری کی بات کہی تھی۔

اُنھیں اپنوں سے بھی تکلیفیں پہنچیں اور غیروں سے بھی، لیکن نہ کبھی جذبۂ انتقام پیدا ہوا نہ حُسنِ سلوک میں فرق آیا اور نہ حرفِ شکایت زبان پر آیا۔ یہ وضع داری اِس درجے تھی کہ ہر شخص اپنی جگہ یہ سمجھتا رہا کہ اُس نے کبھی ایسی بات ہی نہ کی جو تکلیف دہ رہی ہو۔

وہ جتنی دیر گھر میں رہتے، گھر زعفران زار بنا رہتا۔ لطیفے سُناتے، شعر و شاعری ہوتی، علمی و سنجیدہ گفتگو ہوتی، نصیحت ہوتی اور ہم بہن بھائیوں کا مختلف طریقوں سے امتحان بھی۔ نصیحت کی تلخی اور کڑواہٹ کا جتنا احساس میں نے اُن میں دیکھا، اُس کی مثال نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ نہ اُنھیں ہر وقت نصیحت کرنا پسند تھا اور نہ اِس انداز پر کہ سننے والے کی طبیعت مکدر ہو جائے۔ وہ انسان کو انسانیت کے معیار پر پرکھنے، اس کی خامیوں

کو نظر انداز کرنے اور خوبیوں کے اعتراف کے قائل تھے ۔ وہ خود ستائی سے نہ کبھی کام لیتے اور نہ دوسروں کے عیوب بیان کر کے اپنی زبان کو آلودہ کرتے ۔

بچپن میں ذہن پر جو نقوش مرتّب ہوتے ہیں، اُنھیں مٹانا آسان نہیں ہوتا۔ بہت سے واقعات میرے ذہن میں ہیں، جن میں سے ایک پر اکتفا کروں گی ۔ رام پور کی رسم کے مطابق میری تعلیم کا آغاز بھی کلام پاک سے ہوا تھا، جس کے لیے ایک استانی مقرّر کی گئی تھیں ۔ اُس کے تحت انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ جب جانماز سے اٹھو، تو ایک کونا ضرور موڑ دیا کرو ورنہ شیطان نماز پڑھنے لگتا ہے ۔ بچپن کی یہ بات ذہن میں کچھ اس طرح پیوست ہو گئی تھی کہ کبھی بھی میں نے اِس کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں سوچی ۔ ایک دن میرے چھوٹے بھائی نے نماز پڑھ کر جانماز کا کونا نہیں موڑا۔ بچپن کی تعلیم ناگواری سے پُکار اٹھی کہ جانماز کھلی نہ چھوڑو، شیطان نماز پڑھنے لگے گا ۔ ابّا لیٹے ہوئے تھے، ہنستے ہوئے اُٹھے اور کہا : ہماری باجی کے شیطان تو بڑے نیک ہیں (وہ مجھے پیار سے باجی کہتے تھے) جیسے ہی جانماز کھلی دیکھتے ہیں، عبادت میں مصروف ہو جاتے ہیں ۔ بیٹی ! اُنھیں بھی نماز پڑھنے کا موقع دیا کرو، اِسی بہانے نماز پڑھنے لگیں تو کیا حرج ہے ۔

وہ بہت غیور تھے اور اُن کے حالات نے اُسے جلا بخشی تھی ۔ ڈھائی سال کے تھے کہ اُن کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا ۔ اِس سے اُن کی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا، وہ کبھی پُر نہ ہو سکا۔ یہ حادثہ ایسا تھا جس کا احساس انھیں عمر بھر رہا۔ لیکن اس محرومی میں بھی ان کی نظر روشن پہلو پر رہتی تھی ۔ چنانچہ اکثر اعتراف کرتے کہ قناعت و توکّل اِسی حادثہ کی عطا کردہ دولت ہے ۔ یہی وجہ رہی کہ انھوں نے زندگی میں کبھی بھی کسی سے دستِ سوال دراز نہیں کیا ۔ اپنا کام خود کرنے کے عادی تھے اور کم زوری و نقاہت میں بھی اگر اُن کی خدمت کی جاتی، تو انھیں تکلیف پہنچتی تھی ۔ نہ انھیں کسی کا احسان لینا گوارا تھا اور نہ بھلائی کر کے جتانا ۔ نہ کبھی کسی کی غیبت سے کام لیا اور نہ کسی کے دل کو توڑ کر اپنی "انا" کے لیے تسکین کا سامان کیا ۔ "عدو کے دل میں" بھی وہ "راہ پیدا کرنے" کے قائل تھے اور "نوکِ خار سے نباہ" بھی ان کے لیے ناممکن نہ تھا ۔

لین دین کی بات ہو یا حُسنِ سلوک کی، وہ بے حد متواضع، فیّاض اور سخی تھے۔ ہماری پرورش میں شعوری اور لاشعوری طور پر یہی تعلیم حاوی رہی ۔ یہ مقولہ میں نے اُنھی سے سُنا تھا اور اُنھیں اس پر ہمیشہ کار بند بھی دیکھا کہ : اپنی ہستی کے لائق دو یا دوسرے کی ہستی کے مطابق ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اس طرح کے مواقع آتے، تو اُنھیں بے چینی رہتی تھی اور وہ زیادہ سے زیادہ سلوک کرنے کے باوجود بھی غیر مطمئن رہتے اور چاہتے تھے کہ جو کچھ کیا ہے، اس سے بھی زیادہ کر سکتے ۔

ایک بار ابّا نے مجھے ایک حدیثِ مبارک سُنائی کہ "ایک دوسرے کو تحفے دیتے اور لیتے رہو اس سے آپس میں محبت بڑھتی ہے" چوں کہ میں ابّا سے کھل کر بات کر سکتی تھی، اِس لیے حدیثِ مبارک سنتے ہی میں نے کہا : لیکن تعلیم تو یہ ہے کہ صرف دیتے رہا کرو لینے کی تمنّا نہ رکھو ۔ مسکرا دیے اور امّاں سے کہا : دیکھ رہی ہو، تمھاری بیٹی بہت گستاخ ہوتی جا رہی ہے، کسی دن پِٹ جائے گی ۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے : یہ بھی تو سمجھو کہ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے اونچا ہوتا ہے ۔ اَلْیَدُ الْعُلْیٰ خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی۔

میں نے مولانا رومؔ کا یہ شعر ایک دو بار نہیں، بار ہا ان کی زبان سے نہ صرف سُنا بلکہ اس پر ساری عمر عمل کرتے بھی دیکھا ہے :

گر توکّل می کنی، در کار کن
کار کن، پس تکیہ بر جبّار کن

لیکن میں جو اُن کی اولادوں میں بلا خوفِ تردید سب سے زیادہ قریب ہونے کا دعوٰی کر سکتی ہوں، اپنی فطرت کے اعتبار سے بہت جلد مایوسی اور نا اُمّیدی کا شکار ہو جاتی ہوں ۔ میرے ابّا کو میری اس کم زوری کا ہمیشہ احساس رہا، چنانچہ زندگی بھر وہ مجھ میں اعتماد، بھروسا اور یقینِ محکم پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے ۔

مجھے ہمیشہ سے اقبالؔ پسند ہے، ابّا غالبؔ اور اقبالؔ دونوں کے دل دادہ تھے۔ کم سنی ہی سے میرا اور ابّا کا مباحثہ اِس موضوع پر ہوتا تھا ۔ میں ساتویں کلاس میں تھی، اُس وقت میری کیا استعداد ہو سکتی تھی یہ بتانے کی ضرورت نہیں، مشکل سے دس پانچ شعر

رٹ لیے تھے۔ مطلب بھی ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتا تھا، مگر صاحب، ابّا سے پھر بھی بحث ہوتی۔ وہ بالعموم غالب کی تعریف کرتے، اُن کے شعر سناتے اور مطلب بتاتے جاتے تھے اور میں یہ سمجھتی رہتی کہ ابّا کے لیے تو بس غالب ہی سب کچھ ہیں۔ البتہ وہ میری ذہنی کیفیت کا پاس رکھتے اور جب مباحثہ کرتے، تو ایسا معلوم ہوتا گویا وہ مجھ سے ہار مان گئے ہیں۔ کس قدر خوشی ہوتی تھی اپنے علم و فضل کی بے کرانی پر! یہ کسے معلوم تھا کہ اِس اعترافِ شکست سے اعتماد اور حوصلے کی کمی کا علاج کیا جارہا ہے۔ اُسی زمانے میں ایک بار میں نے کہا: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ "غالباً" کیوں کہتے ہیں "اقبالاً" کیوں نہیں کہتے۔ ابّا اِس سے بہت محظوظ ہوئے تھے اور اُنھیں یہ بات اِس قدر اچھی لگی کہ انھوں نے میرے ماموں (اسحٰق الٰہی خاں صاحب مرحوم) سے یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا: آپ کی بھانجی نے ایک نیا لفظ اختراع کیا ہے۔ میں اپنی اِس "دانائی" پر اس قدر مطمئن اور خوش تھی کہ ایک عرصے تک "غالباً" ترک کرکے "اقبالاً" کہتی رہی تھی۔ میرے ابّا بھی مجھے اقبالاً ہی کہتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں تو اس لفظ کو بھول گئی مگر ابّا نہیں بھول سکے۔

جب ذرا شعور میں اضافہ ہوا تو میں میر کی جانب مائل ہونے لگی۔ ابّا کے لیے شاید میرا یہ میلان باعثِ تشویش ہوا۔ اس لیے نہیں کہ میر کے صفِ اوّل کا شاعر ہونے میں اُنھیں کلام تھا، بلکہ اِس لیے کہ اُن کی یاس پسند بیٹی، جسے وہ ہر طرح زمانے سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کررہے تھے، کہیں اُن کی ساری محنت اکارت نہ کردے۔ جب میں بی۔ اے میں تھی، ابّا نے وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہا شروع کردیا تھا:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ یہ شعر بھی اکثر سناتے تھے:

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

یہ عجیب و غریب بات تھی کہ میرے ابّا میرے لیے یہ کہہ رہے تھے، ہاں یہ میرے ہی ابّا کہہ رہے تھے۔ اِس کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا، میرا ذہن اُسے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ میرا ذہن کیوں قبول کرتا؟ میں نے تو اپنے گھر کے اندر اور باہر ابّا کے علاوہ کسی دوسری دنیا کا تصور ہی نہ کیا تھا۔ میں تو ہر ایک سے بے نیاز تھی، بس اپنے ابّا کی نظروں کو دیکھتی اور اُن کی خوشی و خواہش اور ان کی مرضی پر چلنے کی حتی الامکان کوشش کرتی تھی اور ابّا مجھے موجِ بلا سے دو چار ہلکے سے تھپیڑے کھلوا رہے تھے۔

میرا نارسا ذہن صرف اِس حد تک سمجھ سکا تھا کہ شاید ابّا مجھ سے خفا ہیں۔ متعدد بار سننے کے بعد میں نے ایک دن اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ جواب ملا: بیٹی! ابّا سے ہٹ کر بھی ایک دنیا ہے، وسیع و عریض۔ یہ دنیا تم سے شفقت چاہے گی، محبت چاہے گی، قربانی چاہے گی اور وہ سب جو اس نے تمھارے ابّا سے چاہا ہے۔ شاید خود کچھ دینے کو تیار نہ ہوگی۔ تمھیں اس کو یہ سب کچھ دینا پڑے گا اور دے کر ہی تم اپنے ابّا کی طرح خوشی اور اطمینان کی زندگی بسر کرسکوگی۔ دینے کی بات تو ابّا نے ہمیشہ ہی کہی تھی، یہ کوئی نئی بات نہ تھی، مگر عزلت پسند ذہن کو دوسری بات اچھی نہ لگی۔ آخر دنیا سے کیا واسطہ!

اب شاید وہ وقت آچکا تھا کہ انھوں نے اپنی تعلیم کا رُخ موڑ دیا تھا۔ وہ زندگی کے نشیب و فراز پر مجھ سے باتیں کرنے لگے تھے۔ انسانوں کے مختلف اطوار و اوصاف پر روشنی ڈالتے، لوگوں سے کیسے نباہ کیا تھا، اسے بتاتے، کس طرح غیروں کو اپنا بنایا تھا، اپنوں کی مہربانیوں کو کس طرح شہد کا گھونٹ سمجھ کر پیا تھا، اپنے پرایوں کے دُکھ پر کیسے افسردہ ہوئے تھے، غرض یہ کہ کیا کچھ نہیں تھا جو انھوں نے بتایا اور سمجھایا نہ ہو۔ جس کے نتیجے میں میرے اندر زندگی سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہورہا تھا۔

بی۔ اے کے بعد انھوں نے مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیجا۔ آج مجھے احساس ہے کہ علی گڑھ بھیجنے کا مقصد تعلیم تو تھا ہی لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی عافیت پسند بیٹی کو اس دنیا سے بھی آشنا کرانا چاہتے تھے جو اہلِ دانش کے نزدیک تجربہ گاہ ہے اور جس سے نبٹنے کے لیے وہ برسوں سے تیار کررہے تھے۔ علی گڑھ جاتے ہوئے مجھے تکلیف بھی تھی اور خوف بھی۔

ابا سے پہلی بار دور جا رہی تھی، اس کی تکلیف تھی اور گھر اور باہر کے ماحول کا جو فرق تھا اس کا خوف۔ میں اپنے دل کا خدشہ اپنے ابا سے نہیں چھپا سکتی تھی، اظہار کر بیٹھی۔ اُن کے الفاظ آج بھی ذہن پر ثبت ہیں: بیٹی! انسان اپنا ماحول خود بناتا ہے۔ تم جب تک خود نہ چاہو، تمھیں کوئی نہیں بدل سکتا۔ ہر چیز کا ایک کردار ہوتا ہے، ایک پہاڑ کا بھی، چھوٹے پتھر کا بھی اور ایک پتے کا بھی۔ پتا معمولی ہوا کے جھونکے سے دور جا گرتا ہے، چھوٹا پتھر معمولی جھٹکے کی تاب نہیں لا پاتا اور پہاڑ طوفانوں کا مقابلہ بھی استقامت سے کرتا ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم خود میں کتنا استحکام پیدا کر سکتی ہو۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، مجھے اپنے اللہ پر یقین ہے کہ وہ تمھاری مدد فرمائے گا، اور مجھے اپنی بیٹی پر بھی اعتماد ہے۔

میرا دل ہر تکلیف سے بے نیاز اور ہر خدشے سے صاف ہو چکا تھا مگر اس شدید ذمّے داری کا احساس اس وقت بھی اتنا ہی ہے جتنا اُس روز تھا جس روز اُنھوں نے مجھ پر اعتماد کر کے ایک ذمّے داری عائد کر دی تھی۔ میں اپنے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ پتے، پتھر اور پہاڑ میں سے کیا بن سکی، ہاں اتنا ضرور کہوں گی کہ میرے ابا نے مجھے بہت کچھ بنانا چاہا تھا۔ ایک ایسی فطرت کو جس کی حیثیت پرِ کاہ سے زیادہ نہ تھی، وہ اُسے پہاڑ کی طرح مضبوط اور محکم دیکھنا چاہتے تھے۔

ان سے اس گفتگو کے بعد میں علی گڑھ چلی گئی تھی۔ وہاں وہ دنیا تو نہ تھی جو میں نے اپنے ابا کے زیرِ سایہ پائی تھی اور اس سے بڑھ کر میری نادانی کیا ہو سکتی تھی کہ میں ہر شکل اور ہر شخصیت میں اپنے ابا کے کردار ہی کا عکس دیکھنا چاہتی تھی۔ وہاں تو وہ دنیا تھی جس کے لیے مجھے وہ برسوں پہلے سے آمادہ کر رہے تھے۔ زندگی کی حقیقتیں مجھ پر ایک ایک کر کے عیاں ہو رہی تھیں۔ مجھے ان سے بہت تکلیف پہنچتی تھی۔ ہر ہر قدم پر وہ مجھے بے اختیار یاد آتے تھے۔ اُن کی ساری تعلیم کے باوجود بھی میں خود کو پسپا ہوتا محسوس کرتی تھی، لیکن جب میں رام پور پہنچتی اور ابا سے بات کرتی تو وہ باتوں ہی باتوں میں میرے سارے ملال کو دھو کر رکھ دیتے تھے اور میں ایک نئے عزم کے ساتھ واپس آتی تھی۔ اُن کے انتقال سے کچھ ہی عرصے قبل کی بات ہے میں زیادہ آزردہ اور حالات سے مایوس تھی۔ چوں کہ اُن کی صحت کافی خراب ہو چکی تھی، اس لیے میں نے ان حالات

کو پوشیدہ رکھنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ لیکن وہ تو میرے ابا تھے جنھیں مجھ سے قلبی تعلق تھا، اُنھوں نے مجھے خواب میں پریشان دیکھا تھا، اس لیے فوراً رام پور طلب کیا۔ ظاہر ہے علی گڑھ کی وہ مخصوص ادا جو ہر سونے کو تپا کر کندن بنانا چاہتی ہے، اُن پر عیاں ہو چکی تھی۔

اُس وقت میں بھی اپنے ابا سے اپنی کیفیت چھپا نہ سکی۔ اُنھیں بہت تکلیف پہنچی تھی، اس لیے کہ کندن بنانے والے وہ لوگ تھے جن سے ابا کو یہ توقع نہ تھی۔ جب میں نے اُنھیں یہ بتایا کہ اس کی وجہ سے میری فطری صلاحیتیں بھی متاثر ہوتی جا رہی ہیں، تو اس کا اثر ان کے چہرے سے ظاہر ہونے لگا، لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر ان کی شہ مل گئی تو میری قسمت میں سوائے شکست کے اور کچھ نہ لکھا جائے گا، اور شکست، یہ لفظ ابا کی لغت میں نہیں تھا، چنانچہ وہ دوسرے ہی لمحے یوں گویا ہوئے: تمھیں جن سے شکایت ہے، میں اُن کا شکر گزار ہوں۔ یہ اُنھی کے خلوص و مہربانی کا نتیجہ ہے کہ آج میں نے تم میں میدان میں جمے رہنے کا حوصلہ پایا ہے جو میرے لیے بہت ہی خوش آیند ہے۔ ان کے سامنے وہ تمام حالات تھے جن کے زیرِ اثر میں نے ابا سے یہ سب کچھ کہا تھا، لیکن حقیقت تو وہی تھی جسے ابا نے محسوس کر لیا تھا۔ غالباً انھیں اس خواب کی تعبیر مل رہی تھی جو وہ موجِ بلا سے ہلکے تھپیڑے کھلوا کر ساحل سے نظارہ کرنے والے کو سکھانا چاہتے تھے۔

وقت کوتاہ قصہ طولانی، بہر حال میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ ان کے ساتھ گزرا ہوا وقت کہانی بن جائے گا، لیکن یہ بھی محض اپنے ذہن کی کوتاہی تھی۔ ان کی جانب سے تو بارہا اس کے اشارے ہوئے تھے۔ چار چھے ماہ پہلے ہی ایک صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے میں نے کہا: اب اس دنیا میں اُن کے علاوہ کوئی مخلص نظر نہیں آتا۔ یہ سن کر ابا نے اپنی آنکھوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: بیٹی! جب یہ دو آنکھیں درمیان میں نہ رہیں تو اُن کا خلوص دیکھنا۔ اُنھوں نے اپنا پچپن سالہ تجربہ ایک جملے میں ادا کر دیا تھا، لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ تجربے کی کسوٹی کا وقت اتنا قریب آ پہنچا ہے۔ ابا کے انتقال کے بعد جو پہلے ہی غیر تھے، اُن کا تذکرہ فضول ہے، ہاں جو بہت زیادہ اپنے تھے، انھوں نے غیروں کی جگہ لے لی تھی۔

۸ر فروری ۱۹۸۱ء کو میں رام پور گئی۔ اس سے پہلے ابّا کا خط ملا تھا جس میں انھوں نے تحریر فرمایا تھا کہ اکوپنکچر کا علاج شروع کیا ہے جو حیرت انگیز حد تک موثر ثابت ہوا ہے لیکن جب پہنچی تو انھیں ہلکی حرارت تھی اور لائبریری سے رخصت پر تھے۔ میرے لیے حرارت اتنی تشویشناک نہیں تھی جتنی رخصت، اس لیے کہ ابّا کا لائبریری نہ جانا، اُن کی معمولی علالت کی غمازی نہیں کرتا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر شکایت کی کہ ابّا! اطلاع تو صحت یابی کی تھی لیکن، میں ابھی جملہ پورا نہیں کرنے پائی تھی کہ انھوں نے مسکرا کر کہا: آپ اپنے ابّا کے ٹھاٹ باٹ کیا جانیں، رئیسوں کی سیانی بھی تو فرماتے ہیں۔ پڑے پڑے کھانے اور چڑھے چڑھے پھرنے کی عادت جو پڑ گئی ہے۔ بہ ظاہر میں بھی اُن کے ساتھ ہنس دی لیکن یہ ہنسی خدشات کے اثر سے خالی نہیں تھی۔ ڈاکٹر کو دکھایا گیا، خون کی جانچ ہوئی، پتا چلا بلڈ میں یوریا کی مقدار بڑھی ہوئی ہے۔ اب اس کا علاج شروع ہوا اور چار پانچ روز میں ان کی طبیعت بحال ہونے لگی۔ جب انھوں نے خود کو بہتر سمجھا تو کہا کہ تم علی گڑھ جا کر اپنا فارم جمع کر دو۔ یہ آنے والے حادثے کا فطری اثر تھا کہ میں اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئی۔ ابّا کی خواہش کے خلاف ورزی میرے شعور کا پہلا واقعہ تھا، مجھ سے فرمایا: ہمارے دور میں اپنے ابّا کی بات نہ ماننا بدتہذیبی تھی۔ میں نے کہا: آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر میرا جانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔ ابّا نے اس بار بھی مسکراتے ہوئے فرمایا: اور اپنے ابّا سے اس کا اظہار کرنا بھی بے ادبی میں داخل تھا۔ میں خاموشی سے آمادۂ سفر ہو گئی۔ کیا جانتی تھی کہ ان کی آخری نصیحت سُن رہی ہوں۔

۲۳ر فروری ۱۹۸۱ء کی صبح روانہ ہوئی اور پچیس فروری کو صبح چار بجے جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہے، تو مجھے محسوس ہوا جیسے آسمان میرے سر سے ہٹ گیا ہے۔ علی گڑھ سے رام پور کا سفر کیسے طے کیا، مجھے نہیں معلوم، لیکن وہاں پہنچ کر جو میں نے محسوس کیا وہ یہ تھا کہ دونوں محبتیں ایک دوسرے کا امتحان لے رہی تھیں۔ ایک باپ کی محبت جو اپنی بیٹی کو بلکتا سسکتا نہیں دیکھ سکتی تھی، اس لیے آنکھیں کھول کر نہ دیکھ سکی۔ ایک بیٹی کی محبت جو اپنے ابّا کو ہمیشہ کے لیے رخصت ہوتے ہوئے دیکھتی رہی اور زندہ رہی!!

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

سید مسعود حسن

اِشاریۂ مقالاتِ عرشی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام بیسویں صدی کے محققین میں نہ صرف قابلِ ذکر ہے بلکہ قابلِ تقلید بھی۔ مشرقی علوم میں آپ کی حیثیت بلند پایہ عالم اور محقق کی ہے۔ آپ نے اردو فارسی تحقیق اور متنی تنقید میں جو معیار پیش کیا ہے وہ تحقیق اور تدوین کی پُرخار وادی کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ مسلم الثبوت ماہرِ غالبیات تھے۔ غالب شناسی میں آپ کو درجۂ استناد حاصل تھا۔ اپنی محنتوں اور کاوشوں سے اردو تحقیق کو ثمربار کرنے والی ایسی شخصیتیں اب ناپید ہیں۔ خدا جانے ایسے دیدہ ور پیدا کرنے کے لیے نرگس کو کتنے سالوں تک اپنی بے نوری پر آنسو بہانا پڑے گا۔

عرشی صاحب اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے اور تینوں زبانوں میں اپنی گراں قدر تصانیف چھوڑی ہیں۔ کئی قیمتی اور قابلِ قدر کتابیں عرشی صاحب کی کوشش اور ذوقِ جستجو کی وجہ سے پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئیں۔ "مکاتیبِ غالب" ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی اور اس اہتمام سے کہ طباعت میں سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ دوسری کتابوں میں انتخابِ غالب، فرہنگِ غالب، نادراتِ شاہی، رانی کیتکی کی کہانی، فہرست مخطوطات عربی و اردو (رضا لائبریری رام پور) قابلِ ذکر ہیں۔ اردو دیوان کے تنقیدی ایڈیشن پر انھیں ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔ ۱۹۷۲ء میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ان کی مسلّمہ قابلیت کے لیے سرٹیفکیٹ آف آنر سے نوازا گیا۔

پیشِ نظر اشاریہ عرشی صاحب کے مقالات اور ان پر لکھے گئے مضامین

نظموں، اداریوں پر مشتمل ہے۔ مقالات عرشی کی اب تک ایک جلد مجلس ترقی ادب، لاہور سے ۱۹۷۰ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس مجموعے میں شامل مقالات کے علاوہ ان کے بیشتر مقالات مختلف رسائل، کتابوں اور اخباروں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان مقالات کی افادیت کے پیش نظر ان کا موضوع وار اشاریہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں لاہور سے شائع شدہ مقالات بھی شامل ہیں۔ امید ہے یہ کوشش عرشی صاحب کے مطالعے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

مقالات امتیاز علی خاں عرشی

- **سیرت:** یارپاستان (تاریخ محمدی اور اس کے مصنف کے احوال و آثار) معارف اگست ۱۹۴۲ء
- تاریخ محمدی اور اس کے مؤلف کے احوال و آثار (مولف میرزا محمد حارثی بدخشی) مقالات عرشی ص ۴۳۰

تذکرہ علما و فضلا

- امام ابن حزم طاہری اور ان کی کتاب الانساب۔ مقالات عرشی ص ۱۶۷، سالانہ روئداد ادارہ معارف الاسلامیہ لاہور ۱۹۳۸ء ص ۱۷۰
- الامام الثوری و کتابہ فی التفسیر۔ دائرۃ المعارف حیدر آباد کی سلور جوبلی کے موقع پر پڑھا گیا اور انہی کی طرف سے شائع ہوا (۱۹۳۹ء)
- امام سفیان ثوری کے سوانح حیات اور ان کی تصنیفات۔ مقالات عرشی ص ۱، معارف اگست ستمبر ۳۵ء
- سمعانی اور اس کی کتاب الانساب (تاج الاسلام ابو سعد عبدالکریم بن محمد سمعانی (ف ۵۶۲ھ، ۱۱۶۶ء)۔ مقالات عرشی ص ۲۱۷، سالانہ روئداد۔ ادارہ معارف الاسلامیہ، لاہور ۱۹۳۶ء۔

- علامہ نجم الغنی خاں رام پوری۔ روزنامہ ناظم رام پور، ۲۹، ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء۔ قسط اول، دوم، ہماری زبان دہلی یکم جنوری ۷۵ء
- نجم الغنی۔ معارف، مارچ، اپریل، جون ۱۹۴۶ء مقالات عرشی ص ۲۷۲

تذکرہ ادبا

- إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ (سید سلیمان ندوی کے خطوط بنام عرشی صاحب) ریاض، کراچی اپریل ۱۹۵۴ء
- شبلی کی دو غیر مطبوعہ تحریریں (رضا لائبریری کی معائنہ بک سے) "معارف" اکتوبر ۴۳ء
- مولانا شبلی کے دو غیر مطبوعہ خطوط (بنام حکیم اجمل خاں دہلوی اور حافظ احمد علی خاں شوق رام پوری) "معارف" دسمبر ۱۹۴۲ء

تذکرۂ شعرا

- خاقانی عصر حضرت آسی رام پوری۔ "نیرنگ" رام پور اپریل ۱۹۲۷ء
- مولانا آسی اور ان کی شاعری۔ مقالات عرشی ص ۴۴۸
- خاقانی ہند علامہ آسی نظامی رام پوری۔ "نگار" اپریل، مئی، جون، اگست، ستمبر ۴۳ء
- انشا کی دو نادر کتابیں (ترکی کا روزنامچہ، سلک گوہر) نیا دور لکھنؤ اپریل ۱۹۶۰ء
- کچھ داغ کے بارے میں۔ "خاور" ڈھاکا مارچ ۱۹۵۳ء، "نگار" لکھنؤ اپریل ۵۳ء
- خطوط داغ۔ "اردو ادب" علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۲ء
- رئیس رام پوری۔ "شمولہ" رئیس رام پوری: شاعر اور زندگی" مرتبہ محمد اطہر مسعود خاں ص ۳۳۔
- سودا کا ایک قصیدہ، اردو ادب، علی گڑھ جولائی ۱۹۵۰ء
- دیوان ابو طالب کلیم (کتب خانہ رضائیہ میں موجود مجموعہ اشعار کا تعارف) برہان دہلی فروری ۱۹۵۴ء
- شیخ گدائی کنبوہ (عہد اکبری کا مشہور شاعر) اورنٹیل کالج میگزین لاہور نومبر ۱۹۳۴ء
- گدائی، حیاتی اور ان کے والد جمالی۔ اردو کراچی جولائی ۱۹۷۸ء، ہماری زبان مئی ۷۹ء

- آنندرام مخلص کے اردو شعر۔ 'معاصر' پٹنہ حصہ ۱ مئی ۱۹۵۱ء
- نواب الٰہی بخش معروف ۔ 'نیرنگ' ۔ دہلی جنوری، فروری ۱۹۳۴ء
- مومن کا فارسی کلام۔ 'پگڈنڈی' امرتسر جنوری ۱۹۶۰ء (مزید دیکھیے کتب و کتب خانہ)
- کلیات میر کا ایک نادر نسخہ ۔ دہلی کالج میگزین نومبر ۱۹۶۲ء میر نمبر "نقوش" میر نمبر اگست ۸۳ء
- ناسخ کے دفتر پریشاں کا بیش قیمت مسودہ ۔ قومی زبان کراچی مئی ۱۹۷۹ء (مزید دیکھیے کتب و کتب خانہ)
- وفا رام پوری ایک گمنام شاعر ۔ برہان دہلی فروری ۴۷ء شاہکار اکتوبر ۱۹۶۷ء
- وفا رام پوری : رام پور کا ایک گمنام شاعر۔ نیا دور کراچی شمارہ ۲۴-۲۳ - ۶۱ء
- انجان شاعروں کے اچھے شعر۔ نیا دور لکھنؤ مئی ۷۴ء
- شاعر کا قول و فعل ۔ معیار میرٹھ تنقید نمبر ۱۹۵۴ء
- یقولون مالا یفعلون (شاعر کا قول و فعل) شب خون الٰہ آباد اپریل ۱۹۷۷ء

غالبیات

- انشائے غالب ۔ 'کتاب نما' مارچ ۶۹ء، کتاب مارچ ۶۹ء
- اردو شاعری پر غالب کا اثر۔ نیا دور لکھنؤ مارچ ۶۹ء فضل الرحمٰن اسلامیہ کالج بریلی میگزین غالب نمبر ۷۰ - ۱۹۶۹ء 'فاران' اپریل ۱۹۴۹ء۔
- برہان قاطع پر غالب کے چند اعتراضات ۔ نیا دور لکھنؤ ۲۶ جنوری ۱۹۶۷ء
- تاثرات غالب (انٹرویو) علم و فن دہلی اپریل ۶۹ء دسمبر ۶۸ء
- تدوین اشعار غالب ۔ امین الادب لوہارو جون ۱۹۴۴ء
- ترجمہ منظوم دعار الصباح (غالب کی ایک نادر فارسی مثنوی کے مخطوطۂ رام پور کا تعارف) نیا دور لکھنؤ فروری، مارچ ۱۹۶۹ء غالب نمبر
- خلاصۂ غالب : اہم تاریخیں ۔ تحریک دہلی اپریل مئی ۱۹۶۱ء
- تبرکات غالب (مرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام) ۔ نیرنگ دہلی جنوری ۱۹۳۳ء

- دلی کے چند مشاعروں کی کہانی غالب کی زبانی ۔ تحریک دہلی فروری ۶۳ء
- دیوانِ غالب نسخۂ بدایوں : ایک نادر مخطوطہ۔ نیا دور لکھنؤ جنوری ۱۹۷۱ء
- دیوانِ غالب اردو نسخۂ عرشی ۔ نقوش لاہور نومبر ۱۹۶۴ء
- دیوان غالب کا ایک نادر انتخاب ۔ نقوش اکتوبر ۱۹۶۹ء غالب نمبر
- دیوانِ غالب ۔ نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۶۴ء
- دیوانِ غالب کا ایک نادر نسخہ ۔ نقوش جون ۶۰ء
- دیوانِ غالب کے ابتدائی مطبوعہ نسخے ۔ جامعہ دہلی ستمبر ۱۹۴۲ء
- سبد باغ دو در مصنفہ غالب : تعارف تلخیص، حواشی ۔ اردو کراچی جنوری فروری، مارچ ۱۹۶۹ء
- غالب اور قاطع برہان : چند غیر مطبوعہ تحریریں ۔ نیا دور لکھنؤ ۲۶ جنوری ۶۵ء
- غالب اور برہان ۔ تحریک دہلی اپریل مئی ۶۱ء، غالب نمبر اپریل ۶۸ء، نیا دور لکھنؤ مئی ۶۱ء
- غالب پر ایک گفتگو ۔ ماہ نو کراچی جنوری، فروری ۶۹ء غالب نمبر، ستمبر ۶۷ء آج کل دہلی فروری ۶۷ء
- غالب کے آثار فارسی ۔ فیض الاسلام ستمبر ۵۵ء
- غالب کے فارسی خطوط : ایک تحقیق ۔ ماہ نو کراچی فروری ۵۰ء فروری ۶۹ء غالب نمبر،
- غالب کی شعر گوئی اور ان کے دواوین ۔ علی گڑھ میگزین ۱۹۴۹ء غالب نمبر
- غالب کا معیار شعر و سخن ۔ نگار جنوری، فروری ۶۹ء
- غالب کی ایک غیر معروف فارسی مثنوی (مثنوی دعار صباح) نگار لکھنؤ مئی ۱۹۴۱ء
- غالب کے اپنے کلام پر اصلاحیں ۔ آج کل دہلی فروری ۱۹۵۲ء
- غالب کا دربار اور خلعت ۔ ہفتہ وار دورِ جدید اگست ۱۹۵۷ء اردو نمبر ماہ نو فروری ۶۹ء غالب نمبر، شاعر بمبئی، فروری، مارچ ۶۹ء غالب نمبر

- غالب کی چند نئی اردو تحریریں۔ اردو کراچی جنوری ۱۹۷۹ء، شاعر بمبئی مئی ۱۹۵۹ء خاص نمبر
- غالب کی تاریخ پیدائش۔ قومی زبان ستمبر ۶۹ء، ہماری زبان ۸ر جولائی ۶۹ء
- غالب کا خود نقل کردہ نسخہ دیوان غالب۔ آج کل جولائی ۶۹ء
- غالب کی نئی فارسی تحریریں۔ ماہ نو مارچ ۱۹۶۵ء فروری ۶۹ء غالب نمبر، نقوش نمبر ۶۵ء
- قاطع برہان کا پہلا مسودہ۔ مشمولہ 'نذر عابد' مرتبہ مالک رام ص ۱۷۹
- قاطع برہان غالب کا مسودہ۔ نیا دور لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۷۲ء
- کچھ غالب کے بارے میں۔ مہر نیمروز کراچی فروری ۱۹۵۸ء
- کچھ غالب کے متعلق۔ آج کل فروری ۵۸ء، انجام کراچی ۲۸ر فروری ۱۹۶۶ء، آج کل مارچ ۱۹۷۲ء
- کلام غالب کا انتخاب کس نے کیا۔ الشجاع کراچی جلد ۱۷، ۶۹ء غالب نمبر (خود غالب نے کیا تھا)
- مرزا غالب کے غیر مطبوعہ خطوط۔ معیار پٹنہ مارچ ۱۹۳۶ء
- مجلس یادگار غالب کا شائع کردہ "دیوان غالب"۔ "تحریک" اپریل ۶۹ء غالب نمبر
- مرزا غالب کا زائچہ۔ آج کل فروری ۶۷ء
- مرزا غالب کی اصلاحیں (نواب ناظم والی رام پور اور صاحبزادہ عباس بیتاب رامپوری کے کلام پر اصلاحیں) نگار لکھنؤ اکتوبر ۱۹۴۲ء
- مرزا غالب کی ثقل سماعت کی تاریخ۔ ہماری زبان ۲۲ر جولائی ۱۹۶۲ء
- مرزا غالب کی کچھ نئی فارسی تحریریں۔ اردوئے معلیٰ (۱) دہلی فروری ۶۰ء غالب نمبر ماہ نو کراچی فروری ۶۷ء
- مقدمہ دیوانِ غالب فارسی (مرتبہ عرشی) کے چند اوراق۔ نقوش فروری ۶۹ء غالب نمبر شاعر بمبئی فروری مارچ ۱۹۶۹ء غالب نمبر
- مکاتیب عرشی (غالب کے متعلق چند نکات) ماہ نو کراچی اکتوبر ۱۹۶۵ء

- نسخہ حمیدیہ کے چند اغلاط۔ مجلۂ عثمانیہ حیدر آباد ۱۷/۱ ۱۹۴۵ء
- نسخہ حمیدیہ اور بجنوری (دیوانِ غالب)۔ نیا دور لکھنؤ مئی ۶۱ء، العلم، اپریل جون ۶۹ء غالب نمبر
- نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کا سال (۱۹۶۱ء)۔ ہماری زبان ۸ر اگست ۶۱ء
- نسخہ حمیدیہ کی فرو گذاشتیں: نسخہ بھوپال کی روشنی میں۔ نیا دور لکھنؤ مئی ۱۹۶۹ء، "صحیفہ" جولائی ۶۹ء
- یاد غالب (غالب کا نظریہ شعر)۔ فروغ اردو لکھنؤ اپریل ۱۹۶۳ء
- یادگار غالب (مرزا غالب کا غیر مطبوعہ فارسی کلام)۔ "نیرنگ" دہلی اپریل مئی ۱۹۳۴ء

اقبالیات

- اقبال اور عراقی۔ "نقوش" اقبال نمبر ستمبر ۱۹۷۷ء
- اقبال و آرزوے نایافت۔ "برہان" دہلی جون ۴۶ء، نقوش اقبال نمبر دسمبر ۷۷ء، آج کل نومبر ۷۷ء
- تصور زمان و مکاں سے متعلق اقبال کا ایک ماخذ۔" اسلام اور عصر جدید" اکتوبر ۷۷ء
- جو ہو ذوقِ یقین پیدا (اقبال کے مشہور شعر سے متعلق)۔ اپریل ۴۶ء آل انڈیا ریڈیو سے نشر شدہ۔
- زماں و مکاں کی بحث سے متعلق اقبال کا ایک ماخذ عراقی یا مثنوی۔ مشمولہ مقالات جشنِ اقبال صدی مرتبہ محمد منور شعبہ اقبالیات، جامعہ پنجاب لاہور ۱۹۸۲ء

تذکرہ نگاری

- پیش لفظ (پہلی صدی ہجری سے لے کر ۱۴ر ویں صدی ہجری کے صوفیہ کے تذکروں کا جائزہ) مشمولہ حضرت غوث الاعظم: سوانح و تعلیمات از میکش اکبر آبادی ۱ء
- خاں آرزو کا تذکرہ مجمع النفائس۔ اردو کراچی اپریل ۱۹۷۹ء
- محسن کا ترجمۂ مخزن نکات (قیام الدین محمد قائم چاند پوری (م ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء) کے تذکرۂ مخزن نکات کا اردو ترجمہ)۔ "اردو" کراچی، اپریل ۱۹۶۷ء۔

داستان

- ہارون رشید کی مجلس داستان سرائی ۔ "نگار" دسمبر ۱۹۳۰ء

صحافت

- قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں ۔ "نوائے ادب" بمبئی اپریل ۱۹۵۸ء

تاریخ

- بابر کی موت کا واقعہ کیا تھا؟ ۔ "اردو" کراچی اپریل ۱۹۸۱ء
- بابر کی وفات ۔ مشمولہ نذر زیدی مرتبہ مالک رام ص ۸۹
- حول اخبار الزمان (مسعودی کی کتاب الاوسط کا ایک حصہ) "ثقافت الہند" دہلی ۱۹۶۱ء
- مولانا فضل حق خیر آبادی اور ۱۸۵۷ء کا فتوی جہاد ۔ "تحریک" دہلی اگست ۱۹۵۷ء
  نیا دور لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۸۱ء

تعلیمات

- زرنوجی کا نظام تعلیم و تعلّم ۔ "تعلیم جدید" رام پور ۱۹۴۶ء مقالات عرشی
  ص ۳۶۱، صحیفہ جنوری ۱۹۶۷ء

زبان و قواعد

- اردو زبان کی بناوٹ میں افغانوں کا حصہ ۔ "معارف" مارچ ۔ مئی ۱۹۴۹ء
- پشتو میں تذکیر و تانیث ۔ اورنٹیل کالج میگزین لاہور مئی ۱۹۴۸ء
- اردو کی تذکیر و تانیث پر پشتو کا اثر ۔ "اخبار اردو" اسلام آباد جولائی ۱۹۹۰ء
  ہماری زبان ۲۲ر اگست ۱۹۹۰ء
- تلفظ ایرانی در اشعار امیر خسرو (نون غنہ) ۔ "اردو" کراچی جنوری ۱۹۷۶ء
- ایک عروضی مباحثے پر محاکمہ (مکتوب عرشی صاحب بنام نیاز فتحپوری) ۔ "العلم"
  اپریل ۔ جون ۸۰ء
- محاورات بیگمات ۔ "اردو ادب" جولائی، دسمبر ۱۹۵۲ء
- Sir Jadu Nath Sircar Comme moration volume, 1965
- The influence of Pashto on Urdu

- قواعد اردو کی ایک غیر معروف کتاب دستور الفصاحت (حکیم احمد علی یکتا) ۔ اردو
  جنوری ۱۹۴۲ء

فارسی ادب

- آداب المتعلمین اور طوسی ۔ "مجلہ علوم اسلامیہ" علی گڑھ جون ۱۹۶۱ء مقالات عرشی
  ص ۳۸۴ فکر و نظر جولائی ۱۹۶۱ء
- رباعیات عمر خیام کا ایک نادر نسخہ ۔ "معارف" اکتوبر، دسمبر ۱۹۳۰ء، مقالات
  عرشی ص ۲۳۶
- رباعیات عمر خیام 'مرصاد العباد' میں عمر خیام اور خاقانی ۔ "معارف" فروری ۱۹۴۱ء
  مقالات عرشی ص ۲۶۷ "برہان" فروری ۱۹۷۲ء
- طہور الاسرار نامی و مظہر کردہ (نظامی گنجوی کی مثنوی مخزن الاسرار کی شرح طہور الاسرار)
  "معارف" جولائی اگست ۱۹۴۱ء مقالات عرشی ص ۴۰۸

عربی ادب

- الدالیہ (الشیخ احمد لتانسیری کا قصیدہ) "مجلہ ثقافت الہند" دہلی جون ۱۹۵۲ء
- دیوان ابی محجن (لعمرو بن حبیب الثقفی الصحابی) "مجلہ ثقافت الہند" دہلی ستمبر ۵۲ء
- الامثال السائرہ بن شعر المتنبی (لابی قاسم الصاحب اسمٰعیل بن عباد الطالقانی وزیر
  فخر الدولہ الدیلمی) "مجلہ ثقافت الہند" دہلی ستمبر ۱۹۵۳ء
- لامیۃ الہند للقاضی المقتدر بن محمود بن سلیمان الشوکی الکندی الدیلوی کا قصیدہ جو
  انہوں نے لامیۃ العجم کے جواب میں لکھا تھا) مجلہ ثقافت الہند دہلی ستمبر ۱۹۵۰ء

اسلامیات

- اسلام میں تجارت کا درجہ ۔ "آغاز" رام پور ۲۸ ۔ ۲۷ر فروری ۱۹۴۸ء
- اسلامیات کا مطالعہ ۔ تحریر دہلی جلد ۲ شمارہ ۴، "فکر و نظر" اسلام آباد (۷)
  ۶۱ ۔ ۵۱، اسلام اور عصر جدید جلد ۱ شمارہ ۱ ۱۹۶۹ء
- اللہ رسول کیسے مسلمان پسند کرتے ہیں؟ ۔ ص ۲۴ ۔ ۱۹۴۸ء

- الیواقیت فی المواقیت (نجم الدین ابوحفص عمر بن محمد بن احمد النسفی (م ۵۳۸ھ ۱۱۴۲ء) کی کتاب) مشمولہ نذر حمید مرتبہ مالک رام ص ۹۱
- صحیح مسلم کا ایک قدیم نسخہ ہندوستان میں (نوشتہ ۷۸۷ھ) معارف اگست ۳۰ء مقالات عرشی ص ۲۷
- نہج البلاغہ کا استناد۔ مقالات عرشی ص ۶۳، فاران کراچی مئی ۵۴ء، مشمولہ نہج البلاغہ کا مکمل ترجمہ از غلام اینڈ سنز لاہور ص ۳۴
- جاحظ کی کتاب الاخبار (احادیث پر عقلی دلیل)۔ مشمولہ نذر ذاکر مرتبہ مالک رام ۳۴

انشائیہ

- فطرت فیاض ہے۔ "نیرنگ" رام پور جنوری ۱۹۲۷ء

فنون

- خط نستعلیق۔ ہفتہ وار نئی روشنی یکم جنوری ۱۹۵۰ء
- کچھ نستعلیق کے بارے میں۔ سب رس حیدر آباد اگست ۷۷ء
- نسخ۔ تعلیق۔ نستعلیق۔ نیا دور لکھنؤ ستمبر، اکتوبر ۱۹۵۸ء
- نستعلیق کیا ہے؟۔ فاران کراچی جنوری ۱۹۸۱ء
- ہندوستان کے چند مشہور موسیقار۔ آج کل اگست ۱۹۵۶ء موسیقی نمبر

سائنس ہیئت

- شاہی کتب خانے کے آلات ہیئت۔ معارف، ستمبر ۱۹۳۲ء ہماری زبان دہلی ۱۵ ستمبر ۱۹۷۴ء

کتب وکتب خانہ

- ایک قلمی کتاب کی سرگذشت (بابر کے ترکی دیوان کے سفر کی داستان) نیا دور لکھنؤ نومبر ۱۹۵۶ء
- تنسیق العلوم ترجمہ ڈیوی ڈسمل کلاسی فیکیشن۔ برہان، جنوری ۱۹۶۴ء۔

- دیوان مومن کا ایک نادر مخطوطہ۔ آج کل دسمبر ۶۵ء
- دیوان ناسخ کا ایک اہم نسخہ۔ 'صحیفہ' اکتوبر ۶۱ء
- دیوان مخلص کا ایک نادر نسخہ (آنند رام مخلص)۔ برہان ستمبر ۱۹۵۰ء
- طبقات الفقہا الشافعیہ الوسطی (تاج الدین سبکی (ف ۷۷۱ھ/۱۳۷۰ء) کی مشہور کتاب کا ایک مخطوطہ، نوشتہ ۷۵۴ھ)۔ مقالات عرشی ص ۲۹۷، مجلہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ جون ۱۹۶۱ء
- کتابوں کا تاج محل (رام پور رضا لائبریری)۔ آج کل ستمبر ۱۹۶۷ء
- کتب خانے کے آداب۔ ہفتہ وار نئی روشنی، دہلی یکم فروری ۱۹۴۹ء تحریک ۱۹۶۴ء، نورنگ کراچی فروری ۱۹۵۱ء
- کتب خانہ رام پور۔ 'جامعہ' جولائی ۱۹۴۷ء
- کلیات طالب آملی (پانچ خطی نسخوں کا تعارف)۔ برہان دسمبر ۱۹۵۳ء
- ہندوستان کے عربی فارسی کتب خانے۔ برہان 'مئی ۱۹۴۷ء
- قانون شیخ کا پہلا مطبوعہ نسخہ (۱۷۱۸ء)۔ 'معارف' دسمبر ۱۹۳۴ء
- قلمی کتابوں کی سرگذشت۔ 'ہم قلم' کراچی ستمبر ۱۹۶۱ء

⁂

عرشی صاحب پر لکھا گیا ادب

(۱) آشوب آگہی (مولانا عرشی اور مولانا مہر مرحوم سے مراسلت) قدرت نقوی، اردو نامہ کراچی دسمبر ۷۵ء

(۲) آہ علامہ دہر عرشی رام پوری ۔ رئیس رام پوری مشمولہ "تاثرات" ص ۱۹۰

(۳) ادب میں حق و صداقت کی لایق اور قابلِ رشک مثال : مولانا عرشی ۔ آمنہ خاتون، برہان، دہلی فروری ۸۲ء، ہماری زبان دہلی ۱۵-۲۲ دسمبر ۸۳ء

(۴) افسوس! عرشی صاحب بھی نہ رہے ۔ ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ دہلی مارچ ۸۱ء

(۵) امتیاز علی خاں عرشی ۔ محمد حسین خاں شفا ۔ فاران اپریل ۷۸ء

(۶) امتیاز علی خاں عرشی ۔ ضیاء الدین اصلاحی، آج کل، دہلی مئی ۸۱ء

(۷) امتیاز علی خاں عرشی ۔ قطعہ تاریخ وفات ۔ شان الحق حقی، اردو، کراچی جولائی ۸۵ء

(۸) امتیاز علی خاں عرشی (اداریہ) گوپال متل، تحریک، اپریل ۸۱ء

(۹) امتیاز علی خاں عرشی (بزبان ہندی) محمد حسین خاں شفا، رجت، اپریل ۸۱ء

(۱۰) امتیاز علی عرشی : انتخاب کلام ۔ ادارہ، نیا خواب، رام پور ۱۶ر مارچ ۶۳ء

(۱۱) امتیاز علی عرشی سے روبرو بات چیت (تاثرات غالب کے سلسلہ میں) .... ناز انصاری علم و فن اپریل ۶۹ء

(۱۲) امتیاز علی عرشی : انتخاب کلام ۔ ادارہ، نیا خواب، رام پور ۱۶ر مارچ ۶۳ء

(۱۳) امتیاز علی عرشی کو ساہتیہ ایوارڈ (اداریہ) ۔ آج کل اپریل ۶۱ء

(۱۴) امتیاز علی عرشی کی علمی اور ادبی خدمات ۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، بہار کی خبریں، ۱۶ر اپریل ۶۶ء

(۱۵) ایسا کہاں سے لائیں کہ عرشی کہیں جسے ۔ سید نجم الدین نقوی، زبانِ ہند دسمبر ۸۱ء

(۱۶) بجھے کیا کیا چراغ خانماں! فروز : مولانا امتیاز علی خاں عرشی ممتاز مورخ اور نقاد ۔ عبداللطیف اعظمی، جامعہ اپریل ۸۱ء

(۱۷) بیادِ عرشی ۔ حکیم نبی احمد خاں شاد، ہماری زبان، ۲۲ر اکتوبر ۹۰ء

(۱۸) حضرت عرشی (نظم) ۔ خالد اقبال صدیقی ۔ گورنمنٹ رضا پوسٹ گریجویٹ کالج رام پور ۔ اردو میگزین ۸۲-۱۹۸۱ء بہ یادگار عرشی (رضا کالج رام پور، اردو میگزین) ص ۱۴

(۱۹) خراجِ عقیدت ۔ رشید حسن خاں، تحریک، اپریل ۸۱ء

(۲۰) دستور الفصاحت : اس کی ترتیب اور حواشی پر ایک تنقیدی نظر ۔ آمنہ خاتون، برہان، اپریل ۴۷ء

(۲۱) دیوانِ غالب عرشی پر بی۔بی۔سی کا نشریہ ۔ ادارہ ۔ ہماری زبان، یکم اپریل ۶۰ء

(۲۲) دیوانِ غالب اردو (عرشی ایڈیشن) ۔ ادارہ قومی زبان، مارچ ۶۰ء

(۲۳) ذکرِ عرشی ۔ مالک رام، نذرِ عرشی ص ۱۳، نقوش، لاہور اپریل جون ۶۶ء

(۲۴) روئداد تقریب نذرِ عرشی ۔ اداریہ ۔ آج کل مئی ۶۶ء

(۲۵) سوالنامہ مولانا عرشی ۔ نظر برنی ہماری زبان یکم نومبر ۸۲ء

(۲۶) ضمیمہ نسخۂ عرشی (دیوانِ غالب) اکبر علی خاں عرشی زادہ نقوش نومبر ۶۴ء شیرازہ، سری نگر جولائی ۶۵ء

(۲۷) عرشی رام پوری ۔ عشرت رحمانی نقوش شخصیات نمبر جلد ۲ اکتوبر ۵۶ء ص ۹۸۲

(۲۸) عرشی رام پوری کی خود نوشت تحریریں ۔ اکبر حیدری کشمیری ۔ نیا دور کراچی نمبر ۸۰، مارچ ۸۵ء

(٢٩) عرشی : شمع علم ویقیں دلیلِ سحر۔ سید عابد حسین ۔ نذرِ عرشی، مرتبہ مالک رام ص ٦١، تحریک' اپریل ٨١ء

(٣٠) عرشی صاحب ۔ عابد رضا بیدار "نیا خواب" رام پور ١٦ر ستمبر ٦٢ء

(٣١) عرشی صاحب اور ان کی خدمات ۔ محمد زبیر قیسی ۔ رضا کالج رام پور اردو میگزین ٨١ء ص ٢٣

(٣٢) عرشی صاحب کی ٦١ ویں سالگرہ ۔ ادارہ آج کل نومبر ٦٥ء

(٣٣) عرشی صاحب ۔ اداریہ آج کل اپریل ٨١ء

(٣٤) عرشی صاحب ۔ صباح الدین عبدالرحمٰن قومی زبان کراچی ستمبر ٦٦ء تحریک اپریل ٨١ء

(٣٥) عرشی صاحب ۔ ذکیہ جیلانی مشمولہ عرشی صاحب کے خطوط مرتبہ ذکیہ جیلانی

(٣٦) عرشی صاحب ۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۔ نذرِ عرشی ص ٨٢

(٣٧) عرشی صاحب کی تصویر اور عکسِ تحریر ۔ ادارہ عکسِ تحریر مئی ٨١ء

(٣٨) عرشی مرحوم کے آخری پندرہ سال ۔ دور آفریدی مشمولہ" ذکرو زبان' دور آفریدی ص ٢٢

(٣٩) عرشی : مولانا امتیاز علی خاں ۔ سید جعفر شاہ ۔ رضا کالج رام پور اردو میگزین ٨١ء ص ٢٢

(٤٠) علامہ امتیاز علی خاں عرشی مرحوم ۔ عرفان زیدی' ناظم' رام پور' ١٨ر ستمبر ٨٥ء

(٤١) غالب کا خط عرشی رام پوری کے نام (مزاحیہ) فرقت کاکوروی' تعمیر' سری نگر اکتوبر ٦٠ء

(٤٢) غالب سے متعلق مولانا عرشی کے تیرہ خطوط ۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ ۔ بہار کی خبریں ١٦ر اپریل ٦٨ء ۔ نیا دور لکھنؤ مئی ٦٧ء

(٤٣) قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی ۔ نثار احمد فاروقی' شاعر' جلد ٥٩/١٠-٩ ١٩٨٩ء

(٤٤) قلم بیتی (مولانا امتیاز علی عرشی صاحب کی یادیں) سید قدرت نقوی ۔' ماہ نو' جولائی ٨١ء۔

(٤٥) مرحوم مولانا عرشی ۔ اداریہ ضیاء الحسن فاروقی' اسلام اور عصرِ جدید اپریل ٨١ء

(٤٦) مرحوم مولانا عرشی ۔ شمع بکف تمبیلے کی آرزو ۔ آمنہ خاتون ۔ فروغ اردو' اکتوبر ٨١ء ہماری زبان یکم اکتوبر ٨١ء

(٤٧) مقدمہ (نذرِ عرشی) ڈاکٹر ذاکر حسین ۔ نذرِ عرشی ص ٧

(٤٨) مولانا امتیاز علی خاں عرشی ۔ ضیاء الدین اصلاحی ۔ فاران فروری ٨٣ء' معارف مارچ ٨١ء

(٤٩) مولانا امتیاز علی خاں عرشی ۔ سید بہاء الحق رضوی ۔ تہذیب الاخلاق علی گڑھ مارچ ١٩٨٨ء

(٥٠) مولانا امتیاز علی خاں عرشی ۔ محمد حسین خاں شفا ۔ عکسِ تحریر مئی ١٩٨١ء

(٥١) مولانا امتیاز علی خاں عرشی : ایک خاکہ ۔ لطیف حسین ادیب' العلم' اپریل جون ١٩٨٢ء

(٥٢) مولانا امتیاز علی خاں عرشی ۔ رضوان عنایتی ۔ قومی زبان ' فروری ٨٥ء

(٥٣) مولانا امتیاز علی خاں عرشی ۔ دوار کا داس شعلہ ۔ آج کل جون ٨٣ء

(٥٤) مولانا عرشی : (نظم) ۔ اظہر عنایتی مشمولہ" اپنی تصویر"۔ اظہر عنایتی ص ١٢٠۔

(٥٥) مولانا عرشی : ادب میں حق وصداقت کی قابلِ رشک مثال ۔ آمنہ خاتون برہان فروری ٨٢ء

(٥٦) مولانا عرشی ۔ ایک عظیم محقق ۔ وضاحت علی خاں' رضا کالج رام پور اردو میگزین ١٩٨١ء' ص ١٩

(٥٧) مولانا عرشی رام پوری ۔ نجم الدین نقوی ۔' تحریک' اگست ٧٤ء

(٥٨) مولانا عرشی سے ملاقات ۔ مجتبیٰ حسین ' سب رس' کراچی اپریل مئی ٧٩ء

(٥٩) مولانا عرشی کا منتخب کلام ۔ نجم الدین نقوی ۔' تحریک' جولائی ٧٥ء' اپریل ٨١ء

(٦٠) مولانا عرشی کی اردو پشتو لسانی رشتے پر گراں قدر تصنیف" اردو اور افغان" ایک تعارف ۔ عبدالقادر' ہماری زبان' ٨ر جون ٨١ء

(۶۱) مولانا عرشی کی وفات پر تعزیتی تاثرات ۔ مولانا وجیہہ الدین خاں ۔ مشمولہ نگارشات وجیہہ (قلمی) مملوکہ شعائر اللہ خاں رام پوری
(۶۲) مولانا عرشی کے خطوط ۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ ۔ شب خون، فروری مارچ ۷۵ء
(۶۳) مولانا عرشی مرحوم ۔ رشید حسن خاں ۔ غالب نامہ جولائی ۸۱ء
(۶۴) مولانا عرشی : نرم دم گفتگو گرم دم جستجو ۔ ذکا صدیقی، نیا دور، کراچی شمارہ ۸۲-۸۳
(۶۵) نذر عرشی (تبصرہ) ضیاء الحسن فاروقی 'جامعہ' جولائی ۶۶ء
(۶۶) نذر عرشی (تقریب نذر عرشی میں دی گئی تقریر) ۔ محمد مجیب' آج کل' مئی ۶۶ء
(۶۷) نذر عرشی (تبصرہ) عرش ملسیانی آج کل اکتوبر ۶۶ء
(۶۸) نسخہ عرشی ۔ نقش ثانی : ایک تعارف ۔ رضوان احمد صدیقی ۔ رضا کالج رام پور، اردو میگزین ۸۱ء ص ۱۵
(۶۹) نظرات (عرشی صاحب کی وفات پر لکھا گیا اداریہ)۔ سعید احمد اکبر آبادی ۔ برہان مارچ ۱۹۸۱ء
(۷۰) نگارشات عرشی ۔ اکبر علی خاں عرشی زادہ ۔ 'نذر عرشی' ص ۳۷
(۷۱) نگارشات عرشی ۔ محمد خالد اقبال صدیقی ۔ رضا کالج رام پور اردو میگزین ۸۱ء ص ۱۲
(۷۲) وفات عرشی (نظم) کرشن موہن تحریک اپریل ۸۱ء
۷۳ یاد میرے آبا کی ۔ ممتاز عرشی ۔ رضا کالج رام پور اردو میگزین ۸۱ء ص ۹ ۔
(۷۴) Fore word--Dr. Zakir Hussain – Nazre-Arshi -- ed. by Malik Ram.

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم عرشی صاحب کی طبع شدہ تالیفات کی فہرست بھی پیش کر دیں ۔ تاکہ پڑھنے والوں کے سامنے ان کی تحقیقات ایک ساتھ سامنے آجائیں ۔

•

غالبیات

(۱) فرہنگ غالب (فارسی) ۱۹۴۷ء
(۲) مکاتیب غالب (اردو) ۱۹۳۷ء سات ایڈیشن آخری ۱۹۴۹ء (غالب کے وہ خطوط جو انھوں نے فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں ناظم اور ان کے جانشین خلد آشیاں نواب کلب علی خاں کے نام لکھے تھے)
(۳) انتخاب غالب (غالب کا اپنا کیا ہوا اردو و فارسی کلام کا انتخاب) (اردو) ۱۹۴۳ء
(۴) دیوان غالب (نسخہ عرشی) (اردو) ۱۹۵۸ء

تذکرے

(۱) دستور الفصاحت از حکیم احمد علی خاں یکتا لکھنوی (فارسی) ۱۹۴۳ء
(۲) مجالس رنگین (سعادت یار خاں رنگین) ترجمہ اردو، ۱۹۴۲ء

داستان و قصص

(۱) رانی کیتکی کی کہانی از انشاء اللہ خاں انشا (اردو)
(۲) سلک گوہر از انشاء اللہ خاں انشا (اردو) ۱۹۸۰ء

شاعری : دیوان

(۱) نادرات شاہی از شاہ عالم ثانی (فارسی اردو اور ہندی کلام) ۱۹۴۴ء

درسیات

(۱) اردو ترجمہ بی ۔ اے عربی کورس پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۲۸ء
(۲) اردو ترجمہ ایف ۔ اے عربی کورس " " " "

عربی ادب

(۱) دیوان الحادرۃ ۔ قطبہ بن اوس بن محصن المازنی الغزار الغطفانی (عربی) ۱۹۴۹ء

(۲) کتاب الاجناس ۔ لابی عبید القاسم بن سلام الہروی البغدادی (عربی) ۱۹۳۸ء

تفسیر

(۱) تفسیر القرآن الکریم ۔ امام سفیان بن سعید بن سروق الثوری الکوفی (عربی) ۱۹۶۵ء

تاریخ

(۱) تاریخ اکبری المعروف بہ تاریخ قندھاری (فارسی) ۱۹۶۲ء

(۲) تاریخ محمدی از میرزا محمد حارث بدخشی دہلوی (فارسی) ۱۹۶۰ء

(۳) وقائع عالم شاہی از کنور پریم کشور فراقی (فارسی) ۱۹۴۹ء

فہارس

(۱) فہرست مخطوطات عربی رضا لائبریری رام پور (انگریزی) ۱۹۶۴ء، ۱۹۸۱ء۔ چھ جلدیں۔

(۲) فہرست مخطوطات اردو، رضا لائبریری رام پور جلد اوّل (اردو)

⁂